بیسویں صدی کے

شاہکار افسانے

صغیر ملال
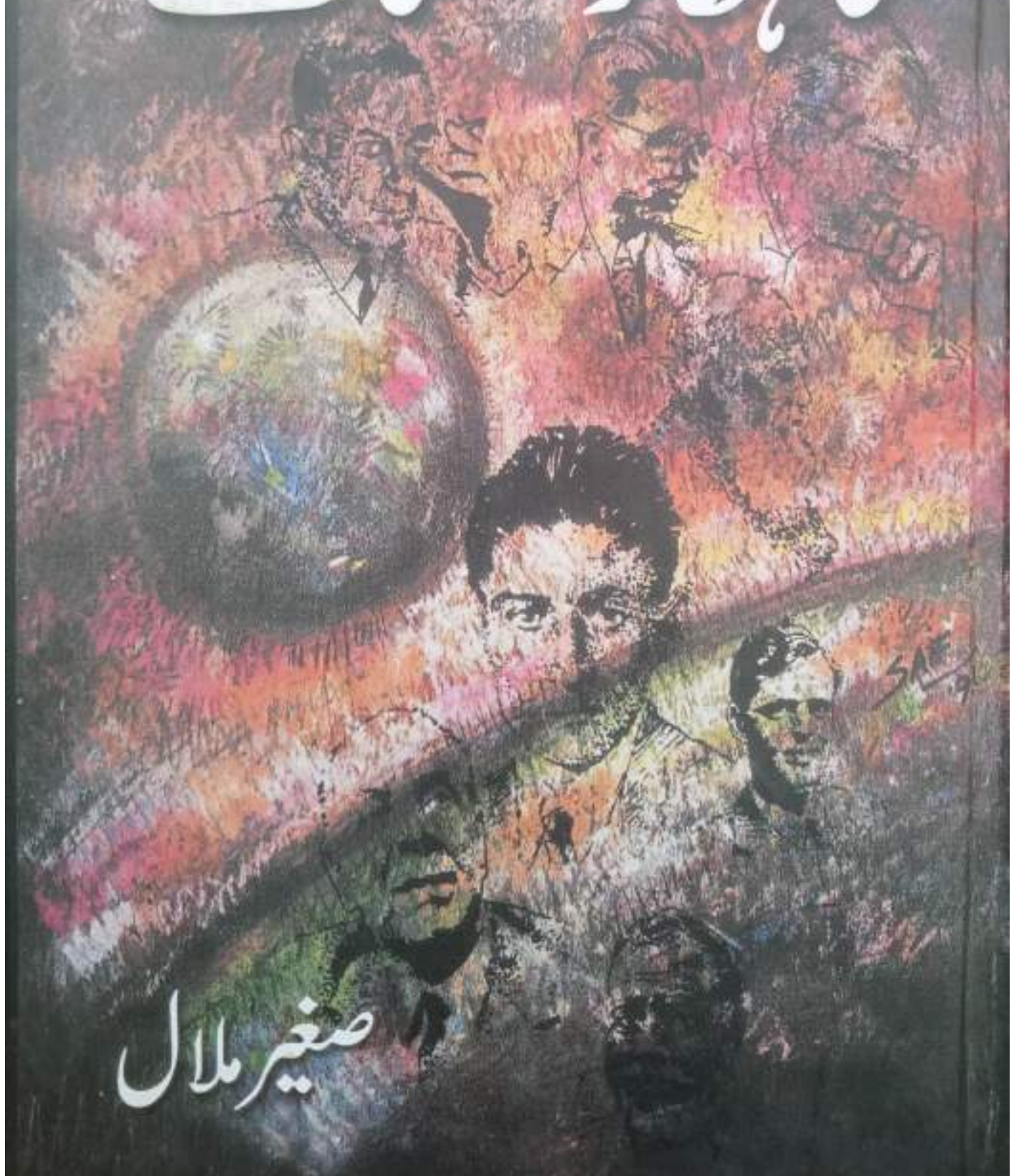
بیسویں صدی کے

شاہکار افسانے

انیس ناگی

صغیر ملال

ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی۔ فون ۲۶۳۸۰۸۶

انیس نقوی

درماں کے لیے

فہرست

1-	پیالہ	ٹالسٹائی (روس)	7
2-	الاؤ	جیک لنڈن (امریکا)	16
3-	ماریا	الڈس ہکسلے (برطانیہ)	32
4-	لارڈ ہرکولیس	//	65
5-	دوام	جین پال سارتر (فرانس)	76
6-	دیوار	//	92
7-	فن کار	فرانز کافکا (چیکوسلاواکیا)	113
8-	محتاج	//	122
9-	انصاف	//	125
10-	فرمان	//	127
11-	دستاویز	//	129
12-	دوغلا	//	132
13-	یہ کہانی	//	134
14-	زندگی	میری لیوین (آئرلینڈ)	138
15-	زندگی	ریمنڈ کارور (امریکا)	150
16-	آشوبِ شہر	جوزف ہیلر (امریکا)	175

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
17-	تھکے ہوئے آدمی کی منزل	بورخیس (ارجنٹائن)	195
18-	کتابِ مقدس	//	202
19-	شہزادہ	//	206
20-	چشم دید	//	209
21-	معدوم	//	210
22-	بورخیس اور میں	//	212
23-	آکلین	جیمز جوائس (آئرلینڈ)	217
24-	خوابوں کی انجیل	سلویا پلاتھ (امریکا)	223
25-	خواہش	جیمز اسٹیفینز (آئرلینڈ)	235
26-	مشاہدہ	گراہم گرین (برطانیہ)	240
27-	روشن گاہ	ارنسٹ ہیمنگوے (امریکا)	248
28-	مکڑی	جان ٹونڈر (ہالینڈ)	255
29-	بوسہ	ولیم سن سوم (امریکا)	270
30-	بھوک	یاں یانے (فرانس)	276
31-	بے گناہ	او ہنری (امریکا)	282
32-	ایک اور بہار	جیسی اسٹیورٹ (امریکا)	289
33-	اندھیرا	جیروم ویڈمین (امریکا)	298
34-	خدا کے نام	گریگری فیونٹس (میکسیکو)	305
35-	جھاگ	ہرنا ڈوتالیز (کولمبیا)	309
36-	پیانو	انیبل میکاڈو (برازیل)	316

The Whole world can be divided into those who write and those who do not write. Those who write represent despair, and those who read disapprove of it and believe that they have a superior wisdom.

Basically they are all equally despairing, but when one does not have the opportunity to become important with his despair, then it is hardly worth the trouble to despair and show it.

Soren Kierkegaard

ٹالسٹائی

پیالہ

''الیوشا'' چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ سب اُسے ''الیوشا'' ہی پکارتے تھے۔ لیکن ایک دن یوں ہوا کہ اِس کی ماں نے اُسے کسی محلے دار کے گھر دودھ پہنچانے بھیجا تو وہ راہ میں ٹھوکر کھا کر سنبھل نہیں سکا اور ٹوٹے ہوئے پیالے کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ اِس دن الیوشا کو گھر میں مار پڑی اور جب وہ باہر نکلا تو اُسے گلی کے بچوں نے چھیڑنا شروع کر دیا۔ ''پیالہ! پیالہ' الیوشا پیالہ'' اس دن سے الیوشا کا نام پیالا پڑ گیا۔

الیوشا کے کان اس کے چہرے کی بہ نسبت بڑے تھے۔ ایسے بڑے کان کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی پرندہ پر پھیلائے اس کے کاندھوں پر آ بیٹھا ہو۔ گاؤں میں ایک اسکول موجود تھا لیکن پڑھنا الیوشا کے لئے مشکل کام ثابت ہوا اور پھر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کا بڑا بھائی شہر میں ایک تاجر کے گھر میں ملازم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن سے الیوشا نے چلنا شروع کیا۔ اسی دن سے گھر کا کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کی تمام بکریوں کا رکھوالا بن گیا اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گھوڑوں کی دن رات نگہداشت پر مامور کر دیا گیا۔ بارہ برس کا ہونے تک وہ کھیتوں میں ہل چلانے اور گھوڑا گاڑی پر شہر کا سامان لانے کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت تازگی اور شگفتگی رہتی۔ محلّے کے بچے اس پر ہنستے تو وہ خاموشی سے اُنہیں دیکھتا رہتا' یا خود بھی ہنسنے لگتا' اس کا باپ ناراض ہوتا تو وہ سر جھکا کر اُس کی ڈانٹ سُنتا اور چپ چاپ باپ کے دل کی بھڑاس نکل جاتی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ادھورے کام کی طرف پلٹ جاتا۔

جب الیوشا انیس سال کا ہوا تو اُس کے بڑے بھائی کو جبری بھرتی والے لے گئے۔ الیوشا کو بتایا گیا کہ اب اُسے شہر جا کر اپنے بھائی کی جگہ ملازمت کرنا ہوگی۔ دوسرے دن اُس کو بڑے بھائی کے بڑے جوتے پہنائے گئے اور شہر لے جا کر تاجر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ تاجر کو الیوشا کے نرم نقوش اور نازک ہاتھ پاؤں' کام کے لئے ناموزوں معلوم ہوئے۔

''میں سمجھ رہا تھا کہ سائمن کی جگہ مجھے اچھا ملازم مل جائے گا'' تاجر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا: ''یہ میرے کس کام کا ہے؟''

''یہ ہر کام کرسکتا ہے''۔ الیوشا کا باپ فخر سے بولا۔ ''دس لڑکوں کی جگہ یہ اکیلا کافی ہے۔ کمزور لگتا ہے' لیکن آپ اِسے تھکا نہیں سکتے''۔

''خیر یہ تو معلوم ہو جائے گا''۔ تاجر نے ایک مرتبہ پھر الیوشا کو غور سے دیکھا۔

''......اور پلٹ کر جواب دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ اس کا بس چلے تو ساری زندگی کھانا کھائے بغیر کام کرتا رہے''۔

''دیکھ لیں گے۔ چھوڑ جاؤ''۔ تاجر نے بے دلی سے کہا۔

یہ الیوشا کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

تاجر کا خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بوڑھی ماں اور بیوی کے علاوہ دو بیٹے تھے' جن میں سے ایک تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں اور دوسرا دُنیاوی مُعاملات میں ہوشیار تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو ہائی اسکول کے آخری درجہ میں تھی۔

ابتدا میں الیوشا کسی کو پسند نہیں آیا۔ وہ کسان زادہ تھے۔ اور اُنہیں اَب تک اس کا وجود کھیت کی مٹی سے اَٹا ہوا لگتا تھا۔ اس کا لباس دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اُس نے پورا بدن ایک چادر سے ڈھک لیا ہو۔ اسے مہذّب لوگوں سے گفتگو کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ اور وہ معزز افراد کے احوالیہ جملوں میں استعمال ہونے والے الفاظ سے ناواقف تھا۔ بہر حال کچھ دنوں بعد تاجر کے گھر والے الیوشا کے عادی ہو گئے' بالآخر اس کی محنتی طبیعت نے اُن کا دل خوش کر دیا تھا۔ اُنہیں معلوم ہو گیا کہ وہ کسی کام' کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ پلٹ کر جواب نہیں دیتا اور ایک کام ختم کرنے کے بعد بغیر دم لیے دوسرا کام شروع کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاجر کے گھر کا سارا کام الیوشا کے سپرد ہو گیا۔ جتنی تیزی سے وہ اپنی ذمہ داریاں نبھاتا گیا' اتنی تیزی سے اس کے فرائض میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ علی الصبح بیدار ہوتا' اور یکسوئی کے ساتھ ہر کام نمٹاتا جاتا۔ تاجر کی بیوی اور اس کی ماں اور بیٹی اور بیٹے اور خادمہ اور خانساماں چھوٹے بڑے کاموں کے سلسلے میں اسے یہاں وہاں بھیجتے رہتے اور وہ صبح سے شام تک چاروں سمتوں میں گردش کرتا نظر آتا۔

اسے تمام دِن اِس طرح کے جملے سنائی دیتے:

''الیوشا' دوڑ کر جاؤ اور اسے یہیں لے آؤ''۔

''ذرا اِس کا خیال رکھنا الیوشا''۔

''واپسی پر اس کی طرف سے بھی ہوتے آنا اور.........''

''یہ نہ سنوں کہ تم بھول گئے تھے''

''ہاں! ہاں! یہ بھی ضروری ہے''۔

الیوشا سب کی سنتا' یاد رکھتا' مسکراتا رہتا' اور ایک کے بعد دوسرا کام کرتا چلا جاتا۔ کچھ عرصے بعد الیوشا کے اونچے جوتے اُدھڑنے لگے' اور جگہ جگہ سے اس کی ایڑیوں اور پنجوں کی کھال جھلکنے لگی۔ تاجر نے اسے جوتوں کا نیا جوڑا منگوادیا۔ نئے جوتے دیکھ کر الیوشا کا چہرہ جگمگانے لگا' مگر نئے جوتوں نے اس کے پرانے پیروں کو فوراً قبول نہیں کیا' اور شام تک وہ جوتوں کے کاٹنے سے بے حال ہوگیا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ نئے جوتوں کے پیسے اس کی تنخواہ سے کاٹ لیے جائیں گے اور جب اس کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرے گا تو اس پر بہت خفا ہوگا۔ کچھ عرصے سے اس کا باپ اسے مسلسل تنبیہ کررہا تھا کہ وہ اپنے جوتے بہت تیزی سے گھس رہا ہے اور اِس سلسلے میں اسے احتیاط برتنی چاہیے۔

الوشا منہ اندھیرے اٹھ کر آتش دان کے لیے لکڑیاں تراشتا' صحن اور بیرونی احاطے کی صفائی کرتا' گھوڑوں کا راتب اور گائے کا چارا تیار کرتا' چولھا گرم کرتا' گھر بھر کے جوتے چمکاتا' مالک کے کپڑے جھاڑ کر دھوپ میں پھیلاتا' دیواریں اور فرنیچر پونچھتا' پھر وہ خانساماں کے کہنے پر سودا لینے بازار کا رخ کرتا یا خادمہ کی ہدایت پر برتن دھونے لگتا۔ اس سے فارغ ہوتا تو اسے کسی کے نام کی چٹھی دے کر شہر کے دوسرے حصے میں بھیجا جاتا اور واپسی پر چھوٹی بیٹی کو اسکول سے لانے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی بول پڑتا۔ ''الیوشا! خدا کے بندے کہاں رہ گئے تھے...... اتنا فاصلہ تو نہیں تھا...... اچھا اب فوراً جاؤ' اور......'' اور الیوشا فوراً جاتا اور تن دہی سے نئے کام میں مصروف ہوجاتا۔

فرصت کا لمحہ ملتا تو وہ روٹی پر سالن ڈال کر کھانے لگتا' لیکن اسی دوران کوئی کام آپڑتا تو وہ روٹی کو گول بنا کر ہاتھ میں لیے اپنے ہدف کی طرف دوڑ پڑتا۔ خادمہ اسے کھانے کے وقت پر نہ پہنچنے پر ڈانٹتی' لیکن اس کی مجبوری پر رحم کھا کر وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھ لیتی تھی۔

الیوشا زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ جب اسے بات کرنا ہی پڑ جاتی تو وہ جملوں کی جگہ محض الفاظ بول کر اپنا مدّعا بیان کرتا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا وہ فلاں فلاں کام کرسکتا ہے؟ ''کیوں نہیں''! وہ

جواب دیتا' اور مخاطب کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی کام شروع کر دیتا تھا۔ اسے کوئی دُعا یاد نہیں تھی۔ بچپن میں اس کی ماں نے اسے چند دعائیں یاد کرائی تھیں جو وہ وقت گزرنے کے ساتھ بھول گیا تھا۔

اس طرح الیوشا نے دو برس گزار دیے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جو اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

الیوشا جانتا تھا کہ ہر آدمی کو دوسرے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے کسی نہ کسی سطح پر سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں' اس لئے دُنیا میں انسانوں کے انسانوں سے تعلقات قائم ہیں۔ لیکن یہ بات الیوشا کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی صورتِ حال ایسی بھی ہوتی ہے' جب آدمی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ رہے جب کہ اسے دوسرے سے کوئی کام بھی نہیں لینا ہوتا۔

انسانوں کے درمیان ایسا بھی تعلق ہوسکتا ہے! یہ الیوشا کے لیے انکشاف تھا' اور یہ بات تانیا کے توسط سے اس پر منکشف ہوئی تھی۔ تانیا اس نوجوان' یتیم لڑکی کا نام تھا جو تاجر کے گھر خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وہ بھی الیوشا کی طرح محنتی طبیعت کی تھی' اور اسے الیوشا کی یکسوئی پر پیار آتا تھا، اسے دیکھ کر الیوشا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اس کے کام کی نہیں بلکہ خود اس کی ضرورت ہے۔ بچپن میں جب الیوشا کی ماں اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی تھی تو وہ حیران نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تمام مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں لیکن تانیا نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس کا الیوشا سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اس کے لئے مکھن لگی روٹی بچا کر رکھتی تھی۔ الیوشا چپڑی روٹی کھاتا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس دوران الیوشا کی نظریں اس سے ملتیں تو وہ بے ساختہ ہنس پڑتی۔ ایک لمحے کو الیوشا جھینپ جاتا اور پھر خود بھی ہنسنے لگتا۔

یہ صورتِ حال اتنی انوکھی اور پُر کیف تھی کہ ابتدا میں الیوشا خوف زدہ سا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ پہلے جیسی تیز رفتاری سے کام نہیں کر سکے گا۔ تانیا نے اس کی زندگی میں وہ دریچہ کھول دیا تھا۔ جہاں سے اُس نے پہلی بار پھول اور تتلیاں دیکھی تھیں۔ اس سے پہلے بھی اسے یہ چیزیں کہیں نہ کہیں نظر آتی رہی تھیں لیکن فرصت نہ ہونے کے باعث وہ انہیں کبھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ کام کے دوران جب اُس کی نظر اپنی پتلون کے اس حصے پر پڑتی جو تانیا نے مہارت سے رفو کیا ہوتا تو وہ بے اختیار کہتا ''شکریہ' تانیا! شکریہ! شکریہ!''

جب بھی ممکن ہوتا' دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے' ہنستے اور اپنے بچپن کے واقعات دہراتے۔ تانیا کو باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اُس نے الیوشا کو بتایا کہ کس طرح اُس نے بچپن میں اپنے والدین کو یکے بعد دیگرے مرتے دیکھا اور پھر کس طرح وہ اپنی خالہ کے پاس پہنچ گئی۔ الیوشا نے سن رکھا تھا کہ گاؤں سے کام کی تلاش میں شہر آنے والے اکثر لڑکے گھریلو خادماؤں سے شادی کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ تانیا نے الیوشا سے پوچھا کہ اُس کا باپ اُس کی شادی کے بارے میں کیا ارادہ رکھتا ہے۔ ''معلوم نہیں''۔ الیوشا نے کندھے اُچکا کر جواب دیا ''بہرحال گاؤں کی لڑکی سے تو شادی مشکل ہے''۔

''تو تم کسی کو پسند کرتے ہو؟'' تانیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے شادی کروں گا!'' الیوشا نے کسانوں کی پیدائشی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کرو گی؟''

''لو اور سنو۔ پیالہ مجھ سے شادی کرے گا!'' یہ کہہ کر تانیا اس کی سادہ لوحی اور بے باکی پر ہنسنے لگی۔ پھر یک دم سنجیدہ ہو کر بولی: ''کیوں نہیں' الیوشا! کیوں نہیں''۔

ایک ہفتے بعد الیوشا کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرنے شہر آیا۔ تاجر کی بیوی تک خبر پہنچ چکی تھی کہ الیوشا پر تانیا سے شادی کرنے کی دُھن سوار ہے۔ اس نے اپنے خاوند کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ ''شادی کے بعد کوئی لڑکی اتنی محنت نہیں کر سکتی۔ بچوں کے ساتھ تانیا ہمارے لئے بیکار ہو جائے گی''۔

تاجر نے الیوشا کی تنخواہ اُس کے باپ کی جانب بڑھائی تو وہ ہمیشہ کی طرح کھل اٹھا۔ ''میرا بیٹا کیسا کام کر رہا ہے؟ انکار کرنا تو وہ جانتا ہی نہیں''۔

''جہاں تک کام کا تعلق ہے''۔ تاجر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مگر وہ ہماری خادمہ سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ ہمارے لئے سودمند نہیں ہوگا''۔

''ارے! اس کی یہ جرأت''۔ الیوشا کے باپ نے حیرت سے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پُریقین انداز میں بولا ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں خود معاملہ ختم کر کے جاؤں گا''۔

جب الیوشا کوئی کام نمٹا کر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ گھر لوٹا تو اس کا باپ اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

میں تمہیں سمجھدار اور سعادت مند بیٹا سمجھتا تھا' لیکن ...... یہ سب کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں ...... یہ کہ ...... کچھ بھی نہیں''۔

''کیا کچھ بھی نہیں؟ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔ جب وقت آئے گا میں خود تمہاری شادی کراؤں گا......کام کی عورت سے!......شہر کی مکار عورتوں سے دور رہو۔ سمجھے؟

اس کا باپ دیر تک اسے تُند لہجے میں نصیحتیں کرتا رہا' اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو الیوشا کے چہرے پر وہی تبسم پھیل گیا۔

''تو پھر؟'' باپ کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔ میں یہ معاملہ ختم سمجھوں؟

''جی ہاں!'' الیوشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب اس کا باپ رخصت ہو گیا۔ تو تانیا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سنتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

''ہمیں یہ معاملہ ختم سمجھنا چاہئے''۔ الیوشا نے نرمی سے کہا۔

تانیا نے پلکیں جھکائیں تو دو آنسو اس کے رخساروں پر واضح لکیریں بنا گئے۔

الیوشا نے نظر بھر کر دیکھا' گہری سانس لی اور نحیف آواز میں کہا:

''کیا کریں......سب ناراض ہو رہے ہیں......بھولنا پڑے گا''۔

رات کو سونے سے قبل گھر کی کھڑکیاں بند کرنے کے دوران جب وہ بڑی خواب گاہ میں داخل ہوا تو تاجر کی بیوی اسے دیکھتے ہی بولی ''باپ سے ملاقات ہو گئی؟ اب سب کچھ بھول کر کام میں دل لگاؤ''

''لگتا ہے بھولنا ہی پڑے گا'' الیوشا نے مسکرا کر کہا' اور اچانک دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگا۔

اس دن کے بعد الیوشا نے کبھی تانیا کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کام میں مصروف رہنے لگا تھا۔ سردیوں کی ایک صبح اِسے چھت سے برف صاف کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ برف کے ڈھیر بنا کر نیچے دھکیلنے لگا' اور کچھ ہی دیر میں اُس نے پوری چھت صاف کر دی۔ اس کے بعد وہ روشن دانوں کے چھجوں پر جمی برف ہٹانے کے لئے جھک رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آ گرا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ برف کے ڈھیر میں دھنستا گیا' لیکن اس کا سر آہنی جنگلے سے ٹکرا گیا۔ گرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا' مگر فوراً ہی لڑکھڑا کر دوبارہ برف پر لیٹ گیا۔ تاجر کی بیٹی اور تانیا دوڑتی چلی آئیں۔ ''الیوشا تم ٹھیک ہو؟'' ''تمہیں چوٹ لگی ہے؟'' دونوں کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''ہاں ذرا چوٹ لگ گئی'' اس نے دھیرے سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ٹھیک ہے''

اُس نے ایک مرتبہ پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی' اور دوبارہ ناکام ہونے پر سر واپس ٹیک کر

مسکرانے لگا۔

اسے لوگوں کی مدد سے اٹھا کر بستر پر لٹایا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد اس سے پوچھا کہ وہ کہاں تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ "سب جگہ"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن ٹھیک ہے"۔

کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولیں اور بولا: روشن دانوں کی برف رہ گئی...... ابا کو بلوالو' الیوشا دو دن تک بستر پر رہا اور تیسرے دن انہوں نے پادری کو بلوا لیا۔

"تم مر رہے ہو الیوشا؟ تانیا کا لہجہ سوالیہ تھا

"ہم ہمیشہ رہنے کے لئے تو نہیں آتے"۔ الیوشا نے فطری صاف گوئی سے جواب دیا" ایک دن مرنا بھی ہوتا ہے" پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا"......اور دیکھا! یہ بھی اچھا ہوا۔ انہوں نے ہمیں شادی نہیں کرنے دی۔ اب کتنا افسوس ہوتا"

وہ دھیرے دھیرے پادری کے کہے ہوئے الفاظ دہراتا رہا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ اگر آدمی سب کی بات مانتا رہے اور کسی کو ناراض نہ کرے تو نہایت اطمینان سے زندگی گزارتا ہے۔

"اگر یہاں ایسا ہوتا ہے"۔ اُس نے سوچا" تو اُس جہان میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا"۔

اُس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ بس وقفے وقفے سے پانی مانگتا رہا۔ پھر اچانک وہ کسی خیال پر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی بات اُسے حیران کر رہی ہے۔ آنکھوں میں پھیلتی حیرت کے ساتھ اُس نے ایک گہری سانس لی' بازو اور ٹانگیں سیدھی کیں اور مر گیا۔

☆

جوگی کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ صرف خواہش دریافت کرتے ہیں۔ کسی کو محل بنانے کی خواہش ہو تو کہتے ہیں۔ "بنالو"

دوسرے پھیرے میں بھی وہ خواہش ہی جاننا چاہتے ہیں۔ کسی بھی خواہش کا اظہار کیا جائے وہ کامیابی کی اور خوش رہنے کی دعا دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان کا دامن تھام لے اور خود ہی چیخ کر کہے" کہ میری ساری خواہشیں پوری ہوگئیں' مگر میں اب بھی بے چین ہوں!......" تو جوگی اسے سکون کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

ٹالسٹائی کی تمام خواہشیں پوری ہوگئی تھیں مگر اس کی بے قراری قائم تھی' پیغمبرانہ روش ہے جب کوئی ادیب اس حال کو پہنچتا ہے تو وہ ادب کی آخری منزل کو چھو لیتا ہے آج اگر ٹالسٹائی کو ہر سطح پر موجودہ عہد کا عظیم ترین ادیب تسلیم کیا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں ہے وہ اپنی طویل زندگی کے آخری سانس

تک مضطرب رہا۔اس کی یہی ادا اُسے بڑے منصب پر فائز کرنے کے لئے کافی ہے"۔

ٹالسٹائی چالیس برس کی عمر تک تقریباً سب کچھ ذاتی طور پر دیکھ چکا تھا۔

میدانِ جنگ اور من حیث القوم انسانوں کا جنون' دیہات کے کسانوں کی درجۂ آخر کی سخت کوشی اور بدحالی۔شہر کے طبقہ اشرافیہ کے فرصت کے لمحات۔ماں' باپ جوان بھائی اور بہت سے قریبی عزیزوں کی ناگہانی اور بے وقت موت۔ذاتی خوشحالی اور کامیابی اور وجیہہ ہونے کے سبب' ہر طرح کی عورتوں کی تسخیر اور مواصلت۔ادبی شہرت اور مقبولیت کی انتہا۔دنیا بھر کے فلسفے' ادب اور الہامی کتابوں کا مطالعہ۔اولاد کا دکھ اور سکھ۔اور ازدواجی زندگی کے شدید نشیب و فراز' ٹالسٹائی نے دنیا کو کو ہر رنگ میں دیکھا اور ہر طرح سے برتا تھا۔

مگر اتنی گہری سمجھ بوجھ کے باوجود یا اسی کے باعث' ٹالسٹائی کا اضطراب بتدریج بڑھتا ہی گیا۔اس نے جوانی میں کہا تھا:

To Understand everything is to forgive everything.

اور پھر ادھیڑ عمری تک وہ سوائے اپنے' دنیا کے ہر شخص اور ہر چیز کو معاف کر چکا تھا' اور اس مقام پر جب وہ یکسوئی کے ساتھ پہلی بار اپنی جانب پلٹا تو حیران رہ گیا۔اسے یہ ہولناک احساس ہوا کہ تمام کامرانیوں' مرادوں اور بلندیوں کے حصول کے باوجود وہ جسمانی طور پر دراصل محض ایک جاندار ہے۔ایک ایسا بے وقعت جاندار جو دنیا کے دوسرے اربوں' کھربوں کیڑے مکوڑوں اور حیوانوں کے ساتھ پیدا ہونے کے بعد انھی کے ساتھ موت کی جانب بڑھ رہا ہے۔

"ایسی کائنات میں......" ٹالسٹائی کو خیال آیا۔"میرے نہ ہونے سے اتنا بھی فرق نہیں پڑے گا' جتنا سمندر میں ایک بلبلے کے پھوٹنے سے پڑتا ہے"۔

الڈس ہکسلے نے سرطان اور سائیکیڈیلک دواؤں کے زیر اثر آخری بات کہنی چاہی تھی۔

There comes a time when one asks even of shakespeare, even of Beethoven, is this all?

یہ سوال ذہن میں آتے ہی ادیب' فلسفے اور مذہب کی عملداری میں آجاتا ہے ٹالسٹائی نے بہار کی روشن اور خوشگوار دوپہر میں ایک بھنورے کو شاخ در شاخ کھلے پھولوں میں داخل ہوتے اور گنگناتے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ بھونرے میں تبدیل ہو کر فطرت سے وصل کی حالت میں آگیا ہے اس وجد آور کیفیت نے اسے ہکسلے والی صورت حال میں داخل کر دیا اور وہ ادبی کتابوں

کی تخلیق کو غیر فطری عمل قرار دے کر موت و زیست کے مسائل پر غور کرنے لگا۔ جتنے نفوس اتنے سلوک کے طریقے۔ جواری' شرابی اور عورت باز ٹالسٹائی مایوسی کے بجائے سرشاری کے راستے حتمی سوالوں تک پہنچ گیا۔

ذہنی سکون کی خاطر ٹالسٹائی نے شہر کی لایعنی مصروفیات سے دور' اپنی زمینوں پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ مکمل فطری انداز اپنانے کے لئے ناول اور افسانے لکھنے یکسر ترک کر دیئے۔ جنسی عمل اور گوشت خوری سے کراہت محسوس کرنے لگا۔

"آدمی کو خودکشی کیوں نہیں کرنی چاہیے؟ ایک مدت تک وہ وجدانی حالت میں اس سوال پر غور کرتا رہا اور جب زندگی کے مقابل خودکشی کے حق میں دلائل زیادہ جمع ہو گئے تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ بندوق چھپا دی' رسیاں جنہیں دیکھ کر ڈھلکتی گردن یاد آتی تھی' جلا دیں۔

میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کائنات دائمی اور لامحدود ہے۔ میں یہاں لمحے بھر کو چمکنے کے بعد بجھنے والا ہوں ...... اور اب میں کچھ کر لوں۔ اس طرف سے زمین کھود کر اُدھر نکل جاؤں۔ اس طرف سے کھود کر واپس اس طرف نکل آؤں۔ اپنی موجودہ حالت سے نجات ممکن نہیں ہے۔ میرا یہ آغاز اور انجام کہاں' کیوں اور کس کی مرضی سے طے کر دیا گیا؟

ایسے خیالات کی آندھیاں چھوٹے چراغ گل کر دیتی ہیں مگر بڑے شعلے مزید بھڑک جاتے ہیں۔ ٹالسٹائی بہت بڑا تخلیق کار تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ماضی کا عظیم الشان ناول نگار اور افسانہ نویس جواب سنجیدہ بڑھاپے میں معلمانہ اور مدرسانہ تحریروں کے انبار لگا رہا تھا اچانک دوبارہ فکشن کی وادیِ مشکل میں داخل ہوا ...... اور اس نے پچھتر برس کی عمر میں "پیالہ" تخلیق کیا۔

یہ افسانہ فنِ افسانہ نگاری کی انتہا ہے۔ اس فن کی انتہا پر وہ کہانیاں جنم لیتی ہیں جو قاری کے شعور کا دائمی حصہ بن جاتی ہیں۔ دمِ مرگ الیوشا کی آنکھوں میں پھیلتی حیرت ایک لمحے کو عیاں ہو کر ہمیں عمر بھر کے لئے بے چین کر سکتی ہے۔

کیا واقعی "ولی کا خون سب کو معاف' اور اس کے مال پر سب کا حق ہوتا ہے؟"

جیک لنڈن

الاؤ

دن کا آغاز شدید سردی اور دُھند سے ہوا تھا۔ روشنی ہونے پر اس نے ایک لمحے کے لئے چاروں سمت نظریں دوڑائیں اور سر جھکا کر متروک پہاڑی راستے پر روانہ ہوگیا۔ مطلع صاف تھا مگر چیزوں پر اس اداسی اور گھٹن کی جھلک نمایاں تھی جو ایسے دنوں میں پیدا ہوتی ہے جب آسمان پر سورج بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اجنبی کی لاپروائی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کے موسم کا عادی ہے۔

اس نے گھوم کر اس راستے پر نظر ڈالی جہاں سے وہ آیا تھا۔ پورا راستہ تین فٹ برف تلے دفن تھا۔ سخت برف کے اوپر تقریباً اتنی ہی موٹی نرم برف کی تہ تھی۔ چاروں سمت برف کی سفیدی محیط تھی۔ جہاں زمین کی سفیدی اور آسمان کی نیلاہٹ کا ملاپ ہوتا تھا۔ وہاں ایک بھورے رنگ کی لکیر واضح تھی جو افق پر شمالاً جنوباً پھیلی تھی۔ یہ مرکزی راستہ تھا جو دونوں سمتوں پر برفانی طوفانوں کے علاقے سے باہر جاتا تھا۔

منجمد سورج، انتہائی سرد ہوا اور شدید اداسی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایسے موسم کا عادی تھا۔ لیکن اگر وہ ذرا بھی عقلمند ہوتا تو اس ماحول میں داخل ہونے کی غلطی نہ کرتا۔ اس کا جسم مضبوط تھا مگر اس کی ذہانت مایوس کن حد تک کم تھی۔ وہ اشیا کو ان کی فطری حالت میں پرکھ سکتا تھا، لیکن مختلف چیزوں کے باہمی عمل سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تجزیہ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ صفر سے پچاس درجے کم درجۂ حرارت بہت زیادہ سردی کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا، اور اس کی شدت کو تسلیم کرتا تھا، مگر اس صورتِ حال سے اس کے دھیان میں انسانی بدن کی کمزوریاں اور زندگی کی مجبوریاں نہیں آتی تھیں۔ اگر اجنبی ایسا کرنے کے قابل ہوتا تو یقیناً وہ اس مرحلے سے آگے بھی سوچتا، اور یوں وہ انسان کے فانی ہونے پر اور کائنات میں فرد کی وقتی موجودگی، اور دائمی عدم موجودگی پر بھی غور کرتا، لیکن وہ سوچ بچار کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ صفر سے پچاس درجے کم درجۂ حرارت اس کے لئے محض صفر سے پچاس درجے کم درجۂ حرارت تھا اور وہ

جانتا تھا کہ اس درجۂ حرارت کا مقابلہ اونی کپڑوں' موٹی جرابوں' گرم دستانوں اور کھالوں کی بنی ہوئی ٹوپیوں سے کیا جاتا ہے۔ اتنی شدید ٹھنڈ کا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوال اس کے لئے بے معنی تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس نے کچھ سوچ کر زمین پر تھوکا' اور اچانک وہ ٹھٹھک گیا۔ تھوک زمین پر گرنے سے پہلے جم گیا تھا' اور اس سے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ تھوکا' اور ایک بار پھر کھڑ کھڑاہٹ سن کر حیران رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ درجۂ حرارت صفر سے پچاس درجے کم ہو تو تھوک برف پر گر کر آواز پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ صورتحال مختلف تھی۔ تھوک ہوا ہی میں ٹھوس شکل اختیار کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس وقت منفی پچاس سے زیادہ ٹھنڈ تھی۔ لیکن سردی کی شدت پر غور کرنا لاحاصل تھا۔ اسے ہر حال میں ہینڈرسن کیمپ پہنچنا تھا۔ یہاں اس کے دیگر ساتھی موجود تھے۔ انہوں نے انڈین کریک کا سیدھا راستہ اپنایا تھا جبکہ وہ موسم گرما میں ایندھن کے حصول کا جائزہ لینے کے لئے چوٹیوں کی پچھلی جانب سے گھوم کر آنا چاہتا تھا۔

بہرحال چھ بجے تک وہ کیمپ میں ہوگا' جہاں اس کے ساتھی روشن الاؤ کے گرد بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوں گے اور رات کا کھانا گرم کیا جا رہا ہوگا۔ کھانے کا خیال آنے پر اس نے اپنی جیکٹ کو ہاتھ سے دبا کر محسوس کیا کہ سفر کے دوران کے کھانے کا سامان محفوظ ہے۔ یہ چند بسکٹ تھے جو اس نے ایک رومال میں لپیٹ کر اپنے سینے کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ اس طریقے سے کھانے کی چیزیں جمنے سے محفوظ رہتی ہیں۔ وہ بدن کے ساتھ چسپاں خوراک کو محسوس کر کے مسکرایا اور خزاں زدہ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔

چڑھائی پر راستہ دشوار تھا۔ اور برف کے انبار میں پاؤں ایک ایک فٹ اندر دھنس رہے تھے۔ اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ وہ سامان کے بغیر سفر کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں ذرا سا وزن بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کے پاس سینے میں لگے بسکٹوں کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ اس لحاظ سے وہ خوش قسمت تھا' مگر بہرحال سردی کی شدت اسے حیران کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دستانوں کی پشت سے ناک اور گالوں کو سہلایا۔ واقعی بہت ٹھنڈ تھی۔ بہت ہی زیادہ ٹھنڈ تھی۔

اجنبی کے قدموں کے ساتھ ایک کتا چل رہا تھا۔ کتا برفانی علاقوں میں پائے جانے والی جنگلی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ کتے کا بدن سر سے پاؤں تک بھورے بالوں میں ڈھکا ہوا تھا' اور چہرے پر گہری

سنجیدگی کے آثار تھے۔ کتا جانتا تھا کہ اس قدر شدید ٹھنڈ میں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی جبلّت اسے موسم کے بارے میں زیادہ درست اطلاع دے رہی تھی۔ درحقیقت درجۂ حرارت منفی پچاس سے کم تھا۔ منفی ساٹھ سے بھی کم تھا۔ حتیٰ کہ منفی ستر سے بھی کم تھا۔ بات کہیں منفی پچھتر پر جا کر ٹھیرتی تھی۔ صفر سے بتیس درجے اوپر ہی نقطۂ انجماد آ جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ زمین پر برف کی ایک سو تین تہیں پھیل چکی تھیں۔ کتے کو درجہ حرارت ناپنے کے آلات کا علم نہیں تھا ممکن ہے اس کے ذہن میں موسموں کی شدت کا کوئی ٹھوس تصور بھی موجود نہ ہو مگر جانوروں کی جبلّت مختلف چیز ہے جب اجنبی نے چوٹیوں کی پچھلی سمت جانے کے لئے موڑ کاٹا تھا تو کتا چونک گیا تھا۔ اسے ایک مبہم سا خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے مالک کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد کسی پناہ گاہ میں جا کر الاؤ روشن کرنا چاہیے۔ کتا آگ کے استعمال سے واقف تھا۔ وہ آگ کا خواہش مند تھا۔ دوسری صورت میں وہ برف کھود کر اس میں دبک کر بیٹھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے بدن کی حرارت کو سرد ہوا سے بچا کر اپنی ہی گرمی اوڑھ سکتا تھا۔

کتے کا منہ اس کے سانس کی منجمد نمی سے سفید ہو گیا تھا۔ اس کی ناک، جبڑا اور پلکیں برف کی سفید تہہ میں چھپ گئی تھیں۔ اجنبی کا چہرا بھی سانس سے پیدا ہونے والی نمی جمنے سے سفید ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اس کی داڑھی اور مونچھیں ہر سانس کے ساتھ مزید سفید ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اجنبی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی تھا کہ وہ تمباکو چبا رہا تھا جب بھی وہ تمباکو کی پیک اُگلتا تو تمباکو کے رس کی دھار اس کی داڑھی پر جمی رہ جاتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ تمباکو کے رس کی شفاف تہہ بڑی اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اگر اجنبی منہ کے بل گرتا تو یہ تہہ آئینے کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی اور یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس علاقے میں تمباکو کھانے والوں کو اپنے شوق کی یہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اجنبی اس سے پہلے دو مرتبہ سرد طوفانوں میں مہم جوئی کر چکا تھا۔ گزشتہ دونوں موقعوں پر آج جتنی سردی نہیں تھی۔ اسے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس دن درجۂ حرارت منفی پچپن اور اس سے کچھ کم رہا تھا۔

وہ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے درمیان چلتا رہا۔ اس نے گھڑی دیکھی دس بج رہے تھے وہ چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا تھا۔ اس حساب سے وہ ساڑھے بارہ بجے تک مرکزی وادی میں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان محسوس ہوا اور اس نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔

کتا اُسے وہاں بیٹھتے دیکھ کر ناراضی کے انداز میں بھونکا۔ جانور کو اپنے مالک کی یہ حرکت قطعی پسند

نہیں آئی تھی۔ چاروں طرف شدید سردی سے پیدا ہونے والی دھند اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آج سے پہلے اس راستے پر کوئی مسافر نہیں گزرا۔ ایسی صورتِ حال میں کتے کی جبلت اسے مضطرب کر رہی تھی۔ مگر اجنبی غور و فکر کرنے والا شخص نہیں تھا۔ خاص طور پر اس لمحے اس کے پاس سوچنے کو کچھ نہیں تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ کھانے کے بعد وہ دوبارہ چلنا شروع کر دے گا۔ اور چھ بجے تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیمپ میں بیٹھا ہوگا۔ اسے اپنی تنہائی بھی بُری نہیں لگ رہی تھی۔ اس وقت کوئی ساتھ ہوتا بھی تو ہونٹوں پر جمی برف کی تہہ کے باعث اس سے گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے تمباکو چباتا رہا اور اپنی داڑھی پر پیک کی آئینہ نما دیوار بڑی ہوتے دیکھتا رہا۔

کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی آتا کہ آج جتنی ٹھنڈ اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ لاشعوری طور پر اپنے دستانے کی پشت سے ناک اور گالوں کو سہلاتا' لیکن جوں ہی ہاتھ رکتا اس کے گال دوبارہ سُن ہو جاتے۔ اور دوسرے لمحے اس کی ناک بھی منجمد ہو جاتی۔ ایک موقع پر اسے ناک اور گالوں کی حفاظتی پٹی نہ پہننے پر پچھتاوا بھی ہوا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ سردی سے اکڑ جانے والے اعضا کو بہر حال کبھی کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچتا۔ بس وقتی تکلیف ہوتی ہے۔ اور مہم جوئی کے دوران تھوڑی بہت تکلیف تو برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔

اجنبی کا ذہن گہرے خیالات سے عاری تھا مگر وہ ماحول کے خطرات اور دشواریوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اترائی پر یا کسی غیر متوقع موڑ پر وہ خوب دیکھ بھال کر قدم رکھ رہا تھا۔ ایک جگہ خطرے کی بو پا کر وہ گھوڑے کی طرح ٹھٹک گیا اور کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اسے خبر تھی کہ ندی کا پانی منجمد ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ان چشموں سے بچ رہا تھا جو زمین سے اُبلتے ہیں اور پرانی جمی ہوئی برف کے اوپر بہتے رہتے ہیں۔ ایسے چشموں کے پانی کو تازہ برف کی کچی تہ ڈھک لیتی ہے۔ اور بے خبری میں اس پر پاؤں دھرنے والا خود کو اچانک یخ بستہ پانی میں کمر تک ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے موسم میں بھیگ جانا مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی لئے وہ پیچھے ہٹ کر دیر تک برف کی تہ کے نیچے پانی کی حرکت کا تعین کرتا رہا۔ جوں ہی اس نے پاؤں کے نیچے برف ٹوٹتے محسوس کی تھی اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اگر اس کے پاؤں بھیگ جاتے تو اسے ہر حال میں الاؤ روشن کر کے جرابیں سکھانی پڑتیں اور یوں اسے کیمپ تک پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی۔ وہ کچھ دیر تک اپنے گالوں اور ناک کو سہلا کر سوچتا رہا اور پھر پانی کے رخ کا اندازہ کر کے اس کی مخالف سمت میں گھوم گیا۔

خطرے سے نکل کر اس نے تمباکو کی تازہ چٹکی منہ میں رکھی اور ایک مرتبہ پھر چار میل فی گھنٹہ والی اپنی مخصوص چال کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اگلے دو گھنٹوں میں وہ اس طرح کے بہت سے خطروں سے دوچار رہا۔ اکثر موقعوں پر تو برف کی مخصوص ساخت نے اسے وقت پر چوکنا کر دیا، مگر ایک مرتبہ وہ بہت مشکل میں پھنس گیا۔ اس جگہ پانی کی موجودگی دریافت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس نے کتے کو آگے بھیجنا چاہا لیکن کتا اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ تنگ آ کر اس نے کتے کو پیچھے سے دھکیلا تو وہ وحشت زدہ آوازیں نکالتا ہوا پانی میں دھنس گیا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد کتا دوسری سمت نکل گیا مگر اس کی ٹانگیں گیلی ہو گئیں۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کی ٹانگوں کی نمی نے برف کی شکل اختیار کر لی۔ جانور نے فوراً اپنی ٹانگیں چاٹ کر صاف کیں اور پھر لیٹ کر اپڑیوں میں داخل ہونے والی برف کو دانتوں سے کھرچنے لگا۔ اس کی جبلت اس سے یہ سب کچھ کروا رہی تھی۔ اگر برف جمی رہ جاتی تو کچھ دیر بعد اس کی ٹانگیں معذوری کی حد تک دکھنے لگتیں۔ ضروری نہیں کہ ماضی میں جانور کو دکھتی ٹانگوں کا کوئی تجربہ ہوا ہو۔ مگر اس کے وجود کی گہرائیوں سے اٹھنے والی آواز اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اجنبی اپنے گزشتہ تجربے کے باعث اس صورتِ حال کی نزاکت پہچانتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کا دستانہ اتار کر ٹانگوں پر جم جانے والی برف ہٹانے میں جانور کی مدد کرنا چاہی۔ دستانہ اتارتے ہی اس کی انگلیاں اکڑنے لگیں۔ وہ سردی کی شدت پر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر دوبارہ دستانہ چڑھایا اور اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا لیے۔

بارہ بجے کے قریب دن نسبتاً روشن ہو گیا، مگر موسم سرما کا سورج جنوب کی انتہائی سمت پر ہونے کے باعث منجمد دن پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکا۔ ساڑھے بارہ بجے وہ ڈھلوان کے بڑے موڑ پر پہنچ گیا۔ اسے اپنی تیز رفتاری پر خوشی ہوئی۔ "اگر میں نے یہ رفتار قائم رکھی"، اس نے سوچا۔ "تو میں چھ بجے تک کیمپ میں بیٹھا، لڑکوں کو اپنے سفر کا قصہ سنا رہا ہوں گا"۔ یہ خیال آتے ہی وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جیکٹ اور قمیض کے بٹن کھول کر کھانے کی پوٹلی نکالنے لگا۔ اس سارے عمل میں پندرہ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے، مگر اچانک اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی انگلیاں سن ہوتی ہوئی محسوس کیں۔ دوبارہ دستانہ چڑھانے کے بجائے اس نے اپنے ہاتھ زور سے ٹانگوں پر پٹخے، اور پھر برف سے ڈھکے ایک تنے پر بیٹھ کر کھانے کا رومال کھولنے لگا۔ ٹانگ سے ٹکرانے کے نتیجے میں اس کی انگلیوں میں آنے والی طاقت اتنی جلدی ختم ہوئی کہ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ابھی وہ

بسکٹ کا ایک ٹکڑا منہ میں نہیں ڈال سکا تھا کہ اس کے ہاتھ دوبارہ اکڑ گئے۔ مجبوراً اُس نے دوسرے ہاتھ سے دستانہ اتار کر تیزی سے بسکٹ منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر اس مرتبہ ہونٹوں پر جمی برف کی پتلی تہہ نے منہ نہیں کھلنے دیا۔ آگ تاپے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تک اُسے آگ جلانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جب وہ لکڑیاں جمع کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ایڑیاں بے جان ہو چکی ہیں۔ وہ گھبرا کر دوڑنے لگا۔ دوڑنے کی مشقت سے اس کی ایڑیوں میں زندگی کی رمق نمودار ہوئی تو وہ سانس درست کرنے کے لئے رک گیا "یہ تو خوف ناک ٹھنڈ ہے"۔ اس نے دل میں کہا اور مقامی باشندے کے بارے میں سوچا، جس نے اسے اس علاقے کے موسم کے بارے میں سمجھایا تھا "تم نہیں جانتے" مقامی باشندہ بولا تھا "یہاں کی سردی کبھی کبھی تمام حدیں پار کر جاتی ہے"۔ اُس وقت وہ مقامی باشندے کی بات پر ہنس دیا تھا، مگر اب اجنبی کو اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ واقعی سردی کی انتہا تھی۔ وہ پھر دوڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے خون کی گردش میں کچھ تندی آئی تو وہ ماچس نکال کر الاؤ روشن کرنے بیٹھ گیا۔ منجمد پانی سے گزشتہ موسم گرما میں جمع ہونے والی خشک شاخیں کھینچ نکالنا آسان نہیں تھا مگر وہ پوری قوت سے مصروف عمل رہا۔ آہستہ آہستہ وہ آگ دہکانے میں کامیاب ہو گیا۔ بلند ہوتے شعلے دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ خوشی سے رقص کرے۔ الاؤ کی تپش میں اس نے سب سے پہلے اپنے چہرے پر جمنے والی برف پگھلائی اور پھر فاقہ زدہ شخص کے انداز میں تیزی سے بسکٹوں پر منہ مارنے لگا۔ آگ دیکھ کر کتے نے خوشی کی آوازیں نکالیں اور الاؤ کے گرد چکر لگانے کے بعد آنکھوں میں چمکتے شعلوں کا عکس لیے جلتی لکڑیوں کے پاس بیٹھ گیا۔

اجنبی کھانا ختم کرنے کے بعد کچھ دیر تک آگ سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دستانے چڑھائے، ٹوپی سے سر اور کان ڈھانپے اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ کتے نے اجنبی کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کیا اور بار بار اسے چھوڑ کر آگ کی سمت واپس آیا۔ اجنبی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ سردی کیا ہوتی ہے۔ اس کے آباؤ اجداد میں سے بھی کسی کو سردیوں سے آشنائی نہیں رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نقطۂ انجماد سے ایک سو آٹھ درجے نیچے کا کیا مطلب ہے۔ لیکن کتا جانتا تھا۔ اس کی گزشتہ نسلیں جانتی تھیں۔ موسم کے تیور پہچاننا اس کے خون میں شامل تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اجنبی اس لمحے کسی صورت آگ سے دور نہ ہو۔ وہ خود بھی برف میں گڑھا کھود کر اپنے وجود کی حرارت میں گم ہونا چاہتا تھا۔ یوں بھی اجنبی اور کتے کے درمیان کوئی ایسا مضبوط رشتہ موجود نہیں

تھا۔ کتے نے تمام عمر اجنبی کی غلامی کی تھی اور بدلے میں ہمیشہ اُس کی ڈانٹیں سنی تھیں۔ اس لیے وہ اجنبی سے زیادہ خود اپنی فکر کر رہا تھا۔ آخری مرتبہ تو اس نے آگ کے نزدیک پاؤں گاڑ دیے اور چلنے سے قطعی منکر ہو گیا مگر اجنبی کی سرزنش اور دھمکی نے اسے خوف زدہ کر دیا اور وہ مجبوراً اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اجنبی نے تمباکو کی ایک تازہ چٹکی لی اور اپنے منہ پر پیک کی ایک اور شفاف دیوار گرانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی نمی منجمد ہو کر اس کی داڑھی اور مونچھوں کو دوبارہ سفید کرنے لگی بہت دیر تک وہ مسلسل چلتا رہا۔ تمام وقت اس کی مستعدی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک لمحے کی غفلت اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن ایک موڑ پر اس نے پکی برف کے دھوکے میں پانی کے اوپر جم جانے والی کچی برف کے ڈھیر پر پاؤں رکھ دیا اور سنبھلتے سنبھلتے ٹخنوں تک یخ بستہ پانی میں اتر گیا۔ اس نے اپنی قسمت کو بلند آواز سے کوسا اور پاؤں خشک کرنے کے لئے دوبارہ آگ جلانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے چھ بجے تک کیمپ پہنچنے کی امید تھی۔ مگر اس ناگہانی حادثے کے باعث تقریباً ایک گھنٹہ کی تاخیر ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس مرتبہ اس نے نہایت احتیاط سے آگ روشن کی۔ وہ جانتا تھا کہ پاؤں گیلے ہوں تو الاؤ گرم کرنے میں کوتاہی نہایت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ خشک پاؤں کے ساتھ آدمی آدھے میل تک دوڑ کر خون کی گردش درست کر سکتا ہے۔ مگر جب درجہ حرارت صفر سے پچھتر درجے نیچے ہو تو بھیگی ہوئی ٹانگوں کو ورزش سے حرارت نہیں پہنچائی جا سکتی۔ ایسی صورت میں جتنی تیزی سے دوڑا جائے اتنی ہی تیزی سے پاؤں سن ہوتے جاتے ہیں۔

وہ یہ سب کچھ جانتا تھا، لیکن موجودہ صورتِ حال یہ تھی کہ اس کی ٹانگیں مکمل طور پر بے بس ہو چکی تھیں۔ آگ جلانے کے لیے اسے دستانے اتارنے پڑے تھے۔ جس کے باعث اس کے ہاتھ کی انگلیاں بھی اکڑ گئی تھیں۔ اس کی چار میل فی گھنٹہ والی رفتار اس کے دل کی دھڑکنیں جاری رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی تھی، اور یہی سبب تھا کہ اس کے بدن کے دوسرے حصوں کو خون کی فراہمی جاری رہی تھی۔ مگر اب جبکہ وہ رک گیا تھا اس کے دل کا عمل بھی خطرناک حد تک آہستہ ہو گیا تھا۔ محوِ گردش سیارے کے اس حصے پر منجمد کائنات حملہ آور ہوئی تھی اور وہ سیارے کے اس حصے پر موجود ہونے کے باعث حملے کی شدت کو اپنی ہڈیوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اس کا لہو حرارت حاصل کرنے کے لئے اس کے بدن میں سمٹتا جا رہا تھا۔ اس کا لہو زندہ تھا اور کتا بھی زندہ تھا۔ اور زندہ لہو

کتے کی طرح کہیں چھپ جانا چاہتا تھا۔ خوفناک سردی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب تک وہ چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا رہا تھا اس کا لہو دھیرے دھیرے تمام اعضا تک پہنچتا رہا تھا۔ مگر اب لہو کہیں بدن کے کونے کھدروں میں بیٹھ کر منہ ڈھانپ رہا تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے' سب سے پہلے انگلیوں نے لہو کی دوری محسوس کی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بہت تیزی سے بے حس ہو رہے تھے۔ ناک اور گالوں کی سطح سے بھی خون کی تپش اترتی جا رہی تھی۔ پورے وجود پر یخ بستہ غبار بیٹھ رہا تھا۔

مگر وہ محفوظ تھا۔ یخ بستگی فقط ایڑیوں اور گالوں اور ناک کی سطح تک محدود رہے گی۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ بہت جلد وہ ان میں بڑی شاخیں جلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پھر وہ اپنے پاؤں جوتوں اور جرابوں سے باہر نکالے گا۔ ان پر برف رگڑ کر بنیادی حرارت فراہم کرے گا اور اس کے بعد انہیں آگ کی تپش سے روزمرہ حالت میں واپس لے آئے گا۔ آگ اس کی کامیابی کی علامت تھی۔ وہ محفوظ تھا۔ اسے مقامی باشندے کی بات پھر یاد آئی اور وہ مسکرا دیا۔ مقامی باشندے نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا کہ اس علاقے میں منفی پچاس درجہ' حرارت کے بعد ہرگز تنہا نہیں نکلنا چاہیے۔ وہ منفی پچاس سے زیادہ شدید موسم میں تنہا نکلا تھا اور محفوظ تھا "مقامی باشندے مردانہ صفات سے محروم ہیں"۔ اس نے دل میں کہا اور دوبارہ مسکرانے لگا۔ لیکن اس کے گال اور ناک حیران کن تیز رفتاری سے منجمد ہوئے تھے اور آج سے پہلے وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انگلیاں اتنے کم وقت میں بے جان ہو سکتی ہیں۔ انگلیاں واقعی بے جان ہو گئی تھیں۔ وہ انہیں حرکت دینے سے قاصر تھا۔ خشک ٹہنی پر ہاتھ رکھنے کے بعد وہ ٹہنی کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ اس کے اختیار سے باہر جا چکے ہیں۔ اب شاخ پر ہاتھ رکھنے کے بعد اسے دیکھنا پڑ رہا تھا کہ ہاتھ شاخ پر ہیں یا نہیں ہیں۔

"مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔ "سامنے آگ روشن ہے' سلگتی لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی ہیں اور زندگی سے لبریز شعلے ہوا میں لہرا رہے ہیں" اس نے اپنے جوتے اتارنے شروع کیے۔ ان پر برف کی تہ جمی تھی۔ موٹی جرابیں گھٹنوں تک لوہے کی طرح سخت ہو گئی تھیں' تسمے فولادی تاروں کی طرح الجھے ہوئے تھے' اور ان میں پڑی ہوئی گرہوں کا کھلنا اب ناممکن نظر آتا تھا۔ چند لمحوں تک وہ اپنی بے جان انگلیوں سے تسموں کے ساتھ الجھتا رہا۔ ناکام ہونے پر اس نے جیب سے سفری چاقو نکالا۔

اس سے پہلے کہ وہ تسمے کاٹتا' اس کی بدنصیبی نے اندھیرا پھیلا کر تمام سمتوں کو تاریک کر دیا۔ اس نے اپنی سہولت کے لئے ایک خزاں رسیدہ درخت کے نیچے آگ روشن کی تھی۔ جب بھی تازہ ایندھن کی ضرورت پڑتی وہ درخت کی چھوٹی شاخوں کو کھینچ کر سیدھا بھڑکتی آگ میں ڈال دیتا۔ اسی آسانی کی وجہ سے اس نے کھلے آسمان تلے الاؤ روشن کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مگر درخت کی اوپر والی شاخوں پر برف کے ڈھیر جمع تھے اور ہر مرتبہ جب اجنبی نیچے سے کوئی ٹہنی کھینچتا' درخت ایڑی سے چوٹی تک ہل جاتا۔ اس طرح درخت کی اونچی شاخوں پر جمی برف ہر بار خطرناک انداز میں اپنی جگہ سے کھسکتی چلی گئی اور اس مرتبہ جب اجنبی نے ایک ٹہنی توڑنے کے لیے زور لگایا' تو چوٹی کی بڑی شاخ کی برف پھسل کر نیچے والی شاخ پر گر گئی اور یوں برف کا ڈھیر ہر نچلی شاخ پر بڑا ہوتا ہوا ہنگامہ خیز طریقے سے الاؤ کے عین درمیان آ گرا۔ تمام شعلے سسکاریاں بھر کر ٹھنڈے ہو گئے۔ اور جس جگہ ایک لمحہ پیشتر آگ دہک رہی تھی' وہاں برف کی ان گنت چھوٹی بڑی ڈھیریاں دکھائی دینے لگیں۔

اجنبی کے منہ سے بے اختیار خرخراہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ یہ ایسی آواز تھی جو مجرموں کے منہ سے موت کی سزا سننے پر نکلتی ہے۔ کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں چند لمحے قبل آگ دہک رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ شاید مقامی باشندے کی بات درست تھی۔ اگر وہ تنہا نہ ہوتا تو اس وقت اس کا ساتھی دوبارہ الاؤ دہکا دیتا۔ بہر حال اب اسے خود ہی دوبارہ ہمت کرنی تھی۔ اور اس مرتبہ اسے پہلے سے سوگنا زیادہ محتاط رہنا تھا۔ اس کے پاؤں بہت بری حالت میں تھے اور دوبارہ آگ جلانے میں وقت درکار تھا۔ اس طرح اب کامیابی کی صورت میں بھی اسے پاؤں کی چند انگلیوں کا نقصان بہر طور برداشت کرنا تھا۔

ان حالات کے ساتھ وہ تن دہی سے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس بار آگ کے لئے اس نے درختوں سے ہٹ کر ایک جگہ کا انتخاب کیا' ایسی جگہ جہاں کوئی منحوس درخت اسے بجھا نہ سکے۔ خشک گھاس اور ٹہنیاں جمع کرنے کے لئے وہ ہاتھوں کی انگلیاں استعمال نہیں کر سکتا تھا مگر کوئی بھی چیز دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ کر زور لگانا اس کے بس میں تھا۔ انگلیاں استعمال نہ کرنے کا اسے نقصان ہوا کہ ہر ٹہنی کے ساتھ وہ بہت سا غیر ضروری گھاس پھونس بھی کھینچ لایا' لیکن ایسی صورت حال میں اس مشکل سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ جتنی دیر وہ آگ جلانے کی جان توڑ کوشش میں مصروف رہا۔ اس کا کتا اسے غور سے دیکھتا رہا۔ کتے کی آنکھوں میں اس کے لئے پیار کی جھلک

تھی۔ مالک الاؤ تیار کر رہا تھا جو نہایت مشکل کام تھا لیکن بہر حال الاؤ کی تیاری میں کتے کا بھی فائدہ تھا۔

جب ضرورت کی تمام چیزیں جمع ہو گئیں تو اجنبی نے اپنی جیب سے ماچس نکالنی چاہی' اور یکلخت اس پر آنے والے لمحوں کا خوف سایہ ڈال گیا۔ چاہے وہ جتنی کوشش کرتا اکڑی ہوئی انگلیوں کے ساتھ جیب سے ماچس نکالنا ناممکن تھا۔ ماچس جیب میں موجود تھی۔ اسے تیلیوں کے چھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر منجمد ہاتھوں کے ساتھ مخصوص لباس کی گہری جیب سے ماچس برآمد کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور اجنبی کے علم میں تھا کہ گزرنے والا ہر لمحہ اس کے پاؤں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ خوف کی شدت سے پیلا پڑ گیا۔ اس نے دانتوں سے دستانے اتارے اور زور زور سے پاؤں ہلائے۔ پھر اس نے پوری طاقت سے ہاتھوں کو اپنی ٹانگوں پر پٹخنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ چیخ پڑا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کھڑے ہو کر پاؤں پٹخے اور پھر لیٹ کر یہی عمل دہرایا۔ لیکن ٹھنڈ دھیرے دھیرے اس کی ہڈیوں میں اترتی گئی۔ اس تمام عرصے میں کتا خاموشی سے برف پر بیٹھا اسے اس کی دہشت ناک جدوجہد میں مصروف دیکھتا رہا۔ کتے کا بدن گھنے بالوں سے ڈھکا تھا اور وہ بیٹھنے میں یوں بل کھایا ہوا تھا کہ اس کا ہر عضو دوسرے عضو کے لئے سردی کے خلاف ڈھال بن گیا تھا۔ کتے کے کان آگے کی سمت جھکے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ اجنبی نے خود کو گرم رکھنے کی جان توڑ کوشش کے دوران کتے کو اطمینان سے بیٹھے دیکھا' اور اس کے دل میں جانور سے حسد کا جذبہ بیدار ہوا۔

کچھ دیر بعد اجنبی کی انگلیوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی اجنبی نے اپنے ہاتھوں کو زیادہ شدت سے پٹخنا شروع کر دیا۔ زندگی کے مدھم آثار آہستہ آہستہ بڑھنے لگے اور آخر کار ایک ناقابلِ برداشت درد میں تبدیل ہو گئے۔ لیکن اجنبی کے لئے یہ اذیت بھی خوش آیند تھی۔ اس نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر دائیں ہاتھ کا دستانہ اتارا اور دکھتے ہوئے ہاتھ سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ دستانہ اترنے پر اس کی انگلیاں نہایت تیزی سے دوبارہ اکڑنے لگیں۔ جب تک وہ ڈبیا سے تیلی نکال کر اسے روشن کرتا' بے پناہ ٹھنڈ نے اس کی انگلیاں دوبارہ بے حس و حرکت کر دیں۔ اجنبی نے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر پوری طاقت سے اکڑی ہوئی انگلیوں کو استعمال کیا۔ اس کوشش میں ماچس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر برف پر جا گری اور ادھ کھلی ڈبیہ کی تیلیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ وہ ڈبیہ اور تیلیاں اٹھانے کے لئے برف پر جھکا مگر ناکام ہو کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مردہ

انگلیاں چھونے اور گرفت میں لینے کی خصوصیات سے محروم ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے منجمد ہوتے گالوں اور ناک کا دھیان دل سے نکالا اور اپنی تمام توجہ ماچس پر مرکوز کر دی۔ اس مرتبہ اس نے ماچس کو غور سے دیکھا' اور چھونے کی قوت سے زیادہ دیکھنے کی طاقت پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ ماچس کی دونوں سمتوں پر لے گیا۔ پھر اس نے احتیاط سے دونوں ہاتھوں کو ماچس کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس تمام مدت میں وہ ماچس کو غور سے دیکھتا رہا جب ہاتھ ماچس سے جا لگے تو اس نے ایک جھٹکے سے بازو بلند کر لیے۔ ماچس کی ڈبیا چند تیلیوں اور بہت سی برف کے ساتھ اس کی گود میں آ گری۔ مزید جدوجہد کے بعد وہ ڈبیا کو ہتھیلیوں میں دبا کر منہ تک لے گیا جب اس نے منہ کھولا تو اس کے ہونٹوں پر جمی برف ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ڈبیا دانتوں میں دبا کر وہ ہتھیلیوں کی مدد سے ماچس جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر ایک تیلی نے سسکاری بھری اور اس کی گود میں گر گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے پاس بہت سی ادھ جلی تیلیاں نظر آنے لگیں۔ ڈبیہ کی تیلیاں ختم ہونے پر اس نے زمین پر بکھری سالم تیلیاں اٹھانی چاہیں' لیکن اس کے بے جان ہاتھ اتنی چھوٹی چیز کو گرفت میں نہیں لے سکے۔ ہاتھوں کے استعمال میں ناکام ہو کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور دانتوں سے تیلیاں اٹھانے لگا۔ منہ میں دبائی ہوئی تیلی کو اس نے گھٹنوں پر کہنیوں تلے رکھی ڈبیہ سے رگڑ کر جلانا چاہا۔ متعدد مرتبہ ناکام ہونے کے بعد اس نے کمر سیدھی کرنے کے لئے سر اٹھایا تو ڈبیہ دوبارہ برف پر گر گئی۔

''مقامی باشندہ صحیح کہہ رہا تھا''۔ اجنبی نے اداسی سے سوچا۔ ''منفی پچاس کے بعد تنہا نہیں نکلنا چاہیے''۔ پھر اس نے دائیں بائیں نظریں دوڑا کر حدِ نظر تک پھیلی دھند اور وحشت کو محسوس کیا اور خود سے کہا۔ ''ساتھی ضروری ہے۔ اس قدر وحشی موسم میں ساتھی ضروری ہے''۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے ہاتھوں کو سینے پر پٹخنا شروع کر دیا۔ مگر اس مرتبہ وہ ان میں زندگی کی رمق پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب سردی اس کے اندرونی اعضا پر اثر انداز ہو کر جسمانی اعمال کو منجمد کر رہی ہے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں وحشت کی جھلک ابھری۔ یہ ہولناک صورت حال تھی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ سامنے کتا بیٹھا تھا۔ کتے نے اپنے وجود کو اتنا سمیٹ لیا تھا کہ اب وہ بالوں سے ڈھکی ایک بڑی گیند لگ رہا تھا۔

کتے کے چہرے پر اطمینان کے آثار دیکھ کر اجنبی جھنجھلا گیا۔ اور اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک وحشی خیال نے جنم لیا۔ اسے مدتوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا کہ کس طرح ایک کوہ پیما نے جو برف

باری کے طوفان میں پھنس گیا تھا' آخری وقت میں ایک بیل کو ہلاک کیا اور اس کا پیٹ چیر کر جانور کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ یوں اس نے مدد پہنچنے تک خود کو محفوظ رکھا۔ ''میں بھی'' اجنبی نے کتے کی جانب دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''میں بھی اسے مار کر اس کے گرم بدن میں ہاتھ گاڑ سکتا ہوں۔ بس ذرا سی تپش ہی تو چاہیے۔ ہاتھوں میں جان لوٹ آئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر الاؤ روشن کرنے میں دیر نہیں لگے گی'' اس نے کتے کو اپنے پاس بلایا لیکن اس کی آواز میں یا آنکھوں میں یا بازوؤں کی جنبش میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے کتے کو خوف زدہ کر دیا۔ جانور کو آج کوئی چیز عام دنوں سے بہت مختلف محسوس ہوئی تھی اور اس کی جبلت نے اسے خبر دار کر دیا تھا۔ جانور خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کس چیز سے ڈر رہا ہے' مگر کوئی انجانا احساس اسے آج مالک سے دور رکھ رہا تھا۔ اس نے اجنبی کی آواز پر کان کھڑے کیے' اور آہستہ سے دُم بھی ہلائی' مگر اپنی جگہ سے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اجنبی کچھ دیر تک اُسے پیار سے پکارتا رہا۔ مگر اپنی آواز کو بے اثر پا کر آخر کار اس نے گھٹنوں کے بل کتے کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ مالک کے اس عجیب جسمانی انداز نے کتے کو مزید ہوشیار کر دیا اور وہ ایک خوفزدہ آواز نکال کر اس سے دور ہٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر اجنبی کچھ دیر برف پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا' پھر اس نے دانتوں کی مدد سے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہونے کے بعد اس نے جھک کر دیکھا اور اطمینان کیا کہ وہ واقعی کھڑا تھا۔ ٹانگوں کی مکمل بے حسی کے بعد وہ زمین سے اپنا تعلق محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے کتے کو عام آواز میں پکارا۔ روزمرہ حالت میں کھڑے ہونے کا انداز اور معمول کی آواز اتنی پُر فریب تھی کہ کتا دھوکے میں آ گیا' اور اپنی وفاداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر آہستہ آہستہ اس کے نزدیک آنے لگا جوں ہی وہ قریب آیا' اجنبی اس پر جھپٹ پڑا' مگر گھبراہٹ میں وہ یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ بے جان اعضا کے ساتھ وہ کتے کو ہلاک نہیں کر سکتا ہے۔ اس نے کتے کی گردن کو گرفت میں لینے کی کوشش کی' لیکن اس کے مردہ ہاتھ جانور کا گلا دبانے میں ناکام رہے۔ اس کی اکڑی ہوئی انگلیاں مڑ کر کتے کے وجود میں نہیں اتر سکتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ جانور گھبرا کر پیچھے ہٹتا' اجنبی نے آخری کوشش کے طور پر اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیے۔ کتے نے پیچھے کی سمت زور لگایا مگر اجنبی بازوؤں کی طاقت سے اسے اپنے سینے سے چمٹائے برف پر بیٹھ گیا۔

لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کتے کو بازوؤں میں لیے وہ دیر تک برف پر بیٹھا رہا۔ کلائیوں تک ناکارہ ہاتھوں کے ساتھ وہ نہ تو اپنا چاقو استعمال کر سکتا تھا اور نہ کتے کا گلا دبا سکتا تھا۔

تنگ آکر اس نے کتے کو چھوڑ دیا۔ جانور خوف زدہ آوازیں نکالتا' اپنی دم ٹانگوں میں دبائے دور تک بھاگتا گیا۔ خشک درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا' اور گھوم کر اجنبی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اجنبی نے سر جھکا کر اپنے ہاتھ تلاش کرنے کے لئے دائیں بائیں دیکھا۔ بازوؤں کے اختتام پر اس کے ہاتھ لٹک رہے تھے۔ ''کس قدر عجیب بات ہے''۔ اسے خیال آیا ''اپنے ہاتھ ڈھونڈنے کے لئے مجھے اپنی آنکھیں استعمال کرنی پڑ رہی ہیں''۔ اس نے گھبرا کر ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ دیر تک وہ پوری قوت سے بازو پٹختا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں زندگی کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا۔ جوں ہی وہ آنکھیں بند کرتا اس کے ہاتھ گم ہو جاتے۔

اسے خیال آیا کہ بات ہاتھوں اور پاؤں کے ضائع ہونے تک محدود نہیں رہی تھی' بلکہ اب زندگی اور موت کا سوال تھا۔ موت کا خیال آتے ہی وہ زرد پڑ گیا۔ اس طرح مرنا بھی اس کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ اچانک وہ برف پر اچھلتا' پھسلتا کیمپ کی طرف دوڑنے لگا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا شدید خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ سخت جسمانی جدوجہد کے سبب اسے چیزیں دوبارہ نظر آنے لگیں۔ یخ بستہ پہاڑی نالوں کے کنارے' خزاں رسیدہ درختوں کی شاخیں اور سردی سے ٹھٹھرا ہوا آسمان۔ پاگلوں کی طرح اچھل کود کرنے سے اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی جس کے باعث اب وہ کانپ نہیں رہا تھا ''ممکن!'' ہے اس نے خود سے کہا: ''اگر میں یوں ہی بھاگتا رہوں تو میرے پاؤں زندہ ہو جائیں' یا اسی دوران میں کیمپ تک پہنچ جاؤں...... ظاہر ہے مجھے چند انگلیوں کا نقصان تو برداشت کرنا ہی پڑے گا اور چہرے کا ایک حصہ بھی ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے گا۔ لیکن اگر میں کیمپ پہنچ گیا تو لڑکے میرا بقیہ وجود بچا لیں گے'' اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ لرزہ خیز خیال بھی ابھر رہا تھا کہ وہ کبھی کیمپ نہیں پہنچ سکے گا۔ الاؤ کے گرد بیٹھے قہقہے لگاتے لڑکے اس سے بہت دور تھے اور اس کا بدن تیزی سے انجماد کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بہت جلد اس کی لاش برف پر لوہے کی طرح ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی پڑی ہوگی۔ وہ اس ہولناک خیال کو بار بار پیچھے دھکیلتا' مگر ہر مرتبہ یہ خیال زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے آتا۔ اس کے لئے یہ بات بھی دہشت ناک تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ان ٹانگوں پر دوڑ رہا تھا جو کچھ بھی محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ اسے اپنی ٹانگوں کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے سر جھکا کر انہیں زمین سے ٹکراتے ہوئے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ جب وہ سر اٹھا کر دوڑتا تو بے حس ٹانگوں کے باعث اسے یوں لگتا جیسے وہ زمین سے کسی تعلق کے بغیر ہوا

کو چیرتا چلا جا رہا ہو۔
وہ اپنے اس ارادے پر سختی سے قائم تھا کہ اب اسے کیمپ تک دوڑتے چلے جانا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا' گرتا اٹھتا' اور پھر دوڑنے لگتا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ پھسل کر سر کے بل گرا تو دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے میں ناکام ہو گیا۔ ''مجھے تھوڑا آرام کر لینا چاہیے''۔ اس نے سوچا ''آرام کے بعد میں کھڑا ہو جاؤں گا اور پھر ثابت قدمی سے کیمپ تک چلتا جاؤں گا''۔ یہ سوچ کر وہ برف پر ہی بیٹھا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خاصا گرم اور بہتر محسوس کر رہا ہے۔ اس کی کپکپاہٹ دور ہو گئی تھی اور اس کے سینے میں حرارت کی ہلکی سی ایک لہر پیدا ہوئی تھی' لیکن جب اس نے اپنی ناک اور گالوں کو چھوا تو ان میں زندگی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ دوڑنے کی مشقت اس کے جسم کے منجمد حصوں پر بے اثر رہی تھی۔ اعضا کی سطح اب تک نہیں پگھلی تھی۔ یکلخت اسے محسوس ہوا کہ جسم کا منجمد حصہ پھیل رہا ہے۔ اجنبی نے فوراً اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے بدن کا ہر کونا اس خیال کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس خیال کی دہشت ہی اسے مار ڈالنے کی لیے کافی تھی۔ وہ چیخ مار کر اچھل پڑا اور اذیت زدہ چہرے کے ساتھ' ایک بار پھر پوری قوت سے بھاگنے لگا۔
اور تمام وقت کتا اس کے ساتھ دوڑتا رہا۔ جب وہ دوسری مرتبہ لڑکھڑا کر گرا تو کتے نے اپنی دم سمیٹی اور اجنبی کے سامنے بیٹھ گیا۔ کتے کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ وہ پوری توجہ سے اپنے مالک کو دیکھ رہا تھا۔ کتے کے اطمینان اور سکون پر اجنبی غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں جانور کو گالیاں دیں' مگر وہ اسی سکون اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ دوڑنے سے اجنبی کی کپکپاہٹ کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ بالآخر وہ موسم سے جنگ ہار رہا تھا۔ سردی ہر طرف سے اس کے بدن میں داخل ہو کر اسے مفلوج کر رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھ کر بھاگا مگر اس بار جلد لڑکھڑا کر دوبارہ منہ کے بل گر گیا۔
''بہادر ہمیشہ باوقار انداز میں موت کا سامنا کرتے ہیں''۔ اوندھے لیٹے ہوئے اس نے سوچا۔ پھر اسے اس مرغی کا خیال آیا جو کبھی کبھی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ بھاگ پڑتی ہے۔ یہ ایک عجیب خیال تھا۔ شاید وہ بھی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ بھاگنے کی احمقانہ کوشش کرتا رہا تھا۔ بہرحال اب وہ منجمد ہو کر مر رہا تھا۔ یہ اس کا مقدر تھا۔ اور اسے اپنے مقدر کو ایک مرد کی طرح قبول کرنا چاہیے تھا۔
اس خیال سے اس نے سکون محسوس کیا اور اس کے ساتھ ہی اس پر غنودگی کی پہلی لہر طاری ہوئی۔
''نیند کے دوران موت آ جائے تو کچھ محسوس نہیں ہوتا'' اس نے سوچا ''......سردی سے اکڑ کر مر جانا

اتنا دردناک بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ایک لحاظ سے یہ مرنے کا سب سے آرام دہ طریقہ ہے۔۔۔۔۔ورنہ تو آدمی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو سکتا''۔

اس نے دیکھا کہ دوسرے دن لڑکوں کو اس کی لاش مل گئی ہے۔اسے حیرت ہوئی کہ وہ خود بھی لڑکوں کے ساتھ کھڑا اپنا جسم دیکھ رہا ہے۔وہ اپنی تلاش کرنے والے گروہ میں شامل تھا''واقعی بہت ٹھنڈ تھی۔سامنے برف پر پڑی اپنی لاش دیکھ کر اسے خیال آیا''گھر واپس پہنچ کر میں انہیں بتاؤں گا کہ سردی اصل میں ہوتی کیا ہے۔

سامنے مقامی باشندہ گرم کپڑے پہنے اطمینان سے بیٹھا تمباکو کے کش لے رہا تھا۔

''تم صحیح کہہ رہے تھے' دوست۔۔۔۔۔تمہاری بات ٹھیک تھی''۔اجنبی نے مقامی باشندے کے تصور سے خطاب کیا پھر دوبارہ اونگھ گیا۔اس پر انتہائی آرام دہ اور پرسکون نیند طاری ہو رہی تھی۔کتا دیر سے اس کے سامنے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔دن اختتام کو پہنچ چکا تھا' لیکن الاؤ روشن ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔کتے نے آج تک کسی کو اس قدر شدید ٹھنڈ میں آگ جلائے بغیر برف پر بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔شام کی تاریکی گہری ہوئی تو جانور نے خوفزدہ آواز نکال کر اجنبی کو آگ کی ضرورت کا احساس دلانا چاہا۔مگر وہ بدستور بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔تنگ آ کر کتا آہستہ آہستہ اس کے پاس آ گیا۔موت کی بو سونگھتے ہی کتے نے چونک کر سسکاری بھری' اور جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔کچھ دیر وہ یخ بستہ آسمان تلے منہ اٹھا کر سہمی ہوئی آواز میں بھونکتا رہا۔پھر اس نے کیمپ کا رخ کیا' اور آہستہ آہستہ اس طرف کو روانہ ہو گیا جہاں الاؤ کے گرد قہقہے لگ رہے تھے اور کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔

☆

سنجیدہ عالمی ادب کا تقریباً نصف حصہ صرف موت کا نوحہ ہے' تمام فلسفی تمام ادیب' پُر تخیل ذہن کے تمام لوگ بالآخر وقت اور موت کے سوال پر ٹھٹک جاتے ہیں۔

دردِ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

''جسے پھانسی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔صرف وہ آدمی آزادی کا تصور کر سکتا ہے''۔البرٹ کامیو نے حرف آخر کہنا چاہا تھا۔اور جیک لنڈن ان لوگوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا جو آزادی کا تصور کر سکتے تھے۔

جیک لنڈن اپنے زمانے کے امریکی ادب اور ادیبوں سے بہت آگے تھا اور وہ اپنے بعد آنے

والے مشہور عالم ''ارنسٹ ہمینگوے'' سے بھی بہت آگے تھا۔ جو اسی طرح کی موت کے بارے میں بہت سوچتا تھا' مگر وہ لنڈن کی طرح حالتِ مرگ کا گہرا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جیک لنڈن کا مضبوط بدن اسے مہم جوئی میں بہت دور تک لے گیا' اور پھر وہ قصہ کہنے کا فن بھی جانتا تھا۔

افسانہ نگاری کے میدان میں مہم جوئی کے افسانے کی اپنی قدر و قیمت اور حیثیت ہے۔ اس طرح کہانی میں کردار اپنے ماحول کے تناظر میں نمایاں ہو کر نشوونما پاتا ہے اور ارتقاء کی اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک افسانہ نویس اسے لے جانا چاہتا ہے۔ مہم جوئی کی کہانی ایک لحاظ سے عام کہانی سے یکسر مختلف ہے افسانہ نگار کے ذہن میں آغاز ہی سے کہانی کا انجام واضح ہوتا ہے آغاز اور انجام کے دوران پیش آنے والے واقعات بھی ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے ہی تبدیلی کے عمل سے گزر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے عام کہانی کہنے والوں کی بہ نسبت جغرافیائی ماحول کی پابند کہانی کہنے والے فن کار کو زیادہ باہوش رہنا ہوتا ہے۔ امریکن ادب کو ابتداء ہی میں ''میلو وِل'' جیسا عظیم الشان نثر نگار مل گیا تھا اور پھر اس نے جیک لنڈن جیسے ادیب کے ہاتھوں پرورش پائی۔ اس کے باوجود بیسویں صدی میں امریکی ادب اکثر سطحی ادیب کیوں تخلیق کرتے رہے؟ یہ معمہ ہے!

جیک لنڈن زندگی کو ایک خاص زاویے سے بہت خوب دیکھتا تھا۔ یہ جہدِ بقا کا زاویہ ہے اور یہ اہم ہے کہ ادیب' دنیا کو پانی سے باہر کھینچ لی جانے والی مچھلی کی آنکھ سے بھی دیکھ چکا ہو۔ اسی مشاہدے میں محو ہو جانا گہرائی سے زیادہ پھیلاؤ کی جانب لے جاتا ہے۔ یہی اس مہم جو قصہ گو کی خوبی ہے جس نے چالیس برس کی عمر میں بے کسی کی موت سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی تھی۔

الڈس ہکسلے

ماریا

وہ دل کش نقوش اور بھورے بالوں والی ایک نازک سی عورت تھی۔ چمکدار نیلی آنکھوں کے علاوہ اُس کے بدن کی ہر چیز لطافت کی حامل تھی۔ چھوٹے چہرے پر بے چینی سے حرکت کرنے والی بڑی آنکھوں میں ہلکی سی اُداسی کی جھلک نمایاں تھی۔ غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا جیسے کسی معصوم لڑکی کے چہرے پر سوچ بچار کرنے والی عورت کی آنکھیں نصب کر دی گئی ہیں۔

''ماریا کے اعصاب'' اُس کے خاوند کو جب بھی بتانا پڑتا کہ اُس کی بیوی اُس کے ساتھ کیوں سفر نہیں کر رہی ہے تو وہ انہی الفاظ میں جواب دیتا۔ ''ماریا کے اعصاب لندن اور نیویارک کی مصروفیات اور ہنگاموں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ بہت حساس ہے۔ بہت ہی زیادہ حساس''۔ دوسری مرتبہ لفظ ''حساس'' ادا کرتے ہوئے ماریا کے خاوند کا ذہین چہرہ پیار کے جذبے سے لبریز ہو جاتا۔ تاروین کو اپنی بیوی سے پیار تھا۔ اگر وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے ذرا بھی فرصت پاتا تو وہ ماریا کے ساتھ وقت گزرانے سے گریز نہ کرتا۔ لیکن وہ بہت اہم موضوع پر تحقیق کر رہا تھا۔ وہ طبی دنیا کے صفِ اوّل کے تحقیقی ادارے کا سربراہ تھا۔ ادارے کا موضوع سرطان تھا۔

''بے چاری ماریا' اور اُس کے اعصاب!'' اور یہ بات درست تھی۔ وہ اس قدر نازک مزاج تھی کہ کسی طرح بدنمائی یا منفی جذبے کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ موسمِ بہار سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے خاوند کے مشورے پر دنیا کے ہنگاموں سے دور اٹلی کے پُر فضا مقام کے اس خوبصورت بنگلے میں داخل ہوئی تو اُسے کھڑکی سے نظر آنے والے سفیدے کے درختوں نے بے چین کر دیا'' قبرستان کی طرح۔ بالکل قبرستان کی طرح''۔ مالکِ مکان نے اُسے بنگلے کی ہزاروں خوبیاں گنوا دیں مگر وہ بار بار سفیدے کے درختوں پر نظریں گاڑ کر زیرِ لب دہراتی رہی'' جیسے قبرستان ہو۔ ہو بہو ہی''۔

بالآخر مالکِ مکان نے مضبوط لہجے میں کہا تھا ''مادام سفیدے کے درختوں کا جنازے کے سوگواروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ (اور یہ بات اس نے اُسی وقت گھڑی تھی) یہ تو خوشی کی

علامت سمجھے جاتے ہیں اور اگر آپ کو باغبانی کا شوق ہے تو آپ پھول اُگائیے کھلکھلاتے پھول ہر طرح کی اُداسی پر غالب آجاتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں قدیم یونانیوں کے لیے سفید گلاب کے پھول"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے"۔ ماریا نے اُکتا کر کہا تھا۔ "ختم کرو"۔

اُسے باتونی لوگوں سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر اور بولتا رہتا تو شاید وہ چیخ پڑتی۔

عجیب عورت ہے۔ مالک مکان نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ اُسے عجیب تصور کرتے تھے۔ مگر زیادہ تر کے لیے اُس کا عجیب ہونا کشش کا باعث تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر ناراضگی کا اظہار کرتے وقت وہ تجربہ کار مردوں کو اُس پیاری سی بچی کی طرح دلکش لگتی تھی جسے گود میں اُٹھا کر پیار کیا جاتا ہے۔ ماریا کے "گڑیاپن" کے سامنے ہر مرد خود کو زیادہ مضبوط، ذہین اور جسمانی طور پر برتر محسوس کرتا تھا اور اتفاق سے ماریا نے اپنا بچپن ایسے مردوں میں گزارا تھا جو واقعی برتری کے حامل تھے۔ اُس کے دادا سرواٹنی اپنے زمانے کے مشہور ترین ڈاکٹر تھے۔ اپنے والدین کے حادثاتی انتقال کے بعد وہ پانچ سال کی عمر میں اپنے دادا کے پاس چلی گئی تھی۔ سرواٹنی نے اپنی اکلوتی پوتی کو بہت ناز و نعمت سے پالا تھا۔ سرواٹنی ابتدا سے فارغ وقت میں فلسفے کی کتابوں اور مچھلیوں کے شکار سے دل بہلاتے تھے۔ ماریا کی آمد سے اب انہیں ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور ماریا بتدریج بڑی ہوتی گئی مگر سرواٹنی کو اس کی معصومیت سے جذباتی وابستگی ہو گئی تھی۔ انہیں اُس کے بچپنے کی ضد اور پرندوں جیسے اُچھل کود سے عشق تھا۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اُسے جیبی گھڑی کی طرح اپنی جیب میں لیے پھرتے اور جب بھی تھکن محسوس کرتے اُس سے کھیل کر دل بہلاتے۔ ماریا کی بلوغت کے باوجود اُس سے بچوں جیسا سلوک کرنے میں انہیں لطف آتا تھا۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ بہت بلند قامت تھے۔ مگر اپنے پیشے سے اپنے مشاغل کی جانب پلٹنے پر وہ خود بچہ بن جاتے تھے۔ تمام دن کی نہایت سنجیدہ مصروفیت کے بعد وہ ماریا کے ساتھ کھیل کر دوسرے دن کے لئے توانائی حاصل کرتے تھے۔

سرواٹنی کے تمام احباب بھی اُنھی کی طرح معاشرے کے سرکردہ افراد تھے۔ نامور ڈاکٹر، اعلیٰ عدالتوں کے جج، اہم سرکاری عہدے دار، ماہرینِ معاشیات و سیاسیات۔

سرواٹنی کے گھر کھانے پر مدعو ہونا ایک اعزاز تھا جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا تھا۔ سترہ برس کی عمر سے ماریا ان محفلوں میں موجود واحد لڑکی تھی۔ سرواٹنی اُسے "میری بچی" کہہ کر پکارتے تھے،

جبکہ ان کے رفیقوں کے لئے وہ ''ہماری بچی'' تھی۔ ماریا نے بچپن سے کھانے کی میز پر طبیعات' مابعد الطبیعات' صنعتی انقلاب اور وجود عدم جیسے موضوعات پر گفتگو سنی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے کراں خلاؤں اور رفتار نور پر ہونے والی بحث کے دوران کوئی بچکانہ جملہ کہہ دیتی تو سب بے اختیار ہنسنے لگتے۔ وہ معاشرے کی نمایاں ترین شخصیات کی تفریح طبع کا سامان تھی۔ آخر میں وہ اپنے دادا اور ان کے احباب کے لئے ایک ایسا پالتو جانور بن گئی تھی جس سے گھر کے تمام افراد اس قدر پیار کرتے ہیں کہ وہ بے جا لاڈ سے بگڑ کر نخرے کرنے لگتا ہے اور اُس کے یہ نخرے بھی اس کی اداؤں میں شمار ہوتے ہیں اور اُس کی دلکشی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

رات ساڑھے نو بجے وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی اور گفتگو ایک مرتبہ پھر حیات بعد از مرگ' حقیقتِ کبریٰ اور نظریہ ارتقا پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

اُس کا خاوند تاروین ایسی ہی ایک محفل میں اُس سے متعارف ہوا تھا۔ تینتیس سال کا ہونے کے ناطے وہ اُس رات میز پر بیٹھے لوگوں میں سب سے کم عمر تھا مگر سرطان کو جنم دینے والی رسولیوں پر اس کی تحقیق دنیا بھر کے طبی مراکز میں مستند تسلیم کی جاتی تھی اور اُس رات تمام لوگ خاص طور پر اس موضوع پر اس کی گفتگو سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ''حضرات' آپ مسٹر تاروین کی کم عمری پر مت جائیں''۔ سروانٹی نے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہ بلند حوصلہ نوجوان سرطان کے میدان میں حرفِ آخر کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اور اس کی تحقیق کا دائرہ افریقہ ہندوستان' شمالی اور جنوبی امریکہ پر محیط ہے۔ لندن' جرمنی' جاپان اور راک فیلر انسٹی ٹیوٹ نیویارک کے تحقیقاتی ادارے مسٹر تاروین کی سربراہی میں اس موذی مرض کا علاج دریافت کرنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کی پیش رفت قابلِ ذکر ہے اور......'' اب سروانٹی نے تاروین سے اپنے دوستوں کو متعارف کرایا۔ ''مسٹر تاروین آپ یقیناً ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ یہ جسٹس گائیڈے ہیں اور یہ پروفیسر براڈ واٹر اور یہ پروفیسر اسٹیگ اور...... آہا مس ماریا۔ تم کو تو خوردبین سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ میری پوتی ہے' ماریا'' تاروین نے ماریا کو دیکھا اور اُس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ واقعی کسی گڑیا کی طرح پُرکشش تھی۔

''بہر حال اب ہماری شادی کو پانچ برس گزر چکے ہیں''۔ ماریا نے رخساروں پر پاؤڈر لگاتے ہوئے سوچا...... اور اب میرے خاوند کا چہرہ کبھی کبھی اچانک بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو کر بجھ جاتا ہے۔'' ماریا کو تاروین کے اس میکانکی انداز سے چڑ تھی۔ کلک! ایک لمحے بعد اُس کا چہرہ بجھ

جاتا اور وہ دوبارہ سرطان پر تحقیق کرنے والے عالمی ادارے کا سربراہ بن جاتا۔ سنجیدہ، عظیم خیالوں میں گم۔ عام آدمی کی پہنچ سے دور روز مرہ کی معمولی باتوں سے بیگانہ۔

ماریا نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تاروین کی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ تصویر واحد چیز تھی جو گزشتہ پانچ برس سے اُسے یاد دلا رہی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ تصویر میں بھی تاروین کے ماتھے پر ہلکی سی شکن تھی۔ اور اس کی آنکھیں کسی سنجیدہ نقطے پر غور کر رہی تھیں۔ کہیں کسی زندہ وجود میں کوئی پھوڑا، رسولی میں تبدیل ہو کر آہستہ آہستہ ناقابلِ علاج سرطانی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اور وہ اس لحہ لحہ بدلتی ہوئی صورتِ حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اُس کا بہتر رُوپ تھا بعض اوقات جب وہ اپنے مزاج میں شاعرانہ عنصر کی موجودگی کا احساس دلاتا تو اُس کی شخصیت بہت مضحکہ خیز ہو جاتی تھی " ہر چند کہ میرا موضوع انسانی جسم ہے" وہ کہتا "......مگر میں روح سے عاری نہیں ہوں"۔ یہ سن کر ماریا مٹھیاں بھینچ لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا خاوند اوّل تا آخر ایک خشک اور محدود موضوع میں ڈوبا ہوا پیشہ ور شخص ہے اور اُس کا آخری تجزیہ یہی تھا کہ اُسے تاروین سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن تاروین نے شادی پر اتنا اصرار کیا تھا اور سروانتی کے حلقۂ احباب میں ہر شخص اس کی اتنی تعریف کرتا تھا اور دیکھنے کی حد تک اُس کی شخصیت اس قدر جاذب نظر تھی اور فاصلے سے اُس کی زندگی ایسی پرکشش معلوم ہوتی تھی۔ دنیا بھر کا سفر، اور اعلیٰ جگہوں پر قیام......اور پھر وہ اپنے دادا اور ان کے شناساؤں کا کھلونا بنے رہنے سے بھی عاجز آ چکی تھی۔ تاروین سے شادی کرنے کی چھوٹی چھوٹی اتنی وجوہ تھیں کہ اس کے خیال میں سب مل کر ایک بڑی وجہ بن جاتی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا یہ اُس کی غلط فہمی ثابت ہوئی تھی۔

بہر حال یہ حقیقت تھی کہ جب تاروین شاعرانہ لہجے میں فطری مناظر اور خدا کی قدرت کے کمالات کے بارے میں گفتگو کرتا تھا تو ماریا کو زیادہ ناگوار گزرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک لمحے میں یہ نقاب اتار کر اپنے اصل چہرے میں ظاہر ہوگا۔ اور اُس کے چہرے پر بالآخر وہی آنکھیں چمکیں گی جو ہر جاندار وجود میں کیمیائی عناصر کا بگاڑ اور سرطان کی جڑیں تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ہر چند کہ وہ اپنی شخصیت کے رومانی پہلو پر اصرار کرتا تھا۔ "چاہے تم نہ مانو"۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتا "مگر میری پسندیدہ شخصیت گوئٹے ہے۔ سرتاپا شاعر۔ ہمہ تن عاشق، عالمی ادب میں اتنا زرخیز دماغ اور کوئی نہیں ہے۔ اُس کی زندگی ایک حقیقی ادیب کی زندگی تھی۔ میں بچپن سے گوئٹے سے متاثر ہوں" ماریا اس بات کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ گوئٹے کو مثالی شخصیت سمجھنے والا اپنی ذاتی زندگی میں اس

نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"تم اس طرح کی باتیں تو کر لیتے ہو"۔ ماریا نے واشگاف انداز اختیار کر لیا۔ "لیکن تم نے آج تک اپنے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ نہ ہی تم کسی چیز کے حُسن کا اندازہ کر سکتے ہو۔ تم نے اپنے جذبات بھی کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔ تم نے کہیں پڑھ لیا ہے کہ عورت ساتھ ہو تو ایسی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس لئے تم ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں نصابی طور پر علم ہے کہ فطری مناظر دیکھ کر کس قسم کا ردِ عمل ظاہر کرنا چاہیے۔ اس لئے تمہارا ردِ عمل وہی ہوتا ہے۔ تم دُنیا کے عظیم فن کاروں کے حالاتِ زندگی سے آشنا ہو۔ اس لئے تم ان جیسا انداز اپنا لیتے ہو۔ مگر اس میں تمہارا دل شامل نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے دماغ کی کارستانی ہے"۔
تاروین کو کسی نے آج تک اس طرح کے لفظوں سے گھائل نہیں کیا تھا۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟" اُس نے مردہ آواز میں پوچھا۔
اس لئے کہ یہی حقیقت ہے۔ یہی حقیقت ہے تم دل کے معاملات میں بھی اپنا سر استعمال کرتے ہو۔ اور...... اور سر بھی وہ جس پر سے بال مستقل کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بہت جلد تم مکمل گنجے ہو جاؤ گے"۔ یہ کہہ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی ہنسی لرزہ خیز ہو گئی۔
"تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں"۔ حسبِ عادت تاروین کے چہرے نے دوبارہ تحقیقی ادارے کے سربراہ کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ "تمہیں واقعی کسی صحت افزا مقام پر آرام کی ضرورت ہے"۔
ماریا نے آئینے میں خود پر آخری نظر ڈالی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مہمان خانے میں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ انٹونیو اُس کا منتظر تھا۔ وہ ہمیشہ وقتِ مقررہ سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔ ماریا کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اُس کا ہاتھ چومنے کے لئے سر جھکا کر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ ماریا کو اطالوی تہذیب کا یہ مظاہرہ بہت دلچسپ لگتا تھا۔ تاروین کے پاس اس طرح کے تکلفات کے لئے وقت نہیں تھا۔ مصروفیت کے باعث ہی تاروین اپنے لباس پر بھی توجہ نہیں دیتا تھا۔ انٹونیو اس لحاظ سے بہت مختلف تھا۔ اُس کے آداب، اُس کا لباس، اونچے چمکدار جوتے اور چمڑے کی جاذبِ نظر جیکٹ...... وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ پندرہ دن کی واقفیت میں ماریا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ انٹونیو کسی بہت زیادہ دولت مند گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا، مگر اُسے یہ بھی علم تھا کہ دُنیا کی غریب آبادی میں بے شمار دلچسپ، قابلِ اعتماد اور بے لوث لوگ پائے جاتے ہیں۔ انگلینڈ سے ماریا کے

قدر خشک اور سپاٹ ہو سکتا تھا۔

"مجھے اُس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی"۔ ماریا نے آئینے میں اپنے عکس کو مخاطب کیا اور نفی میں سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آج صبح سے اُسے اپنی شادی شدہ زندگی کی ناگوار باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ان گنت بے رس سائنسی مضامین جو اُسے محض اپنے خاوند کی خاطر سننے پڑے تھے ان عجیب و غریب دواؤں کی تفصیلات جن کے نام لیتے ہوئے زبان میں بل پڑتے تھے اور پھر وہ مرجھائے ہوئے شکن آلود چہروں کی باہمی ملاقاتیں اور ان کی احساس سے عاری ناقابل فہم گفتگو جس میں اسے اپنی تھکن اور سر درد کے باوجود شریک ہونا پڑا تھا۔ مگر اپنے پیشے کی اصطلاحات کے بوجھ تلے دبے وہ سب لوگ تاروین کے لیے بہت اہم تھے۔ اہم اور دلچسپ جبکہ اس کے لیے وہ محض مسخرے تھے۔ مسخروں کا ہجوم اور نرم و نازک ماریا۔

"خدایا!" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بہ آواز بلند کہا۔ شادی کے دوسرے ہی دن سے اس کی ناخوش گوار زندگی کی ابتداء ہو گئی تھی۔ ہنی مون کے پہلے دن دریا کے کنارے چلتے ہوئے تاروین نے اسے تمام وقت فطری مناظر کی تعریف میں کہی گئی انگریزی نظمیں سنائی تھیں اور مختلف پھولوں کے سائنسی نام بتائے تھے اور وادی کے پرندوں کی نسلوں پر علم الابدان کے حوالے سے گفتگو کی تھی۔ ہنی مون کے اختتام پر ماریا کو ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ اُس کے اعصاب بکھر رہے ہیں۔ اور یہ کہ اُسے تنہا آرام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اُس نے بچپن سے معمول سے ہٹی ہوئی زندگی گزاری تھی۔ ایک لحاظ سے وہ زندگی تھی ہی نہیں بلکہ میکانکی حرکت تھی۔ جیسے مُردہ مینڈک کی ٹانگ کو برقی رو سے چھوا جاتا ہے۔ تو وہ پھیلنے سکڑنے لگتی ہے مگر اُسے زندہ وجود کا عمل نہیں کہا جا سکتا۔

اٹلی کے اس صحت افزا مقام پر آنے سے پہلے اُسے تاروین کے ساتھ گزارا ہوا اپنا آخری دن یاد آیا۔ وہ اس کے گھٹنوں سے سر لگا کر بیٹھا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ وہ خوردبین سے آنکھ لگا کر جراثیم کی حرکات دیکھتے دیکھتے تھک چکا ہے۔ اُس دن وہ جذباتی لہجے میں محبت کو زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ قرار دے رہا تھا۔ اور بتا رہا تھا کہ کائنات کی ہر چیز میں حسن ہے اور دلکشی ہے۔ اور یہ کہ ہر شخص کو گوئٹے کی طرح شاعرانہ زندگی گزارنی چاہیے۔ اُس کی آواز میں اس قدر بناوٹ تھی اور وہ اتنی دیر تک بولتا رہا تھا کہ آخر میں ماریا کا بے اختیار چیخنے کو جی چاہا تھا۔

"خدا کے لئے تاروین!" اُس نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "خاموش ہو جاؤ"۔

اُس کے تند ردعمل پر تاروین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اُس

ساتھ آنے والے خدمت گار نے انٹونیو کو دیکھ کر پہلے ہی دن ناگواری کا اظہار کیا تھا ''یہ تو مجھے کوئی مقامی حجام لگتا ہے''۔ اس نے منہ بنا کر کہا تھا' اور ماریا کو اپنے خادم کی اس قدر بے باک رائے اچھی نہیں لگی تھی۔

درحقیقت انٹونیو حجام نہیں تھا۔ اس کا خاندان اٹلی کے کسی دور دراز قصبے میں ہوٹل کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ اُسے شہر بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے آبائی کام کے جدید رجحانات سے واقفیت حاصل کر کے اس کاروبار کو وسیع کر سکے۔ انٹونیو کا باپ سڑک کے کنارے واقع چھوٹے سے ہوٹل کو بلند تر سطح پر چلانے کا خواہشمند تھا' اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انٹونیو کچھ عرصے بعد اپنے آبائی قصبے میں واپس آئے۔ اور اپنے تجربے اور تعلیم سے اُس کی مدد کرے۔ فی الحال انٹونیو شہر کے ہاسٹل میں ایک طالب علم کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مسز تاروین سے اس کی ملاقات شہر سے باہر جانے والی شاہراہ کے کنارے نہایت رومانی انداز میں ہوئی تھی۔ ماریا حسب عادت وقت گزاری کے لیے بلا مقصد گاڑی چلا رہی تھی کہ اچانک اُس کے ٹائر کو کسی نوکیلی چیز نے ناکارہ بنا دیا۔ اگر بازوؤں میں طاقت ہو تو گاڑی کا ٹائر بدلنا انتہائی آسان کام ہے' مگر ماریا کے سڈول بازوؤں میں طاقت ہی کی کمی تھی۔ جب انٹونیو اپنے موٹر سائیکل پر وہاں سے گزرا تو ماریا گہری ہوتی شام سے خوف زدہ ہو کر تقریباً آنسو بہانے والی تھی۔

اُس شام انٹونیو نے ہوسٹل میں اپنے دوستوں کو بچکانہ فخر کے ساتھ یہ واقعہ سنایا۔ انٹونیو کے حلقے میں غیر ملکی عورتیں دیو مالائی کرداروں کی طرح تھیں۔ اٹلی کے پُر فضا مقامات کی سیر کو آنے والی عورتوں تک رسائی حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور انٹونیو اس کی گاڑی کا ٹائر بدلنے کے بعد اُسے اُس کے گھر تک چھوڑ کر آیا تھا اور وہ اُس علاقے میں رہائش رکھنے والی تمام عورتوں کی طرح بہت دولت مند اور خود مختار تھی۔ اس کا بنگلہ اور بنگلے کے اندر رکھا سامان' فراغت اور تعیش کا آئینہ دار تھا۔

ماریا اور انٹونیو کی واقفیت کو دوستی میں تبدیل ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔ دو ہفتوں کے دوران یہ ان کی پانچویں ملاقات تھی۔

''چند معمولی سے پھول'' انٹونیو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا' اور اپنا بایاں ہاتھ سامنے بڑھایا جس میں اُس نے سفید گلابوں کا گلدستہ تھام رکھا تھا۔

''میں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں؟ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان میں کہا۔ تاروین کبھی

اُس کے لیے پھول نہیں لاتا تھا۔ وہ اس طرح کے تکلفات کو وقت کا زیاں سمجھتا تھا۔ ماریا نے گلدستے پر منہ رکھ کر گہری سانس لی اور پھر آنکھیں کھول کر انٹونیو کو مسکرا کر دیکھا۔ ''تمہارا ہزار مرتبہ شکریہ''۔ اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا اور دوبارہ سانس لی۔ انٹونیو نے سر جھکا کر انکساری کا مظاہرہ کیا۔

''سفید گلاب کے لئے سفید گلاب'' اس نے بہت سوچ کر کہا۔ ماریا کو ہنسی آ گئی یہ نہایت سطحی بات تھی۔ مگر پھر بھی اُسے اچھی لگی تھی۔

انٹونیو کتابوں کی دنیا اور علمی موضوعات سے بہت دور تھا' لیکن وہ روزمرہ زندگی کا بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ چند دن قبل جب ماریا نے مکان کی اندرونی آرائش میں تبدیلی کرنی چاہی تھی تو وہ سارا دن اس کا ہاتھ بٹاتا رہا تھا۔

مزدوروں کو بھی وہی بلا کر لایا تھا' اور ان سے ماریا کی خواہشات کے عین مطابق کام کروایا تھا۔ اور پھر وہ مستری سے صرف اس بات پر اُلجھ گیا تھا کہ وہ ماریا کی بات پر پوری طرح عمل نہ کرنے کے بعد اُس سے معاوضہ بھی زیادہ طلب کر رہا تھا۔

''گھر میں اس طرح کے آدمی کا وجود کتنا آرام دہ ہوتا ہے''۔ ماریا کو خیال آیا۔ ''......ایسا آدمی جسے کوئی بین الاقوامی فریضہ انجام نہیں دینا ہوتا۔ جو گھر کی دیکھ بھال اور گھریلو خوشیوں ہی کو سب سے اہم اور ضروری کام سمجھتا ہے''۔ تاروین کی موجودگی میں گھر کا تمام کام از خود ماریا کے سپرد ہو جاتا تھا۔ تاروین کے لئے اس کا اپنا کام پوری دنیا سے زیادہ اہم تھا۔ انٹونیو خود کو آسمانی مخلوق نہیں سمجھتا تھا۔ اِس کی عملی صلاحیتوں اور دلچسپیوں سے ماریا کو روزمرہ کے کام نمٹانے میں بہت سہولت ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ ماریا کو انٹونیو کی عادت سی ہو گئی۔ وہ ہر کام کر لیتا تھا۔ بلب کا فیوز اُڑ جاتا تو انٹونیو اسے تبدیل کراتا۔ آتشدان کے دھوئیں کی نکاسی کے راستے میں زہریلی مکھیوں نے چھتے بنا لئے تو اس نے گندھک کی دھونی دے کر انہیں بھگا دیا۔ اور گھریلو اخراجات میں کمی کرانے کا تو وہ ماہر تھا۔ اُسے ہر چیز کی قیمت معلوم تھی۔ شہر کے بازاروں میں سودا سلف لینے کے با کفایت طریقوں سے اُس کی آشنائی قابلِ دید تھی۔ گوشت میں ذرا سی خرابی ہوتی تو وہ نتھنے پھلاتا سیدھا قصائی کے پاس پہنچ جاتا اور اُس سے گوشت کے بارے میں اتنے باریک پہلوؤں پر گفتگو کرتا کہ قصائی آئندہ اُس گھر میں خراب گوشت بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے سبزی فروش کی چالاکی پکڑ کر

اُسے بھی سرِ عام شرمندہ کر دیا تھا۔ مچھلی بازار میں اُس نے ایک دکاندار سے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ وہ ہفتے میں دو دن صبح کے شکار سے بہترین قسم کی تازہ مچھلی خود ماریا کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ ماریا کے لیے یہ سب کچھ اس لئے بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ اُس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک کبھی عام گھریلو اخراجات کی پروا نہیں کی تھی۔ اُس نے دنیا کی اعلیٰ ترین اشیائے صرف ان کی قیمتوں سے بے نیاز ہو کر استعمال کی تھیں۔ آنجہانی سروانٹی کے تمام گھریلو اخراجات کی ذمہ داری ایک پیشہ ور خانساماں نے سنبھال رکھی تھی۔ اور تاروین کے لیے اس بات کی قطعی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ کھانے کی میز پر کیا سجایا گیا ہے۔ اور اس پر کتنا خرچ آیا ہے۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ گھر کے انتظامات پر وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ عورتیں اپنی ذہنی توانائی کسی بڑے موضوع پر صرف کریں' یوں بھی انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کا بڑا حصہ ہوٹلوں' سرکاری مہمان خانوں اور بین الاقوامی اداروں کی ایسی رہائش گاہوں میں گزارا تھا جہاں کسی کو اپنے انفرادی اخراجات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ابتداء میں ماریا کو انٹونیو کی کفایت شعاری محض ماریا کے کام آنے کی بچکانہ خواہش معلوم ہوئی تھی۔ مگر بعد میں اُسے احساس ہوا تھا کہ انٹونیو کے لیے عام اشیاء کی قیمتوں پر نظر رکھنا واقعی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اور رفتہ رفتہ ماریا کے لئے بھی ہوش مندی اور دانائی سے گھریلو اخراجات میں کمی کرنا وقت گزاری کا پُر لطف ذریعہ بن گیا تھا۔ مالی استحکام اور معاشی تحفظ کے باعث اُس نے بے خبری کی زندگی گزاری تھی۔ لیکن اب انٹونیو کی صحبت میں وہ بازار کی ہوشیاریوں اور باریک بینی سے آشنا ہو رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ اپنی جگہ بہت انوکھا اور دلچسپ تھا۔

دوسرے دن صبح ہی سے آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سے سورج کی کوئی کرن چند لمحوں کے لیے جھانکتی اور زمین کا چھوٹا سا قطعہ روشن کر کے دوبارہ گم ہو جاتی۔ پورے ماحول میں دل کو بوجھل کر دینے والی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا اتنی ساکن تھی کہ کمرے سے باہر کی فضا اور اندر کی گھٹن میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ ماریا کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے سر کے ایک کونے سے درد کی لہر پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آج اُس کے اعصاب ایک بار پھر اُس کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ بہت دنوں بعد آج پھر وہ پنجرے میں بند پرندے کی طرح ہر آواز اور حرکت پر چونک رہی تھی۔ لرز رہی تھی۔ بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے خادمہ کو بلایا اور بغیر کسی خاص وجہ کے اُسے ڈانٹا اور جان بوجھ کر ایسے الفاظ کہے جو خادمہ کی عزتِ نفس کو مجروح کرتے تھے۔ پھر توجہ بٹانے کے لئے اُس نے چند خطوط لکھنے چاہے مگر اس کی انگلیاں سیاہی سے داغدار ہو گئیں۔ قلم نے کاغذ پر

گہرے اور پھیلتے ہوئے نقوش بنانے شروع کر دیے۔ تنگ آ کر اُس نے قلم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور کاغذ کو ہاتھوں میں مسلتے ہوئے پوری دنیا کو کوسنے لگی۔ یکلخت اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور کچھ دیر بعد وہ باقاعدہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ اُس کے رونے کی آواز پر خادمہ دوڑی چلی آئی اور اُس سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگی۔ ماریا کو خادمہ سے بدسلوکی کرنے پر افسوس ہوا اور اُس نے الماری سے نئی جرابوں کا جوڑا نکال کر اُسے تحفہ دیتے ہوئے معافی مانگی۔

''مادام مسئلہ کیا ہے؟'' خادمہ نے احترام سے دہرے ہو کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں''۔ اُس نے سوجی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم جاؤ۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

شام کے وقت وہ طوفان کی گھن گرج سے گھبرا کر بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گہرے سیاہ بادلوں کے سبب تاحدِ نظر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک بجلی کڑکی اور ایک لمحے کے لئے آسمان شاخ درشاخ روشن ہو گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے اعصاب ایک مرتبہ پھر مقید پرندوں کی طرح پھڑکنے لگے۔ اس بار افق پر بجلی چمکی اور پہاڑوں کی چوٹیاں خوفناک انداز میں نمایاں ہو کر تاریکی میں ڈوب گئیں۔ تیز ہواؤں کے شور میں بارش کے قطروں کی گونج بھی شامل ہو گئی۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے ماحول کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بجلی کی چمک میں اُسے صنوبر کے درخت جنازے پر رونے والوں کی طرح لرزتے ہوئے نظر آئے۔ ہوا کا رُخ بدلا تو بارش کی پھوار کمرے کے اندر گرنے لگی۔ ماریا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھڑکی بند کی اور بستر پر بیٹھ گئی' طوفان کی شدت سے پورا کمرہ یوں تھرتھرا رہا تھا جیسے کوئی خستہ حال لاری کسی ناہموار سڑک سے گزر رہی ہو۔

''خدایا! خدایا''۔ ماریا اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دہرانے لگی۔

''آسمانی بجلی سے ڈرنا انتہائی حماقت ہے''۔ اسے تاروین کے الفاظ یاد آئے۔

''اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال بہت کم ہوتا ہے۔ اوسط کے حساب سے ہزار میں ایک کا امکان ہے۔ سن رہی ہو۔ سو میں ایک نہیں' ہزار میں ایک۔ اور پھر چہرہ ڈھانپ لینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ چہرہ چھپانے سے تو یہی ہوگا کہ......''

تاروین کی ایسی باتیں ہی تو اُسے مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ جذبات سے عاری اس کی منطق اور کتابی دلائل......اور اس قدر لاتعلق انداز۔

''خدایا! خدایا'' اُس نے دوبارہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اور پھر اچانک وہی ہوا جس کا اُسے اندیشہ تھا۔ ہوا کے زور سے برقی تاریں آپس میں ٹکرائیں اور پورا گھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

''اسانتا! اسانتا'' وہ چیزوں کو ٹٹولتی' ٹھوکریں کھاتی کمرے سے باہر نکلی اور خوف سے لرزتی آواز میں خادمہ کو پکارنے لگی۔ دفعتہً بجلی کی چمک سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہوئیں اور اُسے محسوس ہوا جیسے عین مکان کی چھت پر دھماکا ہوا ہو۔

''اسانتا! اسانتا'' وہ نوکروں کے کمروں کی طرف دوڑی۔ ایک اور چمک نے اُسے راستہ دکھایا اور چمک کے ہونے والے دھماکے سے پہلے وہ دروازے کی کنڈی پکڑ چکی تھی۔ ''اسانتا! دروازہ کھولو۔ اسانتا! اُس کا لہجہ سہم ناک ہو گیا تھا۔ مگر اُس کی آواز بارش کے شور میں دب گئی تھی۔ یکلخت ایک اور دھماکہ ہوا اور اُس کے کمرے کی بڑی کھڑکی کا شیشہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بجلی کی چمک میں اُس نے اپنے کمرے میں ڈاک کے لفافے اور کاغذ اُڑتے دیکھے۔ کاغذ کا کوئی ٹکڑا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ اُس نے چیخ ماری اور واپس کمرے کی جانب دوڑی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اسانتا اور خانساماں اندھیرے میں ماچس کی تیلیاں جلاتے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے اُس کی جانب آ رہے تھے۔

''اسانتا! خدا کی پناہ۔ کہاں رہ گئی تھیں'' وہ خادمہ کا بازو پکڑ کر ہانپنے لگی۔

اسانتا نے طوفانی آوازوں کے ہنگامے میں پورا زور لگا کر بتایا کہ اتفاق سے گھر میں کوئی موم بتی نہیں تھی' اور ماچس کی تین ڈبیوں میں سے آخری زیرِ استعمال تھی۔

''پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟'' اُس نے لرزتی ہوئی آوز میں پوچھا۔ ''اندھیرے میں رہیں گے؟''

''اوئی!'' اسانتا نے وہ تیلی پھینک دی جو اُس کی انگلیاں جلانے لگی تھی۔ بجلی چمکی' دھماکہ ہوا اور دونوں عورتوں کی ٹانگیں بے جان ہونے لگیں۔

''اندھیرے میں؟ ہیں؟ بالکل اندھیرے میں رہیں گے؟؟ اس کی آواز میں پاگل پن کے آثار اُبھر رہے تھے۔

جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو انٹونیو ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ ''تمہارا فون ہے۔ انٹونیو'' منیجر نے کمرے میں جھانک کر کہا۔ ''کوئی عورت ہے''۔ اُس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جملہ مکمل کیا۔

انٹونیو فخریہ چال چلتے ہوئے کمرے سے باہر گیا۔ چند منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی برساتی کے بٹن بند کر رہا تھا۔ ''جانا ہی پڑے گا۔'' اُس نے کندھے اُچکا کر بے پروائی سے کہا۔

''اس وقت!'' بیک وقت تین آوازیں گونجیں۔

''کہاں؟''

''کیوں؟''

''پاگل ہوئے ہو؟''

اُس نے دوبارہ بے پروائی سے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ اس طرح کے طوفان میں گھومنے کا عادی ہو۔ مسز تاروین کا فون تھا۔ بجلی چلی گئی۔ موم بتی تک نہیں۔ پورے گھر میں اندھیرا ہے۔ اس کے اعصاب۔''

''......لیکن سڑکیں دریا بنی ہوئی ہیں۔ اور تم کھمبوں پر چڑھ کر تاریں جوڑنے سے تو رہے۔'' ہوٹل کے مالک کا بیٹا بولا۔ اُس کے پاس اچھے پتے آئے تھے اور وہ بازی ادھوری رہ جانے پر چڑ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے ضرور جاؤ''۔ عورت بازی کے فن میں طاق، برٹو نے کہا ''بس قیمت صحیح وصول کرنا۔ سمجھے'' یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا۔ دوسروں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ انٹونیو بھی آنکھ مار کر مسکرانے لگا۔

اس کا موٹر سائیکل پانی میں یوں چلتا رہا تھا جیسے سڑک سے کوئی فوارہ گزر رہا ہو۔ انٹونیو کے ذہن میں برٹو کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ ماریا خوبصورت تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں انٹونیو کے دل میں کبھی اُس سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اور ماریا نے بھی کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے وقت گزاری کے علاوہ کسی اور خواہش کا اظہار ہوتا ہو۔ مگر برٹو کا کہنا تھا کہ کامیاب مرد وہی ہے جو اپنی راہ میں آنے والی زیادہ سے زیادہ عورتوں کو ہم بستری پر رضامند کرے''

''......اور یہ تو غیر ملکی بیگمات میں سے ہے۔'' برٹو کے الفاظ تھے۔ ''اسے آمادہ کر لینے والا تو واقعی مرد کا بچہ ہوگا''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے'' انٹونیو نے خود کو کہتے سنا' اور اس کا بایاں ہاتھ

مونچھوں کو بل دینے لگا۔ جب وہ کسی بات پر غور کرتا تو اُس کا ہاتھ خود بخود مونچھوں کی طرف اُٹھ جاتا تھا۔

ابھی وہ گیٹ پر ہی پہنچا تھا کہ ماریا دروازہ کھول کر باہر بھاگتی چلی آئی۔ وہ کھڑکی سے لگی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

انٹونیو! انٹونیو" اُس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ زندگی میں شاید ہی کسی کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی ہو۔

"تم آگئے۔ انٹونیو تم...... تم نے طوفان کی بھی پروا نہیں کی۔ تم۔ انٹونیو تم بہادر ہو۔ میں زندگی بھر تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکوں گی۔ تم" وہ بجلی کی خوفناک کڑک سے لرز گئی اور اس نے دہل کر انٹونیو کی برساتی میں منہ چھپالیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انٹونیو نرم آواز میں ہمدردی کا اظہار کرتا اُسے کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں آ کر وہ ایک بار پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔
اس مرتبہ انٹونیو نے دلاسہ دینے کے انداز میں اُس کی کمر تھپتھپائی اور بالوں میں اُنگلیاں پھیریں۔ پل بھر کے لیے آسمان روشن ہوا تو انٹونیو کو کونے میں رکھا ہوا صوفہ نظر آیا۔
وہ نہایت ملائمت اور آہستگی کے ساتھ ماریا کو اندھیرے میں دھیرے دھیرے صوفے تک لے گیا۔ اور اُسے ساتھ لیے صوفے پر بیٹھ گیا۔ انٹونیو کو خود بھی معلوم نہیں ہوا کہ اُس نے کب ماریا کو چومنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آہستہ سے کسمسا کر اُس کے بازوؤں میں یوں ساکت ہو گئی تھی جیسے خوف زدہ بچہ بالآخر گود کی عاطفت پا کر پُرسکون ہو جاتا ہے۔ "تم بہت پیاری ہو۔ ماریا" انٹونیو نے سرگوشی کی۔ "بہت پیاری اور دلکش"۔
اور یہ بات درست بھی تھی۔ خود کو اتنی معصومیت سے انٹونیو کے سپرد کر دینے پر اُس کو بھیگی ہوئی، خوف زدہ ماریا پر بے انتہا پیار آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ماریا کا بدن زندگی کی حرارت سے لبریز ہونے لگا، اور اس کی سانسوں میں خوف کی ناہمواری کی جگہ جذبات کی تندی اُبھرتی محسوس ہوئی۔ انٹونیو کو خیال آیا کہ اس کے وجود کے عین مرکز میں کوئی خالی پن تھا جسے صرف محبت سے بھرا جا سکتا تھا۔
ایک ایسا خلا، جس کی تاریکی اور گہرائی اسے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ وہ برسوں کی پیاسی زمین کی طرح تھی، جس کی مٹی بارش کے ابتدائی چھینٹوں کو اتنی تیزی سے جذب کر لیتی ہے کہ چند لمحوں بعد ہوا میں پھیلی سوندھی خوشبو ہی بارش کی واحد نشانی رہ جاتی ہے۔
"قیمت صحیح وصول کرنا"۔ انٹونیو کو برٹو کی بات یاد آئی اور وہ ایک لمحے میں عاشق کے بلند و بالا مقام

سے کھلنڈرے نوجوان کی سطح پر اُتر آیا جسے اپنے ساتھیوں کو اپنی کامیابی کی اطلاع دینی تھی۔ اور اُس نے درمیانی منزل طے کیے بغیر اچانک۔ بے تکلفی کی آخری حد پر جست لگا دی۔ لیکن ماریا کا ردِ عمل چیخ، کپکپاہٹ اور شدید مدافعت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

☆

"کیسا رہا؟" انٹونیو ہوسٹل واپس پہنچا تو برٹو نے دریافت کیا۔ "تار جوڑ دیے؟"

"ہاں"۔

"معاوضہ پورا لیا؟"

"کچھ بقایا رہ گیا ہے"۔ انٹونیو نے مسکرا کر کہا اور اچانک خود اپنی کمینگی اور گھٹیا پن پر جھنجلا گیا۔ اُس نے سب کو گھور کر دیکھا جو اس کی بات سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور سر درد کا بہانہ بنا کر فوراً اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنی زیادتی کا خیال آنے پر سونے سے پہلے اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

دوسرے دن آسمان مکمل نیلا اور بے داغ تھا۔ گرد و غبار سے پاک فضا میں درختوں کے گیلے پتوں پر دھوپ آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ ساکن اور شفاف ماحول میں بے شمار تتلیاں اُڑتی پھر رہی تھیں۔ ماریا نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو اس قدر خوشگوار موسم دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے گزشتہ رات کا طوفان محض اُس کا وہم تھا۔ لیکن کیاریوں میں پودے جڑوں سمیت اکھڑے پڑے تھے۔ باغ کی راہداریاں ٹوٹے پتوں، بکھرے پھولوں اور گملوں کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ صبح کی ہوا کے نرم جھونکوں اور نکھری دھوپ کے باوجود رات کا طوفان اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت تھا۔ ماریا نے ٹھنڈی سانس بھری اور بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ آئینے کے سامنے رکھی تاروین کی تصویر اُسے دیکھ رہی تھی۔ تاروین کی آنکھیں حسب معمول تصوراتی رسولیوں پر گڑی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ تصویر سے نظریں چراتی رہی، مگر پھر جھنجلا کر اُس نے تصویر اُٹھائی اور الماری کھول کر کپڑوں کے ڈھیر کے پیچھے پھینک دی۔

تیار ہونے کے بعد وہ گاڑی چلاتی شہر کے مرکزی بازار کی جانب نکل گئی۔ جب وہ قیمتی تحائف کی ایک دکان سے باہر نکلی تو دکان کا مالک اُسے دروازے تک چھوڑنے کے لئے آیا۔

"آج کے بعد تم یہ استعمال کرنا"۔ شام کو جب انٹونیو نے اپنا پہلا سگرٹ سلگانے کے لیے چمڑے کا پیکٹ نکالا تو اُس نے سونے کا سگریٹ کیس اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ انٹونیو نے

حسبِ عادت مُبالغے کی حد تک ماریا کا شکریہ ادا کیا۔ کوئی اُسے اتنا قیمتی تحفہ دے سکتا تھا؟ انٹونیو کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ماریا کو اُس کی شخصیت کا یہ رُخ بہت دلچسپ لگا' اور وہ دیر تک اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

''تمہیں یہ پسند آیا؟'' بالآخر اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بہت''۔

''میں کوئی ایسا تحفہ دینا چاہتی تھی جو تمہیں ہمیشہ گزشتہ رات کی یاد دلاتا رہے۔ ہر ایک کو اپنے اچھے عمل پر فخر کرنے کا حق ہے۔ جب بھی تم اس سے سگریٹ نکالو گے تمہیں یاد آئے گا کہ تم ایک رات کسی نادان اور بزدل لڑکی کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے تھے''۔

انٹونیو صبح سے سوچ رہا تھا کہ رات کے واقعے کے بعد وہ ماریا کا سامنا کیسے کرے گا۔ اُس نے شرمندگی مٹانے کے لیے کئی باتیں سوچی تھیں' بہت سے جملے خاص طور پر یاد کیے تھے اور ان کی طرزِ ادائیگی پر غور کیا تھا۔ مگر ماریا نے اتنی خوبصورتی سے تمام بات ختم کردی تھی اب اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ اُس نے دل میں ماریا کی دانش مندی کی داد دی۔ کچھ دیر تک وہ احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ماریا کو دیکھتا رہا اور پھر اُس نے بے اختیار اپنے بازو کھول دیے۔ ماریا نے اُس تک پہنچنے میں قطعی تاخیر نہیں کی۔

''مجھے تم سے محبت ہے' ماریا۔ شدید محبت'' اس نے اطالوی زبان میں کہا۔ اجنبی زبان میں محبت کے مکالمے زیادہ مؤثر' زیادہ نوکیلے' زیادہ پگھلا دینے والے ہوتے ہیں۔

''مجھے بھی تم اچھے لگتے ہو''۔ ماریا بولی۔

انٹونیو نے جھک کر اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے' مگر اس بار وہ تڑپ کر اُس کے حلقے سے نکل گئی۔

''ابھی نہیں۔ انٹونیو'' اُس نے محبت اور التجا سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے''۔

دن گزرتے رہے۔ فضا میں بہار کی نشانیاں ہر روز پہلے سے زیادہ نمایاں ہوتی گئیں۔ شام کے وقت بلبلوں کی آوازیں سماں طاری کرنے لگیں۔

''خوبصورت'' ماریا نے بلبلوں کی آوازوں سے سرشار ہو کر خود سے کہا۔ ''خدا نے اس مخلوق کو کس قدر خوبصورت آواز سے نوازا ہے...... یا شاید''۔ اب کے وہ اپنے خیال پر خود مسکرا دی۔ ''...... یا

شاید یہاں یہ اطالوی زبان بولتی ہیں جس سے ان کی آواز کی تاثیر بڑھ جاتی ہے''۔

میں اتنی خوش ہوں۔اتنی خوش ہوں'' ۔وہ گنگنانے لگی۔ ہر چند کہ تاروین نے اُسے بتایا تھا کہ حقیقی خوشی فقط اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی کوئی مفید کام کرے یا پھر ان لوگوں سے ملاقات دلی مسرت کا باعث ہوتی ہے جو معاشرے میں نمایاں حیثیت پر فائز ہوں۔ انٹونیو کو کسی اعلیٰ اور ''مفید'' کام سے سروکار نہیں تھا اور اُس کی معاشرتی حیثیت بھی قابلِ ذکر نہیں تھی۔ اس کے باوجود (یا شاید اسی باعث) ماریا اُس کے ساتھ بلا مقصد اِدھر اُدھر گھومنے سے اس قدر لطف اندوز ہوتی تھی۔ وہ اُس سے گھنٹوں گھریلو مسائل پر گفتگو کرتی تھی۔ پردوں کے رنگ' فرنیچر کی ساخت' اندرونِ شہر کے بازاروں میں ملنے والی گھریلو دستکاریاں۔ مضافات میں فروخت ہونے والے آرائشی مجسمے' موسم کی پیش گوئی اور اس پر شرطیں۔ یہ تمام باتیں بعض اوقات اُسے خوشی سے اس قدر لبریز کر دیتی تھیں کہ وہ سرشاری ہو کر بے اختیار گنگنانے لگتی تھی۔ ''میں اتنی خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں۔''

انٹونیو بھی اپنے انداز میں اُس کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا۔ اُس کے شناسا اُسے اتنی بڑی کار میں' اس قدر پُر وقار اور خوبصورت غیر ملکی عورت کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اُس پر رشک کرتے تھے۔ وہ فارغ اوقات میں اپنے دوستوں کو فخریہ لہجے میں اپنی ملاقاتوں کا احوال سناتا تھا۔ اور پھر قیمتی تحائف ان تمام چیزوں کے علاوہ تھے۔ ماریا تقریباً ہر ہفتے ہی اُس کے لیے کوئی چیز بطورِ خاص خریدتی تھی۔

طوفانی رات والے واقعے کے بعد برٹو اُسے ماریا سے جنسی تعلقات قائم کرنے پر مسلسل اُکسا رہا تھا۔

''تم نہیں جانتے'' اُس نے انٹونیو کو اپنے سابقہ تجربوں کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''عورتیں خود چاہتی ہیں کہ ان سے زبردستی کی جائے۔ ذرا سا تشدد' جارحیت' اسی کو تو یہ مرد کی شان سمجھتی ہیں'' انٹونیو نے ایک مرتبہ برٹو کی بات پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر ماریا کا ردعمل بہت تند اور غیر متوقع تھا۔ اُس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر انٹونیو نے آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو وہ اُس سے ملنا یکسر ختم کر دے گی۔ اس دن انٹونیو کو خیال آیا تھا کہ ماریا دراصل برٹو کے تجربے میں آنے والی تمام عورتوں سے مختلف ہے۔ اور انٹونیو اُسے گنوانا قطعی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی شاندار کار' پُر تعیش گھر اور قیمتی تحفے انٹونیو کو بغیر جسمانی تعلقات کے بھی خوش و خرم رکھنے کے لیے کافی تھے۔

حسبِ دستور دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ماریا کی خواہش تھی کہ اُس کی

تمام زندگی اسی طرح گزر جائے۔ سکون اور اطمینان سے بہتے میدانی دریا کی طرح جو کبھی کبھی دائیں بائیں تیکھے موڑوں سے گزرتا ہے مگر اس کے راستے میں تاریک گہرائیاں اور زخمی کر دینے والے بھنور اور دم گھونٹ دینے والی کم گنجائش گھاٹیاں نہیں آتیں۔ ماریا بے فکری کے لمحات کو عمر بھر پر محیط کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اتنی آسانی سے ایک دلچسپ کھیل میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ صبح سے شام تک ایک پُر خلوص ساتھی کا ہاتھ تھامے رہو اور گھومتے رہو۔ ہنستے رہو بولتے رہو اور رات کو ایک خوشگوار تھکن لیے گہری نیند سو جاؤ تاکہ صبح کے وقت ایک اور روشن دن گزارنے کے لیے تازہ دم ہو کر اُٹھ سکو۔

وہ تمام زندگی اسی خوش گوار اور بے فکر انداز میں گزارنا چاہتی تھی۔ مگر تاروین کے ٹیلی گرام نے اُسے اطلاع دی کہ ایسا ہونا شاید ممکن نہ ہو۔ وہ پھپھوندی اور پھوڑوں پر لیکچر دینے کے لیے جمعرات کو روم جارہا تھا' اور راستے میں چند دن کے لیے اُس کے ساتھ قیام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ٹیلی گرام پڑھ کر ماریا کا چہرہ بُجھ گیا۔

وہ کیوں آنا چاہتا ہے؟ پھر وہی لاحاصل اور اکتا دینے والے شب و روز، وہی بے کار موضوعات' وہی خشک اور طویل گفتگو وہ ابھی ابھی انٹونیو کے ساتھ دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت کئی گھنٹے گاڑی چلانے کے بعد لَوٹی تھی۔ راستے میں انہوں نے اتنے انوکھے اور دلکش مناظر دیکھے تھے۔ ٹیلی گرام موصول کرتے ہی دن بھر کے تمام کھلکھلاتے لمحے اور روشن منظر اس کی آنکھوں کے ساتھ ہی ماند پڑ گئے تھے۔

تاروین نے گاڑی سے اُتر کر اسٹیشن پر کھڑی ماریا کو سینے سے لگا لیا ''میری جان''۔ وہ ماریا کو چومتے ہوئے بولا ''کیسی ہو؟''......اور ماریا نے دیکھا اُس کے ناخن ہمیشہ کی طرح میل سے اٹے ہوئے تھے۔

ماریا نے رات کے کھانے پر انٹونیو کو بھی مدعو کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تاروین بھی اُس سے متعارف ہو جائے۔ انٹونیو کو تاروین سے نہ ملانے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ انٹونیو اور اُس کے تعلقات خالص دوستی کے رشتے پر استوار تھے۔ ان میں کوئی کجی بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں اب تک معاشرتی اخلاقیات کی مکمل پابندی کرتے رہے تھے۔ ان کے درمیان دو ایسے واقف کاروں کا ربط تھا جو اپنا فارغ وقت ایک دوسرے کی صحبت میں نہایت خوش گوار طریقے سے گزار سکتے ہیں اور وہ چاہتی تھی کہ تاروین بھی اس رشتے کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ مستقبل میں کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ ابتدا میں

تاروین نے پہلی رات کھانے پر اجنبی کی آمد پر ناگواری کا اظہار کیا۔ ''میری جان!'' اُس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہم اتنے دنوں بعد اکٹھے ہوئے ہیں۔ آج کی رات ہم تنہا ہی کھانا کھاتے تو بہتر تھا'' ۔ ماریا نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ تاروین کا جذباتی ہونا اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اُس کا اصل روپ نہیں ہے۔ اس لمحے وہ محض ایک اور کتابی اصول پر عمل کر رہا ہے۔

بہرحال انٹونیو کے آنے پر تاروین ایک بار پھر بین الاقوامی تحقیقی ادارے کا سربراہ بن گیا۔ اُس نے اپنے مہمان سے اٹلی کی سیاست اور معاشرتی مسائل پر گفتگو کا آغاز کیا۔ نئی تعلیمی پالیسی سے روزگار کے مواقع پر کیا اثرات مرتب ہو رہے تھے؟ اور بے روزگاری کی صورت میں تعلیم یافتہ افراد کی ہمدردیاں کس سیاسی پارٹی سے وابستہ ہونے کی توقع تھی۔ قصبوں سے دارالحکومت آنے والوں کو روکنے کے لیے کیا حکمتِ عملی وضع کی جارہی تھی؟ مستقبل کی خوش حالی کے لیے کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ آبادی کا ایک حصہ صنعتی انقلاب کے ثمرات کو زرعی میدان میں بروئے کار لائے؟ جدید آئین پر سرکاری افسران کے تاثرات کیا تھے؟

ماریا کے اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ تاروین اپنے مقابل کی استعداد جانے بغیر اُسے اپنی بلند سطح سے شرمندہ کر رہا تھا۔ انٹونیو کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس کے ملک کے مسائل میں اس زاویے سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ جس اٹلی سے اُس کی آشنائی تھی وہ اُس کے دوستوں کا اور ان کی غریب محبوباؤں کا اور چھوٹی چھوٹی دکانوں کا اور روزمرہ زندگی کی جدوجہد کا اٹلی تھا۔ جس اٹلی کے بارے میں اُس کا اعلیٰ تعلیم یافتہ میزبان بات کر رہا تھا۔ اُس کا ذکر بین الاقوامی سطح پر چھپنے والے درجۂ اول کے جریدوں اور مضامین میں ہوتا ہے جو فقط دولت مند غیر ملکیوں کے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ حسبِ توقع تاروین کے سوالوں کے جواب میں انٹونیو نے مضحکہ خیز حد تک لاعلمی اور حماقت کی باتیں کی تھیں۔ اور ماریا تمام وقت اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

''تمہیں اس میں کیا نظر آتا ہے؟'' انٹونیو کے جانے کے بعد تاروین نے ماریا سے پوچھا۔ ''مجھے تو یہ بازاری سالڑ کا معلوم ہوا'' ۔

ماریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر تاروین نے حسبِ عادت انتہائی میکانکی انداز میں اپنے چہرے پر پیار کا نقاب چڑھالیا۔ ''بستر پر چلو۔ میری جان...... اور

ماریا مٹھیاں بھینچ کر اُس کے پیچھے چلنے لگی۔
جب تاروین کروٹ بدل کر سو گیا تو ماریا کے ذہن میں اُس کی شادی شدہ زندگی کی تمام بے حاصل اور لایعنیت گھوم گئی۔ کچھ دیر میں اُس نے اپنی کنپٹیوں کو دھڑکتے محسوس کیا۔ بالآخر نیند اُس کی نجات دہندہ بن کر آئی۔
''برجانیو دنیا کے عظیم ترین ماہرینِ آثارِ قدیمہ میں سے ایک ہے۔ اپنے میدان میں اُسے سند تسلیم کیا جاتا ہے''۔
''مگر مجھے اس کی باتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اُس کی کرخت آواز۔ اور اس کی داڑھی۔ اور ہونٹوں کے کناروں پر جما تھوک اور دوسروں کی بات تو وہ سنتا ہی نہیں۔ بولے چلے جاتا ہے۔ اور اُس کی بیوی خدایا' کس قدر عجیب جوڑا ہے''۔
''بعض اوقات تم بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے علمی حلقوں میں اس کی کیا حیثیت ہے؟''
''زبردست حیثیت ہوگی۔ مگر میرا تو اُس کی صحبت میں دم گھٹتا ہے''۔
تاروین اٹلی کے مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ برجانیو سے ملنے جا رہا تھا' اور صبح سے اصرار کر رہا تھا کہ ماریا کو اُس کے ساتھ چلنا چاہیے۔ لیکن ماریا اپنا دن برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔
بالآخر تاروین کو ماریا کی ضد سے ہار کر تنہا ہی روانہ ہونا پڑا۔ اُس نے تمام دن بارجانیو سے قدیم بادشاہ لومبارڈ کے ذاتی استعمال میں آنے والی اشیاء پر سیر حاصل گفتگو کی' اور ایک ''مفید'' دن کے اختتام پر وہ رخصتی کی اجازت طلب کرنے ہی والا تھا کہ اچانک گفتگو کا رخ شہر کے مضافات میں آرام کی غرض سے مقیم اُس کی بیوی کی جانب ہو گیا۔
''اُسے یہاں اچھی صحبت مل گئی ہے'' بارجانیو کی بیوی کے لہجے میں طنز عیاں تھا۔
''ہاں' وہ لڑکا۔ رات مجھے ملا تھا۔ نام یاد نہیں رہا۔ وہ......''
''انٹونیو''
''ہاں۔ انٹونیو۔ وہ بھی فارغ ہے' اور ماریا کے لیے بھی سیر و تفریح اور چہل قدمی وغیرہ مفید ہیں''۔
''مگر انٹونیو کی فراغت......''
''کیا مطلب؟''
''میرا مطلب ہے کہ ماریا اس لیے فارغ ہے کہ اُس کے پاس سب کچھ ہے اور...... انٹونیو کی

فراغت واقعی فراغت ہے''۔ یہ کہہ کر مسز بارجانیو یوں مسکرائی تھی کہ تاروین پر یکدم بہت کچھ منکشف ہوا تھا۔
جب تاروین گھر پہنچا تو ماریا اور انٹونیو صوفوں پر نئے غلاف چڑھا رہے تھے۔
''آہستہ! آہستہ! انٹونیو۔ ذرا سا زور پڑا اور سلوٹ آئی۔'' ماریا گرم جوشی سے ہدایات دے رہی تھی۔ تاروین پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے سے سایہ گزر گیا۔ مگر اُس نے فوراً خود پر قابو پایا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ذرا دیکھو تاروین یہ...... یہ صوفہ اور یہ غلاف۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی موٹی عورت کو تنگ لباس پہنایا جائے۔ عجیب مزاحیہ صورتِ حال ہے۔''
لیکن تاروین سنجیدگی کی تصویر بنا خاموش کھڑا رہا۔ اُسے انٹونیو اور ماریا کا باہم ہنسنا اور اونچی آواز میں بولنا ناگوار گزر رہا تھا۔ ''تمہارے ہاتھ خوب خزانہ لگا ہے''۔ اُس نے انٹونیو کو خشم گیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔ ''تمہیں اور کیا چاہیے''۔
''ان غلافوں کا کپڑا بہت مختلف ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' ماریا چاہتی تھی کہ تاروین کچھ بولے۔ اسے تاروین کی خاموشی بے چین کر رہی تھی۔ مگر وہ خاموش رہا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔
''......اور انٹونیو نے میری اتنی مدد کی ہے۔''
''ضرور کی ہوگی''۔ تاروین کا طنز ماریا کو گھائل کر گیا۔
''دوستوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام آئیں۔'' انٹونیو نے خوش دلی سے کہا۔ وہ تاروین کے لہجے کی کاٹ محسوس نہیں کر سکا تھا۔
انٹونیو کے جاتے ہی ماریا نوکروں کی پروا کیے بغیر تاروین پر برس پڑی۔ اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے ''تم میرے مہمانوں کی بے عزتی کرنے والے کون ہوتے ہو؟'' اُس نے جذبات سے بھرتی ہوئی آواز میں کہا۔
''میں اُس آوارہ گرد سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔'' تاروین کے چہرے سے تمام نقاب اُتر گئے۔ اُس کی آنکھیں نفرت سے سکڑ گئی تھیں۔ ''میں اس طرح کی مکروہ شخصیت کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تمہاری نادانی کا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ تم اُسے کب تک پالو گی؟
''انٹونیو کو مجھ سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ اور مجھے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ تم اپنی تحقیق سے کام رکھو جناب ماہرِ سرطان...... تمھیں کچھ نہیں معلوم''

"لیکن لوگوں کو تو معلوم ہے......" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"اوہ" ماریہ کی نظروں میں بار جانئو اور اس کی بیوی کا چہرہ گھوم گیا اور وہ مزید بھر گئی۔ "......وہ منحوس ......تم ان کے کہنے میں آ گئے۔ دراصل تم خود نہایت احمق ہو۔ تم پھوڑوں، پھنسیوں پر ہی غور کرتے رہو تو بہتر ہے۔ پھوڑوں پر اور اُس اپنے سڑے ہوئے گوئٹے کی کتابوں پر......اُس کی سانس پھول گئی۔ مگر وہ خاموش نہیں ہوئی۔ "......تم نے تو مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا۔ تیروں یا ڈوب جاؤں۔ اور جب کوئی ہمدرد اور شریف آدمی میری مدد کو آ گیا، جس سے میں ہنس بول کر وقت گزار سکتی ہوں تو تم اُس کی بے عزتی پر اُتر آئے۔ تمہیں تو اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ میرے اس سے ایسے تعلقات نہیں ہیں کہ تم......"
"یہ میں نے نہیں کہا" تاروین نے دوبارہ تحقیقی ادارے کے سربراہ کا نقاب اوڑھ لیا تھا، اور اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ "میں بس یہ نہیں چاہتا کہ دوستی کی آڑ میں کوئی دھوکے باز تم تک پہنچ جائے......بظاہر شریف اور ہمدرد مگر حقیقت میں گندگی کا کیڑا"۔
"تاروین!"
"سنو۔ تم دنیا کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتیں" اُس نے آہستہ آہستہ مگر واضح انداز میں کہنا شروع کیا۔ "گندگی کے کیڑے جسمانی تعلقات میں دلچسپی نہیں لیتے......وہ اب تک تم سے کیا کچھ بٹور چکا ہے؟"
ماریا کے منہ سے ایک غیر انسانی آواز نکلی۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ کر پاؤں پٹخا، اور اسی آواز کی گونج میں کمرے سے باہر چلی گئی۔
انٹونیو سڑک پار کرنے والا تھا کہ پیلے رنگ کی ایک بڑی کار نے زور زور سے ہارن بجا کر اُس کی توجہ مبذول کر لی۔
"ماریا؟" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔
"بیٹھو" ماریا نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے تیزی سے کہا
"لیکن اس وقت ہم کہاں جائیں گے؟"
"کہیں بھی۔ چلو پہاڑوں کی طرف چلتے ہیں"
شام کے وقت جب تاروین سو کر اٹھا تو اُسے خادمہ نے بتایا کہ ماریا اُس سے گفتگو کے فوراً بعد گھر سے نکل گئی تھی۔ اسے ماریا پر ترس آیا۔ "مجھے اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ بہت

حساس ہے''۔اس کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا کہ وہ اُسے منانے کے لیے کیا کرے گا۔''میں اُسے نرم الفاظ میں سمجھاؤں گا کہ میں اُس کا خیر خواہ ہوں۔وہ بہر حال معصوم ہے اور بُرے دوستوں کی صحبت نا تجربہ کار لوگوں کو بہت نقصان پہنچا سکتی ہے''۔
مگر جب ماریا رات تک واپس نہیں آئی تو تاروین کا مزاج پھر برہم ہو گیا۔''جہنم میں جاؤ''۔وہ بڑبڑایا''میں بھی، بہت مضبوط آدمی ہوں۔''
پہاڑوں میں غروب آفتاب کا منظر نا قابلِ بیان حد تک دلکش تھا۔چوٹیوں کے مغربی کنارے دھوپ پڑنے سے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔جبکہ اُن کی پچھلی سمت طویل سائے پھیلے تھے۔ وہ دونوں خاموشی سے سورج کو آخری نقطے تک غروب ہوتے دیکھتے رہے۔
''انٹونیو، مجھے پیار کرو' جونہی سورج کی سرخ ٹکیہ کی آخری قوس زمین کی تہہ میں اتری ماریا نے خود کو کہتے سنا۔
انٹونیو کا بدن چٹان کی طرح مضبوط تھا۔وہ اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کر سکتی تھی۔دھک۔ دھک۔دھک یوں لگتا تھا جیسے اُس کا دل اُس کے بدن سے الگ کوئی چیز ہے جس پر انٹونیو کا کوئی اختیار نہیں ہے۔
''مجھے پیار کرو۔انٹونیو مجھے پیار کرو''۔وہ اس کے بازوؤں میں کسمسائی۔اُس لمحے وہ ہوا میں تحلیل ہونا چاہتی تھی۔بکھر کر زمین میں جذب ہونا چاہتی تھی۔
واپسی پر انہوں نے لکڑی کے بنے ہوئے ایک خوبصورت پہاڑی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ہوٹل سے روانگی کے وقت تک مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ماریا نے کار چلانی شروع کی تو انٹونیو نے جھک کر اُس کی گردن کے تل پر بوسہ دیا۔
''آرام سے بیٹھو''۔اُس نے ہنستے ہوئے کہا''میں گاڑی کسی گڑھے میں گرا دوں گی''۔
مگر انٹونیو سنجیدہ ہو چکا تھا۔''ماریا'' اُس نے سرگوشی کی۔''ماریا۔ماریا ماریا'' اُس کی آواز میں حسرت تھی، درد تھا''گاڑی روک دو ماریا ہمیں درختوں میں کوئی نہیں دیکھ سکتا''۔
انٹونیو کی آواز میں ابھرنے والی التجا نے بالآخر ماریا کو کار روکنے پر مجبور کر دیا۔دونوں کار سے اتر کر سڑک کے کنارے گھنے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔تہہ در تہہ اندھیرے میں فقط پتوں کی سرسراہٹ سنی جا سکتی تھی۔
ماریا گھر پہنچی تو تاروین سوچ چکا تھا۔اُس نے کمرے کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر لباس

اتارنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد وہ خود کو مکمل برہنگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی بدن تھا جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی، لیکن ایک لحاظ سے اب یہ ایک نیا بدن تھا۔ اس جسم کو آج نئے زاویے سے ڈھالا گیا تھا۔ چہرے کے نقوش تبدیل کر دیے گئے تھے۔ وہ دوسری بار پیدا ہوئی تھی۔

صبح کے وقت تارویَن نے نہایت خاموشی سے اپنا سامانِ سفر باندھا اور ماریا کو الوداع کہے بغیر روم میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں نامیاتی مادے پر نمو پذیر زہریلے عناصر پر اپنا تحقیقی مقالہ پڑھنے روانہ ہو گیا۔

''اِسے سبق سکھانے کے لیے یہی کافی ہے''۔ اُس نے زیرِ لب کہا، اور دھیرے سے کمرے کا دروازہ بند کر کے روانہ ہو گیا۔

''خدا کا شکر ہے!'' آنکھ کھلنے پر تارویَن کو بستر پر موجود نہ پا کر ماریا نے بے اختیار کہا۔ پھر اسے تارویَن کی حالت پر ترس آیا۔ ''مردہ مینڈک کی طرح'' ۔ اُسے خیال آیا ''ٹانگیں ہلاتا'' مگر زندگی سے نا آشنا۔ بے چارہ''۔ اس لمحے وہ اتنی خوش تھی کہ تارویَن اس کی نظر میں واقعی قابلِ رحم ہو گیا تھا، اور ایک لحاظ سے وہ تارویَن کی شکر گزار بھی تھی۔ اگر وہ اس قدر بدتہذیبی کا مظاہرہ نہ کرتا تو اُس کے اور انٹونیو کے تعلقات ہمیشہ سطحی اور سرسری رہتے۔ اور نتیجتاً وہ یوں مسرت سے لبریز نہ ہونے پاتی۔

زندگی ایک خوش گوار دن کے بعد دوسرے خوش گوار دن کا نام تھی۔ مگر اب عمر کا سفر ہموار سطح پر بہنے والے دریا جیسا نہیں تھا۔ اب اس میں وقفے وقفے سے جان لیوا گہرائیاں، تیکھے موڑ اور لرزہ خیز اندھیرے آنے لگے تھے۔ دوستی اب فقط ایسا کھیل نہیں تھی جو روشن دنوں میں من مانے اصولوں کے تحت اپنی مرضی کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اور اس میں ہار جیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔

انٹونیو اب ماریا کی زندگی کا محور تھا۔ اُس کے احساسات اور جذبات کا مرکزی نقطہ تھا۔ انٹونیو کا خوبصورت چہرہ۔ اُس کے چمکدار سفید دانت۔ اُس کے مضبوط ہاتھ اور بازو۔ سیاہ بالوں سے ڈھکا اس کا مردانہ سینہ۔ وہ سرتاپا انٹونیو کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ انٹونیو کی اطاعت گزاری سے اُسے سکون ملتا تھا۔ اس کے احکام پر عمل کرنے سے ماریا کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں انٹونیو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی۔ انہیں سنوارتی اور سنوارنے کے بعد بگاڑ دیتی۔ کچھ دیر تک ہنستی رہتی اور پھر نئے انداز سے سنوارنے لگتی۔ کبھی کبھی جب وہ اُس کے دلکش سیاہ بالوں کو کسی مضحکہ خیز انداز میں اُلجھا دیتی تو ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر انٹونیو اس کی

طبیعت میں جنون کی جھلک دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ ''تم نے تو مجھے کھلونا سمجھ لیا ہے''۔ وہ ہلکی سی جھنجھلاہٹ سے کہتا، مگر پھر فوراً ہی مسکرانے لگتا۔ اس کے باوجود ماریا سہم جاتی۔ وہ اس کے بالوں کو ہموار کر کے اُس سے معافی مانگتی۔ اُسے چومتی۔ پھر معافی مانگتی۔ پھر چومتی۔

ضمیر کے بوجھ کی طرح، انٹونیو اپنی غیر موجودگی میں بھی ماریا کے ساتھ رہتا تھا۔ ماریا کی تنہائی اُس کی سوچوں کے سہارے کٹتی تھی۔ بعض اوقات وہ ماریا کو اتنا یاد آنے لگتا کہ وہ وقت بے وقت اُسے ملنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی۔ انٹونیو اسے بغیر پیشگی اطلاع کے اپنے ہوسٹل میں آنے سے کئی بار منع کر چکا تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ وہ اس سے ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں کرتی۔ اور جب انٹونیو تھک کر ٹیلی فون بند کر دیتا تو وہ کمرے میں ٹہلنے لگتی، اور پھر یکلخت کار کی چابیاں اٹھاتی اور سڑکوں پر نکل کھڑی ہوتی، اور پھر اُسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اُس کا رُخ انٹونیو کے ہوسٹل کی جانب ہو گیا ہے۔ ایک بار ہوسٹل کے چوکیدار نے آدھی رات کے وقت انٹونیو کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا ''کوئی عورت ہے'' چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں نے بتایا بھی کہ آپ ابھی ابھی سوئے ہیں، مگر مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے، بہت ضروری کام ہے۔ بڑی سی گاڑی میں آئی ہے۔''

انٹونیو لباس کی شکنیں درست کرتا، جمائیاں لیتا، باہر آیا تو وہ کار کے اندر ہی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

''......لیکن میں کیا کروں۔ کیا کروں۔ تم اچانک بہت یاد آنے لگتے ہو'' اُس نے انٹونیو کی تمام دُرشت باتیں سننے کے بعد گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

''تم تو پاگل ہو گئی ہو''۔ انٹونیو اب اُس سے بات کرتے ہوئے ایسے الفاظ بے تکلفی سے استعمال کرتا تھا۔ وہ نم ہوتی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہی'' تم نہیں سمجھتے، انٹونیو، تم نہیں سمجھ سکتے'' اُس نے بکھرتی ہوئی آواز میں کہا اور آنسو ٹپکنے سے پہلے گاڑی چلا دی۔

''نرم ہے یا گرم ہے؟'' برٹو نے صبح کے وقت ناشتے کی میز پر بیٹھے انٹونیو کو آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔ رات کا واقعہ ہوسٹل کے تمام مکینوں تک پہنچ چکا تھا۔

''گرم ہے'' انٹونیو نے سینہ پھلا کر کہا۔

''شمالی ملکوں کی بیگمات عام طور پر ٹھنڈی ہوتی ہیں''۔

اس کے بعد دونوں دوست پیشہ ورانہ انداز میں مختلف علاقوں کی عورتوں کے درجۂ حرارت کی کمی

بیشی پر انوکھے زاویوں سے گفتگو کرتے رہے۔
انٹونیو کے لئے جسمانی محبت نئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس سے قبل متعدد لڑکیوں سے ہم بستری کر چکا تھا۔ لیکن ماریا کے لیے یہ بہت غیر متوقع لذت تھی۔ اُسے پہلی بار مکمل سپردگی کا تجربہ ہوا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کسی کے ہاتھوں میں پگھل جانا روح کو اتنا سیراب کر سکتا ہے...... لیکن جو چیز ماریا کی محبت میں اضافے کا باعث ہوئی تھی' وہی انٹونیو کے لیے بے زاری کا سبب بن رہی تھی۔ ایک ماہ قبل تک ماریا اُس کے لیے افق پر نظر آنے والی قوسِ قزح کی طرح تھی جسے ہاتھ لگانا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن اب وہ انٹونیو کی جانی پہچانی چیز تھی۔ جسمانی طور پر اُس کے حوالے ہونے کے بعد وہ از خود انٹونیو کی تمام سابقہ محبوباؤں کی سطح پر آ گئی تھی۔ انٹونیو کی فتوحات کی مجموعی تعداد میں ایک عدد کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس سے زیادہ کی اُسے کوئی خواہش نہیں تھی۔
رفتہ رفتہ انٹونیو کا رویہ بدلنے لگا تھا۔ وہ اس تصویر کی طرح دُھندلانے لگی تھی جسے بہت نزدیک سے دیکھا جاتا ہے۔ منظر کی دلکشی قائم رکھنے کے لیے جس فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود بخود معدوم ہو گیا تھا۔ اب جب وہ ماریا سے ملنے جاتا تو اُس کے جملوں میں پہلے جیسی گرم جوشی اور آداب میں اتنا انکسار نہیں ہوتا تھا ''کیا حال ہے؟'' وہ انتہائی غیر رومانی انداز میں کہتا اور اُس کی پیٹھ یوں تھپتھپاتا جیسے اپنے پالتو جانور کو سہلا رہا ہو۔ اب وہ اس کے گھریلو کاموں میں بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا' بلکہ بعض اوقات وہ اپنے ذاتی کام بھی ماریا کے حوالے کر دیتا تھا۔ ماریا کو اُس کے کام آنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا وہ ہر حال میں اُسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ انٹونیو کو اب اُس کا بے حد و حساب عشق فقط اس وقت قابلِ برداشت لگتا تھا جب وہ اُسے کوئی تحفہ دیتی تھی...... اور تحفوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ''مگر تمھیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی''۔ وہ تحفہ وصول کرتے ہوئے ہر مرتبہ سطحی انداز میں یہی الفاظ دہراتا تھا۔ لیکن تحفوں کے حصول کے باوجود انٹونیو کا دل بھرتا جا رہا تھا۔ اُس کی توجہ میں کمی پا کر ماریا ہر مرتبہ زیادہ قیمتی تحفہ لاتی۔ جس دن اُس نے انٹونیو کو قیمتی نگینوں سے سجی سونے کی زنجیر لا کر دی وہ سیدھا برٹو کے پاس پہنچا۔
''یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے''۔ اُس نے زنجیر واپس جیب میں ڈالتے ہوئے تکبر سے کہا ''مگر وہ چاہتی ہے کہ میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے اور بھی سو کام ہیں''۔
''عورتیں'' برٹو کے لہجے میں تجربہ کار کھلاڑی کا اعتماد تھا۔ ''اُسی سے پیار کرتی ہیں جو انہیں وقتاً فوقتاً

دیوار سے لگا دے سمجھے؟

انٹونیو نے کاروباری مصروفیات اور تعلیم کا بہانہ کر کے رفتہ رفتہ ماریا کے گھر جانا کم کر دیا۔ پریشان ہو کر ماریا اُسے ہر ملاقات پر ایک تحفہ دینے لگی۔ وہ اُس کے بلانے پر جاتا' تحفہ وصول کرتے ہوئے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتا اور اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے بارے میں مخصوص جملے دہراتا فوراً لوٹ آتا۔

"مجھے اپنا مستقبل بنانا ہے" ایک دن انٹونیو نے اُکتا کر کہہ ہی دیا "خود کو بنانے یا بگاڑنے کے لیے میرے پاس یہی وقت ہے۔ ظاہر ہے کہ دن رات تمہاری صحبت میں رہنے سے میرا بہت نقصان ہو سکتا ہے"۔

ماریا کے جی میں آیا کہ وہ اُسے بتا دے کہ اُس کی موجودگی میں انٹونیو کو اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اُس کے ذاتی اخراجات تمام عمر باسانی برداشت کر سکتی ہے۔ مگر اچانک اُسے اپنے خاوند کے الفاظ یاد آئے اور وہ خاموش رہی۔

"مگر تم آج کی شام تو میرے ساتھ گزار سکتے ہو؟" اُس نے لمحے بھر کے توقف سے کہا۔ "ممکن ہوتا تو میں ضرور ٹھہر جاتا" انٹونیو پر اُس کے ملتجیانہ لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"مگر مجھے ضروری کام ہے۔ میرا بہت نقصان ہو جائے گا" ماریا اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے ہاتھ خود بخود انٹونیو کے شانوں سے پھسل گئے۔ اُس نے آنسو چھپانے کے لیے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ انٹونیو کی آنکھوں میں نظر آنے والی بیزاری کی جھلک اُس کا وجود چھلنی کر گئی تھی۔

چاروں سمت بہار کی شدت نمایاں تھی۔ مگر بے داغ نیلے آسمان کی چمکدار دھوپ ماریا کی روح کے اندھیروں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اُس کے شب و روز میں جان لیوا تنہائی سرایت کر گئی تھی۔ اُس کے اعصاب ایک بار پھر سرکش اور بے قابو ہو گئے تھے۔ وہ اچانک بلاوجہ قہقہے لگانے لگتی یا چادر میں منہ لپیٹ کر گھنٹوں روتی رہتی۔ انٹونیو نے اُس کی وحشت سے گھبرا کر اُس کے گھر آنا مزید کم کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ بے خوابی اور ذہنی انتشار کی شدت اُس کی جسمانی حالت پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اب وہ کبھی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی تو ایک لمحے کے لیے اُس کے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی' اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ وہ صبح سے شام تک سر درد کی گولیاں کھاتی رہتی۔ اُس کی بھوک ختم ہو گئی تھی اور آنکھوں تلے گہرے سیاہ حلقے نمودار ہو رہے تھے۔ جس رفتار سے اُس کا چہرہ

سکڑ رہا تھا' اُسی رفتار سے اُس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ اُسے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ وہ تیزی سے بوڑھی ہو رہی تھی۔ بدصورت ہو رہی تھی۔ اُس کی سانسوں سے کمرے میں تعفن پھیل جاتا تھا۔ وہ کسی کی توجہ کے قابل نہیں رہی تھی۔

میرا تو اب اُس کی صحبت میں دم گھٹنے لگا ہے'' انٹونیو واپسی پر کہتا۔

''اب تمہیں اس سے کنارہ کشی کر لینی چاہیے'' برٹو کے تجربے کے مطابق کہانی کو اس موڑ پر ختم کر دینا بہتر تھا۔ مگر انٹونیو اپنے لہجے میں بے چارگی بھرتے ہوئے بتاتا کہ اُسے ماریا پر رحم آتا ہے۔

''جس دن میں نے دوٹوک انکار کر دیا وہ بستر سے نہیں اُٹھ سکے گی''۔ یہ کہتے ہوئے اس کا سینہ فخر سے پھول جاتا تھا۔ درحقیقت وہ تمام ترنا گواری کے باوجود تحائف سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ایک دن اُس کے پرانے دوست کارلو نے اسے شہر آنے والی اپنی رشتے دار لڑکی لوئزا سے متعارف کرایا۔ لوئزا کی عمر سترہ سال تھی اور اُس کے چہرے پر نوعمری کی تازگی اور آنکھوں میں شوخی کی چمک تھی۔ اس کے نوجوان صحت مند بدن کے نشیب و فراز راہ گیروں کے قدم روک لیتے تھے۔ اس دن کے بعد سے انٹونیو کی مصروفیات میں اچانک بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور ماریا کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ قیدِ تنہائی کو دنیا کی سب سے بڑی سزا کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن پھر اچانک انٹونیو کے رویے میں دوبارہ ایک تبدیلی آئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ماریا سے پُرخلوص تکلفات برتنے لگا۔ اُس کے لہجے میں پرانا پیار اور ادب لوٹ آیا۔ اب وہ ماریا کے رونے پر کندھے اُچکا کر لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ بلکہ پہلے کی طرح اُسے سینے سے لگا کر اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا۔ اُس کے درد میں شریک ہوتا تھا۔ اُسے آنے والے اچھے دنوں کا یقین دلاتا تھا۔

''پیارے بیٹے!'' انٹونیو کے باپ نے لکھا تھا۔ ''میں نے کبھی تقدیر کا گلہ نہیں کیا۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا باپ ایک بہادر آدمی ہے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے مگر بعض اوقات زندگی میں ایسی غیر متوقع تبدیلیاں آتی ہیں کہ بڑے سے بڑا جی دار شخص بھی بکھر کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے خاندان کی بھلائی چاہی تھی مگر ہوا یہ کہ......'' اس طویل اور دردناک خط کا لب لباب یہ تھا کہ انٹونیو کا باپ ایک نہایت غیر موزوں جگہ پر سرمایہ کاری کر بیٹھا تھا جس کے نتیجے میں وہ سودخوروں کے چنگل میں پھنس گیا تھا' اور اب اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو اسے اپنی جائیداد نیلام ہونے سے بچانے کے لیے اتنی بڑی رقم کی ضرورت تھی کہ اپنی تمام جمع پونجی ملا کر بھی

مطلوبہ رقم سے پچاس ہزار فرینک کم پڑتے تھے''...... کیا تم نے اب تک شہر میں اتنے تعلقات بنالیے ہیں کہ پچاس ہزار فرینک کا انتظام کرسکو؟ اگر ایسا نہ ہوا تو ہمارے خاندان کی آمدنی کا واحد ذریعہ ''رٹز ہوٹل نیلام ہوجائے گا۔ ہم برباد ہوجائیں گے۔''

''کس قدر سہانی رات ہے'' ماریہ نے تقریباً جھومتے ہوئے کہا۔ انٹونیو نے آج کمال مہربانی سے اس کے ساتھ صبح تک ٹھہرنا قبول کرلیا تھا' اور اسے ہر چیز پر پیار آ رہا تھا۔ موسم گرما کی اس رات آسمان اتنا صاف تھا کہ پورا ماحول تاروں کی روشنی سے لبریز تھا۔ کہکشاں اس قدر نزدیک نظر آ رہی تھی کہ لگتا تھا اُسے ہاتھ بڑھا کر چھوا جاسکتا ہے۔ آس پاس کی جھاڑیاں بے نام خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اور اُن میں ان گنت جگنو جلتے بجھتے نظر آ رہے تھے۔ ماریا چلتے چلتے کوئی جگنو ہاتھ میں پکڑلیتی اور وقفے وقفے سے مٹھی کو آنکھوں سے لگا کر اُسے دیکھتی اور بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستی۔ وہ بہت خوش تھی۔

''بات یہ ہے ماریا۔ میری جان کہ......'' اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا' مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ اُسے خیال آیا کہ آج اپنا مُدعا بیان کرنا جلد بازی ہوگی۔ ''مزید ایک دو دن ایسے ہی خوش کن گزرے۔'' اس نے سوچا ''تو اس کی جانب سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' انٹونیو کا اندازہ درست تھا۔ دو دن بعد سوال کرنے پر اُس نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اُسے پوری رقم دے دی تھی۔ انٹونیو کو محسوس ہوا کہ اس نے بلاوجہ اتنے دن ضائع کردیے تھے۔ ماریا نے پچاس ہزار فرینک کا چیک یوں کاٹا تھا جیسے اسے انٹونیو کی ضرورت پوری کرنے پر دلی مسرت حاصل ہوئی ہو۔ چیک لیتے ہوئے انٹونیو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اور یہ مصنوعی آنسو نہیں تھے وہ واقعی متاثر ہوگیا تھا ماریا بہت ہمدرد اور بڑے دل کی عورت تھی۔ ''تم نے میرے خاندان کی عزت رکھ لی ہے'' انٹونیو نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ''میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم فرشتہ ہو، فرشتہ۔ میں خود کو تمہاری دوستی کے قابل نہیں سمجھتا''۔ وہ باقاعدہ رونے لگا۔ اسے اپنے سابقہ رویے پر شرم آ رہی تھی۔ ماریا اُس کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں چومنے لگی۔ ''کوئی بات نہیں'' اُس نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ بہت معمولی بات ہے' اور یہ کہتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ تارو ین نے انٹونیو کے بارے میں کتنا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ''چلو کل سفید پھولوں والی وادی میں چلتے ہیں''۔ ماریا کو روشن دنوں میں طویل راستوں پر کار چلانا اچھا لگتا تھا۔ ہر چند کہ انٹونیو پہلے ہی لوئزا اور اُس کے بھائی کے ساتھ میلے میں جانے کا وعدہ کرچکا تھا' مگر اُس

لمحے اسے ماریا پر اتنا پیار آ رہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ ماریا کے ساتھ تو وہ کسی دن بھی سفید وادی کی سیر کو جا سکتا تھا۔ لیکن لوئزا سے اس طرح کی ملاقات کا امکان بہت کوششوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے ماتھے پر گہری سوچ کی شکنیں ڈالیں او راپنی آواز میں پچھتاوا ابھرتے ہوئے خود کو کوسنے کے انداز میں کہا۔ ''میں بھی کتنا احمق ہوں۔ بھول ہی گیا۔ کل تو ہمارے ہوٹل کا منیجر شہر آ رہا ہے''۔

''مگر تمہارا اُس سے ملنا کیا ضروری ہے''

''کاش ضروری نہ ہوتا۔ مگر میں ہی تو اُسے یہاں کی صورتِ حال سمجھاؤں گا''۔

دوسرے دن ماریا گہری اُداسی اور تنہائی کا شکار تھی۔ اُسے گھر کے در و دیوار سے وحشت ہو رہی تھی۔ دوپہر کے وقت وہ اپنی بڑھتی ہوئی بے کیفی سے نجات حاصل کرنے کے لیے گاڑی نکال کر بلا مقصد سڑکوں پر گھومنے لگی بعض اوقات تازہ ہوا میں سانس لینے اور کھلے مناظر کی سیر سے اُس کی طبیعت سنبھل جاتی تھی۔ دیر تک گاڑی چلانے کے بعد اُسے تھکن محسوس ہوئی تو وہ واپس شہر کی طرف پلٹی۔ ایک شاہ راہ کے کنارے کھلے میدان میں نمائش لگی تھی۔ ماریا کو میلوں ٹھیلوں سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مگر اس وقت اُسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے گاڑی روکی اور میلے کے ایک ریستوران میں داخل ہو کر چائے منگوائی اور شیشے کے دوسری طرف نظر آنے والی نمائش کی گہما گہمی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ ریستوران کے سامنے ایک گول جھولا جس سے لکڑی کے گھوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔ دوسری جانب اسی طرح کی اور بھی طرح طرح کی تفریح کی چیزیں تھیں۔ اچانک ماریا کو ایک ایسا منظر نظر آیا کہ چائے کا گھونٹ اُس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ اس طرح کھانسی کہ اُس کی ناک بہنے لگی۔ اُس نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور یہ سوچ کر اُس جانب دوبارہ دیکھا کہ اُس کی نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر پہلی مرتبہ جو کچھ اُسے ایک لمحے کے لیے نظر آیا تھا۔ اب وہ ایک خوفناک حقیقت بن کر بار بار اُس کے سامنے آنے لگے۔ گھومنے والے جھولے کے ایک گھوڑے پر انٹونیو ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ سوار تھا۔ وہ اچھل رہا تھا' قہقہے لگا رہا تھا اور لڑکی سے مسلسل باتیں کر رہا تھا۔

لکڑی کا گھوڑا سامنے آتا۔ گھوم کر پیچھے چلا جاتا اور چند لمحوں بعد دوبارہ سامنے آ جاتا گلابی لباس میں ملبوس تر و تازہ چہرے والی نوخیز لڑکی اپنی دلکش گردن پیچھے کی جانب موڑ کر انٹونیو کی باتیں سن رہی تھی اور مستقل مسکرا رہی تھی۔ لڑکی کا چہرہ بے پناہ خوبصورت اور صحت قابلِ رشک تھی۔ ماریا نے

دیکھا کہ انٹونیو نے باتوں کے دوران اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور وہ ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔
گھوڑا ایک بار پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ چاہتی تو وہاں سے اُٹھ کر جاسکتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اُس کے وجود کی گہرائیوں سے خواہش ابھری کے اسے وہیں ٹھہرنا چاہیے اور مزید اذیت اور ذلت برداشت کرنی چاہیے۔ وہ شاید تا ابد وہیں بیٹھی رہتی مگر اس مرتبہ جب لکڑی کا گھوڑا طلوع ہوا تو انٹونیو نے اُسے شیشے کے پار بیٹھے دیکھ لیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور انٹونیو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُس کا جسم اس طرح لرزہ کہ اُسے گھوڑے پر اپنی گرفت دوبارہ مضبوط کرنی پڑی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

''چیک بذریعہ ڈاک بھیجا گیا ہے۔ اُس کے پاس وقت ہے۔ وہ اب بھی ادائیگی رکوا سکتی ہے'' انٹونیو کو خیال آیا۔

''تم اتنے خاموش کیوں ہوگئے ہو؟'' واپسی پر لوئزا نے انٹونیو سے پوچھا۔

''کیا؟ ہاں، بس ایسے ہی'' انٹونیو نے غائب دماغی سے جواب دیا۔ ''میں تھک گیا ہوں''۔

ساڑھے چھ بجے شام وہ اپنی موٹر سائیکل ماریا کے گیراج کے سامنے کھڑی کر رہا تھا۔ اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔

ماریا واپس آنے کے بعد کپڑے تبدیل کیے بغیر جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گئی تھی، اور اب تک اس نے کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ انٹونیو نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے چہرے پر ایسا تاثر طاری کیا جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

''یہ بستر پر جانے کا وقت تو نہیں ہے۔'' انٹونیو نے اپنے لہجے میں ممکنہ حد تک حیرت اور ہمدردی پیدا کی۔ ''کیا سر میں درد ہوگیا ہے؟''

گہری اور معنی خیز خاموشی میں انٹونیو کو خود اپنے الفاظ انتہائی کھوکھلے اور بناوٹی لگے۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا۔ ماریا بے حس وحرکت لیٹی رہی۔ ''کیا بات ہے۔ میری جان۔ کچھ تو بولو۔ پتہ تو چلے، ہوا کیا۔'' اُس نے دایاں ہاتھ ماریا کے گھٹنے پر رکھ کر کہا ''میرا میلے میں جانا برا لگا۔ بس اتنی سی بات ہے؟'' ...... وہ خاموش رہی۔ ماریا کی خاموشی انٹونیو کے لیے اُس چیخ پکار سے زیادہ تکلیف دہ تھی جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ ''تم پوری بات سن لوگی تو تمہاری ناراضی ختم ہوجائے گی''۔ اُس نے اپنی آواز میں مقدور بھر شیرینی اور اعتماد بھر کر کہا۔ ''ہمارے ہوٹل کا مینجر کھانے کے فوراً بعد رخصت ہوگیا تھا، اور اُسی وقت میرا پرانا دوست کارلو اپنی مہمان لڑکی کے ساتھ آگیا۔ وہ

نمائش دیکھنا چاہتی تھی مجھے معلوم تھا کہ تم اب تک گھر سے نکل چکی ہوگی۔ تمہیں گاڑی میں گھومنے کا شوق ہے۔ ورنہ تو ہم سب تمہاری گاڑی میں چلتے۔ ہمارا تو فائدہ تھا۔ تم خود سوچو"۔
"گندگی کا کیڑا۔ اب تک وہ تم سے کیا بٹور چکا ہے۔ گندگی کا کیڑا" ماریا کے ذہن میں تاروین کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "اس کا مطلب ہے انٹونیو تمام وقت فقط میری دولت کی خاطر مجھ سے ملتا رہا۔ ہمدردی اور محبت کی اداکاری کر کے مجھ سے تحفے وصول کرتا رہا۔ لالچی اور خود غرض شخص۔ گندگی کا کیڑا۔ آج اپنی اصل حالت میں نظر آ ہی گیا۔ اور وہ لڑکی۔ خدایا۔ انٹونیو کس طرح اُسے بازوؤں میں سمیٹ رہا تھا۔
"چلے جاؤ۔ وہ چیخ پڑی۔ "میرا وقت ضائع مت کرو"۔
"میری جان، تم سمجھ نہیں رہیں۔" انٹونیو نے کہا، اور اس کے گال پر پیار کرنے کے لیے جھک گیا۔
"خبردار! اچانک اس کا چہرہ فرطِ غضب سے سرخ ہوگیا۔ "بہت ہوگیا۔ شیطان کے بچے۔ آئندہ مجھے کبھی اپنی شکل مت دکھانا۔ نکل یہاں سے خبیث آدمی"۔
"ٹھیک ہے" انٹونیو کی آنکھوں میں ہلکی سی نفرت کی جھلک اُبھری۔ "تم چاہتی ہو تو میں چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ مگر خیر۔ تم یوں چاہتی ہو تو یوں ہی سہی۔ میں اب نہیں آؤں گا"۔ اس نے پاؤں پٹخا، اور بھاری قدموں سے باہر چلا گیا۔
"ممکن ہے اُس کی بات درست ہو۔" ماریا کو اچانک خیال آیا "ممکن ہے تمام واقعات بالترتیب یوں ہی پیش آئے ہوں جیسے وہ بتا رہا تھا۔ آج سے پہلے تو اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تو اب وہ اُس پر غلط بیانی کا الزام کیسے لگا سکتی ہے؟"
"انٹونیو!!" اُس نے چیخ کر کہا اور بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"انٹونیو!!" وہ دوبارہ چلائی، مگر پورے گھر پر خاموشی چھائی رہی۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی اور جست لگا کر دالان عبور کرتی، بیرونی حصے تک پہنچ گئی۔ انٹونیو اپنے موٹر سائیکل پر گیٹ سے نکل رہا تھا۔
"انٹونیو! انٹونیو!" وہ اتنی زور سے چیخی کہ اُس کے کان تک سرخ ہو گئے...... مگر انٹونیو کے موٹر سائیکل کی آواز بہت اونچی تھی...... اور کیونکہ وہ چلا گیا تھا۔ اور اُس نے جانے سے پہلے پاؤں پٹخا تھا۔ اور وہ غصے میں تھا۔ اور اُس نے کہا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ ماریا کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہا تھا اور یہ کہ اس نے انٹونیو سے زیادتی کی تھی۔ اُس پر غلط الزام لگایا تھا۔ وہ لالچی اور

خود غرض نہیں تھا۔ اُسے انٹونیو پر شدید رحم آیا۔ وہ فوراً گیراج میں گئی اور گاڑی کا دوازہ کھولنے لگی۔ ''میں اسے منالوں گی'' اُس نے خود کو کہتے سنا ''اُس سے معافی مانگ لوں گی۔ اس نے مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ میں اُسے واپس لے آؤں گی''۔

وہ جلدی میں تھی اور شدید گھبراہٹ اور پریشانی سے اُس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ باہر نکلتے ہوئے اُس کی گاڑی کتنے غلط زاویے پر گھوم گئی ہے۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ گاڑی کی پچھلی سمت کا دایاں ٹائر فرش کے ساتھ بنی ہوئی کیاری کی گیلی مٹی میں دھنس گیا ہے' اور اب ایک ہی جگہ پر گردش کر کے محض کیچڑ اچھال رہا ہے۔ اُس نے فوراً گاڑی کو آگے لے جانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اگلا ٹائر بھی کھاد میں اتر گیا۔ خادمہ' خانساماں اور مالی بھاگتے چلے آئے۔

''اسے اٹھا کر فرش پر رکھو''۔ اس نے وحشت بھری آواز میں حکم دیا۔ نوکروں نے پورا زور لگایا' لیکن کار کا وزن اُن کی مجموعی طاقت سے زیادہ تھا۔

''میں ساتھ والے بنگلے کے نوکروں کو بلاتا ہوں۔'' مالی نے رائے پیش کی۔

''نہیں'' ماریا نے بے صبری سے ہاتھ ہلایا۔ ''وقت نہیں ہے ٹیکسی لاؤ''۔

یہ کہہ کر وہ بٹوہ لینے کے لیے اپنے کمرے میں دوڑتی چلی گئی...... لیکن بٹوہ کہاں تھا؟ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ باہر غصے میں بھری واپس آئی تھی تو اس نے بٹوہ پلنگ پر پٹخا تھا' اور کپڑے تبدیل کیے بغیر جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گئی تھی۔ مگر بٹوہ پلنگ پر نہیں تھا۔ اُس نے تکیے کے نیچے دیکھا۔ لحاف اٹھا کر جھاڑا۔ ''ممکن ہے نیچے گر گیا ہو'' اُسے خیال آیا' اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پلنگ کے نیچے جھانکنے لگی۔ اُس نے فرش پر ہاتھ پھیرے۔ پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مگر بٹوہ کہیں نہیں تھا۔ اُسے وہ لمحہ اچھی طرح یاد تھا جب اُس نے بٹوہ پلنگ پر پھینک کر اپنا سر لحاف میں چھپا لیا تھا۔ تو بٹوہ کہاں گیا؟ کمرے میں تو کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ ہیں؟؟ اچانک اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اُس کی ٹانگیں لرز گئیں' اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکے گی۔

''انٹونیو؟؟ ناممکن!! لیکن کمرے میں تو فقط وہی آیا تھا'' چند لمحے گزر گئے۔ امکان کو یقین میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگی ''چور بھی؟ مگر...... ہاں...... گندگی کا کیڑا۔ تاروین کہتا تھا۔ رقم اینٹھ لے گا۔ کیا کچھ بٹور چکا ہے؟ اس سب کے علاوہ چور بھی...... گندگی کا کیڑا بھی...... بٹوے کی زنجیر سونے کی تھی' اور سامنے والے حصے پر قیمتی پتھر جڑے تھے۔ اور اس میں نوٹوں کی گدیاں تھے......

اور......اور چور‘ چور بھی...... ماریا کے ہونٹ نیلے پڑ گئے اور اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ پھر اُس کے اندر دھماکہ سا ہوا‘ اور اُس نے خود کو بکھرتے محسوس کیا۔ یا شاید وہ ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

گولی چلنے کی آواز سن کر سب دوڑتے چلے آئے۔ ماریا پلنگ پر منہ کے بل پڑی تھی۔ پورا بستر اُس کے خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کی کہ وہ مر چکی ہے۔ سوگواروں کی آمد سے پہلے اس کے جسم کو سیدھا کرنا ضروری تھا‘ اور کمرے میں زیادہ لوگوں کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اُس کے پلنگ کو ہال میں لے جانے کے لیے اٹھایا گیا تو کسی ٹھوس چیز کی فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ خادمہ نے جھک کر پلنگ کے نیچے جھانکا۔

”مادام کا بٹوہ ہے۔“ خادمہ نے کہا۔ ”غالباً پلنگ اور دیوار کے درمیان پھنس گیا تھا“۔

الڈس ہکسلے

لارڈ ہرکولیس

بالآخر 1740ء کی ایک سہانی صبح کو اس وسیع و عریض جاگیر کا وارث پیدا ہو گیا۔ اس کے نقوش دل کش اور صحت مثالی تھی۔ مگر بوقتِ پیدائش اس کا وزن فقط تین پونڈ تھا۔ بچے کا نام اُس کے مشہور و معروف نانا ہرکولیس کے نام پر ہرکولیس رکھا گیا۔ دیگر ماؤں کی طرح اس کی ماں بھی ایک ڈائری میں اس کی ماہ بہ ماہ پیش رفت قلم بند کرنے لگی۔ دس ماہ کی عمر میں اُس نے چلنا شروع کر دیا' اور دو برس مکمل ہونے سے پہلے وہ اِکا دُکا الفاظ کی ادائیگی سے اپنا مدعا بیان کرنے لگا۔ ہر چند کہ اس نے وقت پر لکھنا پڑھنا شروع کر دیا اور جلد ہی اس کی طبیعت میں موسیقی کے لیے خصوصی رجحان ظاہر ہوا مگر تیسری سال گرہ پر اُس کا وزن محض چوبیس پونڈ تھا۔ جبکہ چھٹا برس لگنے پر وہ دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ دو سال کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال دنیا میں اس کی آمد سے قبل اس کی ایک بہن اور ایک بھائی اپنی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی لقمہ اجل بن گئے تھے۔ اس لیے ہرکولیس اپنے دولت مند اور نامور والدین کی واحد اولاد کی حیثیت سے بے پناہ لاڈ پیار میں پرورش پاتا رہا۔

بارہ سال کی عمر میں ہرکولیس کا قد فقط تین فٹ چار انچ تھا۔ ہر چند کہ اس کا سر بڑا اور چہرہ خوبصورت تھا۔ لیکن شانوں سے نیچے اُس کا بدن نہایت چھوٹا تھا۔ ہرکولیس کا قد بڑھانے کے لیے اس کے والدین نے یورپ کے تمام قابلِ ذکر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور ان کی تمام ہدایات پر سختی سے عمل کیا۔ خوراک کے معاملے میں نئی نئی تدابیر اختیار کی گئیں۔ صدیوں کی آزمودہ ورزشیں کرائی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک ڈاکٹر کے مشورے پر ہرکولیس کے بازو اور ٹانگوں کو دو الگ تختوں سے باندھ کر صبح و شام آدھے گھنٹے تک کھینچا گیا کہ اس کی چیخوں نے گلی میں چلتے لوگوں کے قدم روک لیے لیکن ہرکولیس کی جسمانی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے قد میں قطعی اضافہ نہیں ہوا۔ بالآخر اس کے والدین کو یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ ان کا اکلوتا بیٹا تین فٹ چار انچ کا بونا ہے اور اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہرکولیس کا باپ جو اپنے وارث کے لیے اعلیٰ عہدوں اور دنیاوی ترقی کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس صورت حال سے اتنا مایوس ہوا کہ اب وہ ہرکولیس کی

شکل دیکھتے ہی اس پر بگڑنے لگتا۔ ''ہمارے خاندان میں آج تک کوئی عجوبہ پیدا نہیں ہوا تھا'' وہ اپنے احباب سے اکثر کہتا ''کاش میں بے اولاد ہی رہتا۔'' کچھ ہی عرصے بعد اُس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور تنہائی میں شراب نوشی شروع کر دی۔ ہرکولیس کے بالغ ہونے تک اس کا باپ کثرتِ شراب نوشی سے تقریباً مفلوج ہو چکا تھا اور پھر ایک دن اس نے دماغ کی شریان پھٹ جانے سے دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ اس حادثے کے بعد ہرکولیس کی ماں بھی جو اپنے بیٹے کی حالت پر تنہائی میں روتی رہتی تھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی۔

اکیس سال کی عمر میں ہرکولیس ایک عالی شان حویلی اور اس سے ملحقہ تاحدِ نظر پھیلی زرخیز زمینوں کے ساتھ دُنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بچپن کی ذہانت اور خوبصورتی نوجوانی میں بھی قائم تھی۔ اگر اس کا قد مضحکہ خیز حد تک چھوٹا نہ ہوتا تو اس کا شمار اپنے زمانے کے مشہور لارڈز میں ہوتا۔ وہ یونانی اور لاطینی زبانوں کی مشہور کتابوں کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی کے جدید ادب سے بھی گہری آشنائی رکھتا تھا۔ موسیقی کے میدان میں اس کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ وائلن پر مسحور کن دھنیں بجاتا تھا۔ کوتاہ قامتی کے باعث وہ وائلن بجانے کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ساز کو گھٹنوں میں دبا کر رکھتا تھا۔ اسے پیانو کی آواز تمام سازوں سے زیادہ پسند تھی، مگر اتنی چھوٹے بازوؤں کے ساتھ اس کے لیے پیانو بجانا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ وہ شاعری بھی کرتا تھا، مگر اس نے کبھی اپنی نظمیں چھپوانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جاگیر کا نظام سنبھالنے کے بعد لارڈ ہرکولیس نے سب سے پہلے اپنی حویلی کے ملازمین کو تبدیل کر دیا۔ عام قد و قامت کے خادموں کی جگہ اُس نے ایک ایک کر کے پستہ قد نوکروں کی خدمات حاصل کیں۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اور اپنے آس پاس ایسا ماحول تخلیق کرے گا جس میں کوئی دراز قد شخص اسے حقارت سے نہیں دیکھ سکے گا۔ چند ہی برسوں میں اُس حویلی اور جاگیر کا تمام کام کوتاہ قامت ملازموں نے سنبھال لیا۔ اس کے سب سے لمبے خادم کا قد چار فٹ اور سب سے چھوٹا ڈھائی فٹ کا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے پالے ہوئے بڑے قد کاٹھ کے تمام کتے پڑوسی جاگیرداروں کو تحفۃً دے دیے اور ان کی جگہ دور دراز علاقوں سے انتہائی چھوٹی نسل کے بہت سے قیمتی کتے منگوائے۔ اسی طرح اس نے حویلی کے اصطبل کے تمام اعلیٰ گھوڑے ملک بھر کے شوقینوں کو بیچ دیے اور ذاتی استعمال کے لیے فارسٹ بریڈ کی چھوٹے قد کی دوغلی گھوڑیاں خرید لیں۔

اپنی پسند کا گھریلو ماحول تخلیق کرنے کے بعد لارڈ ہرکولیس کے دل میں ایک رفیقہ حیات کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی طرح کوئی اور بھی اس کی بسائی ہوئی جنت سے لطف اندوز ہو سکے۔ ہرکولیس شاعرانہ طبیعت کا مالک تھا۔ اور اٹھارہ برس کی عمر میں وہ محبت کے جذبے سے اُس وقت آشنا ہو گیا تھا جب اسے نیلی آنکھوں اور بھورے بال والی ایک لڑکی نے اتنا متاثر کیا کہ وہ اس سے اظہارِ عشق کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور یہی وہ موقع تھا جب وہ زندگی میں پہلی بار اپنی معذوری کے سبب انتہائی ذلت کا شکار ہوا تھا ابتدا میں لڑکی اس کا مدعا سن کر بہت محظوظ ہوئی تھی اور اپنی گردن جھکا کر اسے فرش پر ڈھونڈنے کی اداکاری کرتے ہوئے ہنستے ہنستے دہری ہو گئی تھی۔ مگر جب وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور ہر ملاقات پر اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا تو تنگ آ کر ایک دن لڑکی نے اسے کندھوں سے پکڑا کر اٹھالیا اور کمرے کے ایک طاق پر بٹھا کر کہا۔ پیارے بچے! آئندہ مجھ سے مذاق کیا تو طاق سے نیچے نہیں اتاروں گی'' بہت جلد یہ بات پورے علاقے میں مشہور ہو گئی۔ اعلیٰ طبقے کی دعوتوں میں لڑکی سے خاص طور پر یہ واقعہ سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ ہر چند کہ اس تلخ تجربے کے بعد بھی ہرکولیس کی طبیعت کا رومان بدستور قائم رہا تھا۔ مگر اب وہ خوبصورت چہروں والی لڑکیوں کی چاہت کو دل ہی میں چھپائے رکھتا تھا۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے بالشتیوں کی ذہانت اور صلاحیت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ لیکن اب پورے ماحول کو اپنے قد وقامت کے مطابق ڈھالنے کے بعد وہ فطری طور پر اپنی جیسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ ''لڑکی کا تعلق بے شک چھوٹی نسل سے ہو'' وہ کہتا ''مگر اس کا ذہین، باصلاحیت اور خوبصورت ہونا لازمی ہے''۔ اس نے لارڈ بامبور کی اکلوتی لڑکی سے اس لیے شادی سے انکار کر دیا کہ وہ پست قد ہونے کے علاوہ کبڑی بھی تھی۔ اس کے علاوہ شفائر کے جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک بونی لڑکی اُس نے محض اس لیے نامنظور کر دی کہ اس کے چہرے پر داغ تھے۔ طویل عرصے تک موزوں رشتہ نہ ملنے پر ہرکولیس اپنے مقدر سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ اچانک اُسے اطلاع موصول ہوئی کہ اٹلی میں کاؤنٹ ٹاٹلو کی بیٹی جس کا قد تین فٹ ہے' حسن و جمال اور فنکارانہ صلاحیتوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہرکولیس اس خبر پر فوراً وینس روانہ ہو گیا اور شہر پہنچتے ہی اُس نے کاؤنٹ ٹاٹلو کے گھر حاضری دی اور بغیر کسی غیر ضروری تمہید کے اپنی تمنا کا اظہار کیا۔ کاؤنٹ ٹاٹلو نے جو اپنی عجوبہ بیٹی کے مستقبل سے مایوس ہو کر اسے ایک سرکس کے حوالے کرنے والا تھا' یہ رشتہ فوراً منظور کر لیا۔ تین دن کے اندر لارڈ ہرکولیس کی لیڈی فلمونا سے شادی ہو گئی۔ وینس کی ایک

عالی شان سرائے میں شب عروسی گزارنے کے بعد لارڈ ہرکولیس اور لیڈی فلمونا سمندر کے راستے واپس انگلستان روانہ ہوئے۔ شہر کے ممتاز افراد نے جن میں سلطنتِ برطانیہ کا سفیر برائے اٹلی بھی شامل تھا' انہیں بندرگاہ پر خدا حافظ کہا۔

لارڈ ہرکولیس کی حویلی کے عملے نے فلمونا کو تہہ دل سے خوش آمدید کہا' اور یہاں نو بیاہتا جوڑے نے ایک انتہائی خوش گوار زندگی کا آغاز کیا۔ میاں بیوی کے مزاجوں میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دونوں کو شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی۔ خاص طور پر موسیقی کے شعبے میں دونوں کی صلاحتیں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ فلمونا کی آواز بہت سریلی تھی۔ اور اس نے بچپن میں گانے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ ہرکولیس اپنا وائلن گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ جاتا اور اس کی بیوی وائلن کی سنگت میں اٹلی کے لوک گیت اتنے دلکش انداز میں گاتی کہ حویلی کا تمام عملہ جھوم جھوم جاتا۔ شادی کے بعد ہرکولیس کی پیانو بجانے کی دیرینہ آرزو بھی نہایت خوش اسلوبی سے پوری ہوگئی۔ میاں بیوی پیانو کے سامنے بیٹھ جاتے اور چار چھوٹے بازوؤں سے وہ کام کرتے جو اس قدر چوڑے ساز پر فقط دو طویل بازو ہی سے ممکن تھا۔ خوش گوار موسم میں دونوں باغ میں بیٹھ کر دیر تک اطالوی اور انگریزی شاعری سے لطف اندوز ہوتے کبھی وہ حویلی کے پاس واقع ایک خوبصورت جھیل میں کشتی رانی سے دل بہلاتے' کبھی اپنی خصوصی گھوڑیوں پر سوار ہو کر سر سبز وادیوں کی سیر کو نکل جاتے۔ کسی کسی دن وہ صبح سے شام تک شکار میں مصروف رہتے۔ انہیں ہرنوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے چھوٹی نسل کے کتے خرگوشوں کا تعاقب کرنے کے لیے بہت موزوں تھے۔ مختصر جسامت کے چار تربیت یافتہ سائیس خرگوشوں کو جھاڑیوں میں سے ہشکاتے ہوئے باہر نکال لاتے' اور پھر صاحب اور بیگم اپنے چھوٹے قد کی گھوڑیوں کو خرگوشوں کے تعاقب میں سرپٹ دوڑاتے جبکہ ان سے آگے پگ نسل کے ننھے منے مگر انتہائی تیز رفتار کتے اپنی بھونکاروں سے خرگوش کو دوڑا کر نیم جان کر دیتے تھے۔

یوں ہی ہنستے کھیلتے لارڈ ہرکولیس اور لیڈی ہرکولیس کی زندگی کے چار سال گزر گئے۔ اس عرصے کے اختتام پر فلمونا نے خود کو حاملہ پایا۔ اور ہرکولیس یہ خبر سن کر خوشی سے بے حال ہو گیا۔ "خدا نے چاہا تو ہماری نسل کا نام روشن ہوگا"۔ اس نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا" ...... اور دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ کمتر جسمانی قد و قامت کے لوگ قدرتی طور پر بلند ذہنی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ میرے اور فلمونا کے ملاپ سے پیدا ہونے والا بچہ بالآخر چھوٹی نسل کی عظمت کو پوری انسانیت سے تسلیم

کروالے گا۔ چھوٹی نسل جو اپنے غیر معمولی تخیل اور قابلیت کے باوجود عامیانہ جسامت والوں کے مذاق کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ جس روز فلمونا نے بیٹے کو جنم دیا لارڈ ہرکولیس نے ایک نظم لکھی جس میں اس طرح کے جذبات کا منظوم اظہار کیا گیا تھا۔ نومولود کا نام آبائی حویلی تعمیر کروانے والے کے نام پر فرڈیننڈ رکھا گیا۔

بچے کی پیدائش کا جشن تو قابلِ دید تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لارڈ ہرکولیس اور بیگم ہرکولیس کے ذہنوں پر اندیشوں کے سائے پڑنے لگے۔ ان کے بیٹے کی جسمانی نشوونما ان کی توقعات سے بہت زیادہ تیز تھی۔ اس کا قد بڑھنے کی رفتار ان کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ پہلی سالگرہ پر بچے کا وزن چوبیس پونڈ تھا جبکہ ہرکولیس اپنی مرحومہ ماں کی ڈائری میں پڑھ چکا تھا کہ خود اس کا وزن دو برس کی عمر میں فقط بارہ پونڈ تھا۔ ''فرڈیننڈ پاگلوں کی طرح بڑا ہو رہا ہے'' فلمونا نے اپنے روزنامچے میں درج کیا۔ ''وہ غیر فطری ساخت کا حامل ہے''۔ اٹھارہ ماہ کی عمر میں فرڈیننڈ اصطبل کے رکھوالے جتنا لمبا ہو چکا تھا۔ کیا فرڈیننڈ عام آدمیوں کی طرح جناتی قد کو پہنچے گا؟ یہ لرزہ خیز خیال تھا اور میاں بیوی اس سلسلے میں ایک دوسرے سے بات کرنے سے بچتے تھے مگر اپنی اپنی ڈائریوں میں دونوں مستقل اپنے وسوسوں کا اظہار کر رہے تھے۔

تین برس کی عمر میں فرڈیننڈ اپنی ماں سے زیادہ قد آور تھا۔ جبکہ اس کا قد ہرکولیس سے کچھ ہی کم تھا۔ ''آج ہم نے پہلی بار اس مایوس کن صورتِ حال پر گفتگو کی ہے۔ لارڈ ہرکولیس نے اپنی ڈائری میں لکھا ''اس خوفناک حقیقت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرڈیننڈ ہم میں سے نہیں ہے آج اس کی تیسری سالگرہ تھی اور آج جبکہ ہم کو اپنے بیٹے کی جسمانی ساخت اور دلکشی پر فخر کرنا چاہیے تھا ہم سارا دن اپنی بدبختی پر روتے رہے۔ خدا ہمیں اس آزمائش کی گھڑی میں ثابت قدم رکھے''۔

آٹھ سال کی عمر میں فرڈیننڈ اتنا طویل قامت' اتنا صحت مند اور اس قدر کھلنڈرا ہو چکا تھا کہ اس کے والدین نے بادلِ نخواستہ اسے اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی روانگی کے بعد حویلی کا ماحول پرسکون ہو گیا۔ مگر ایک سال بعد وہ مزید لمبا چوڑا اور تندرست ہو کر چھٹیاں گزارنے گھر واپس آیا۔ اسی دوران اس نے کسی بات پر ناراض حویلی کے خانساماں کو اتنی زور سے مکا مارا کہ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی خانساماں دیر تک خوف اور صدمے کے سبب بہکی بہکی باتیں کرتا رہا'' فرڈیننڈ بدتمیز' جھگڑالو اور گستاخ ہے' لارڈ ہرکولیس نے ڈائری میں اپنے

خیالات کا اظہار کیا۔ ''کڑی جسمانی سزا کے علاوہ اس کا کوئی علاج نہیں۔'' لیکن فرڈیننڈ کو جو اس وقت تک اپنے باپ سے ڈیڑھ فٹ اونچا ہو چکا تھا۔ حویلی میں کوئی شخص سزا دینے کے قابل نہیں تھا۔

اگلے برس جب فرڈیننڈ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا تو اس کے ساتھ ایک انتہائی چوڑا چکلا شکاری کتا تھا یہ کتا اس نے ایک شخص سے خریدا تھا جو مہنگی نسل کے اس جانور کی خوراک کا خرچ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس خونخوار کتے نے پوری حویلی کے نظام کو تہہ و بالا کر دیا۔ لارڈ ہرکولیس کے ایک پستہ قد پالتو کتے کو اس نے جبڑوں میں پکڑ کر اتنا جھنجھوڑا کہ فرڈیننڈ کے پہنچنے تک وہ تقریباً مردہ ہو چکا تھا۔ ہرکولیس کو اپنے پالتو کی ڈھلکی ہوئی گردن دیکھ کر جلال آ گیا اور اس نے چیخ کر فرڈیننڈ کو حکم دیا کہ وہ اپنے جنگلی جانور کو اصطبل کی چار دیواری میں باندھ کر رکھے۔ ''یہ میرا پالتو کتا ہے'' فرڈیننڈ نے گستاخی سے جواب دیا۔ ''میں جہاں چاہوں گا اسے رکھوں گا''۔

''میں تمہارا باپ ہوں''۔ ہرکولیس غم و غصے سے کانپنے لگا۔ تمھیں میری بات پر عمل کرنا ہوگا ورنہ......''

باپ بیٹے کی بلند آوازوں کی وجہ معلوم کرنے کے لیے فلمونا کمرے میں دوڑی چلی آئی فرڈیننڈ کے کتے کو فلمونا کے حلیے اور لہجے سے اجنبیت محسوس ہوئی اور اس نے چھوٹتے ہی فلمونا پر جست لگا دی۔ پلک جھپکنے میں فلمونا فرش پر تھی اور کتا اس کے پیٹ پر پنجے رکھ کر ٹانگ میں دانت گاڑھ چکا تھا۔ لارڈ ہرکولیس نے تڑپ کر نیام سے تلوار نکالی اور وجود کی پوری قوت سے کتے پر یوں وار کیا کہ تیز دھار ہتھیار کی نوک جانور کے دل کو چیرتی چلی گئی کتا بغیر آواز نکالے بھاری آواز کے ساتھ زمین پر گرا۔ اور ہرکولیس اس کی لاش پر پاؤں رکھ کر دہلا دینے والی آواز میں اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ''فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔ اور کبھی ہم سے بات مت کرنا۔ تم نے تو اپنی ماں کو قتل کر ہی دیا تھا۔ وہ تو بس قسمت تھی کہ...... جاؤ، چلے جاؤ''۔ ہرکولیس کی تلوار خون میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں عمر بھر کی تلخی نے دیوانگی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ فرڈیننڈ نے اس لمحے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی اور اس واقعے کے بعد وہ چھٹیوں کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ فلمونا پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کئی دنوں تک اکثر چیخ مار کر سوتے سے اٹھ جاتی اور دیر تک بستر پر بیٹھی خوف سے لرزتی رہتی۔

اس مرتبہ فرڈیننڈ اسکول گیا تو پانچ برس تک اس نے چھٹیوں میں گھر آنے کی بجائے یورپ کے

مختلف ممالک کی سیر کرنے کو ترجیح دی۔ اس کے والدین نے اس کی تعلیم مکمل ہونے تک کا یہ عرصہ نسبتاً سکون سے گزارا۔ لیکن اس تمام عرصے میں وہ مستقبل کے اندیشوں اور وسوسوں سے نجات نہیں پا سکے۔ انہیں اپنی شادی کے ابتدائی ایام یاد آتے رہے جب انہیں اس طرح کی کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی وہ تمام وقت موسیقی اور شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن اب فلمونا کی آواز میں پہلی جیسی کھنک نہیں تھی اور ہرکولیس جوڑوں کے درد کے باعث وائلن بجانے سے اجتناب کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر ستم یہ تھا کہ جب فلمونا پر اس کے بیٹے کا کتا حملہ آور ہوا تھا وہ ہر طرح کے کتوں سے خوف زدہ ہوگئی تھی یہی وجہ تھی کہ اب وہ اپنی چھوٹی نسل کے پگ کی بھونکاروں سے بھی لرزنے لگتی تھی جس کے باعث اس کے لیے شکار پر جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ ہرکولیس تنہا شکار پر گیا مگر شام کے وقت انتہائی دل شکستہ اور بے مزا لوٹا۔ مختلف زبانوں کی شاعری کا مطالعہ اب ان کے لیے وقت گزاری کا واحد ذریعہ تھا۔ مگر با آواز نظمیں پڑھنے کے دوران بھی اب وہ پہلی جیسی سرشاری محسوس نہیں کرتے تھے۔

بالآخر فرڈیننڈ کی تعلیم مکمل ہوئی اور وہ جاگیر کے واحد قانونی وارث کی حیثیت سے گھر واپس آیا۔ جس دن اس کی آمد متوقع تھی فلمونا اعصابی تناؤ کے باعث آدھے سر کے درد میں مبتلا ہو کر سر شام بستر پر چلی گئی۔ لارڈ ہرکولیس نے حویلی کے بڑے دروازے پر اپنے بیٹے کا استقبال کیا۔ ''خوش آمدید'' اس نے بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس دیو قامت شخص سے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ سر سے بلند کیا۔ ''اپنے گھر میں آنا تمھیں مبارک ہو''۔ اس کی آواز کی لرزش فقط اس کے پیچھے کھڑے ملازموں نے محسوس کی تھی۔

''امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔'' فرڈیننڈ نے جھک کر لارڈ ہرکولیس سے ہاتھ ملایا اور پھر تن کر کھڑا ہو گیا اس کے باپ کا سر اس کے کوٹ کی جیب کو چھو رہا تھا۔

فرڈیننڈ تنہا نہیں تھا۔ وہ اپنے دو دوستوں کو ساتھ لایا تھا۔ ہر دوست کے ساتھ اس کا ذاتی ملازم بھی تھا۔ لارڈ ہرکولیس کی آبائی حویلی میں تیس سال بعد عام نسل کے اتنے افراد جمع ہوئے تھے اس کے قدم لڑکھڑا گئے مگر مہمان نوازی کے آداب کا تقاضا تھا کہ وہ حویلی کا تقدس پامال کرنے والوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اس نے اپنے بیٹے کے دوستوں کا بھی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور ان کے نوکروں کو اپنے ملازمین کے سپرد کر کے ان کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی ہدایات

مہمانوں کا کھانا لگانے کے لیے حویلی کی پرانی میز اور کرسیاں جھاڑ پونچھ کر نکالی گئیں۔ ہرکولیس اور فلمونا نے اپنے لیے بیس انچ اونچا ایک خصوصی میز بنوالیا تھا۔ حویلی کے پستہ قد خانساماں، سائمن جو لارڈ ہرکولیس کے خصوصی میز پر نہایت خوش اسلوبی سے کھانا لگاتا تھا آج بمشکل اپنی آنکھیں بڑے میز کی سطح تک لانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ بالآخر سائمن نے فرڈیننڈ کے دوستوں کے ساتھ آنے والے ملازموں کی مدد سے بڑی میز پر کھانا سجایا۔

کھانے کے دوران لارڈ ہرکولیس نے فرڈیننڈ کے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا اور انہیں یورپ کی سیاحت کے دوران پیش آنے والے دلچسپ واقعات خاص طور پر وینس کی خوبصورتی اور وہاں منعقد ہونے والی فنِ مصوری کے نادر نمونوں کی نمائش کا ذکر کیا......"میں آج تک اٹلی کی وہ عبادت گاہیں نہیں بھول سکا جہاں یتیم بچوں کے گروہ مقدس نغمے سناتے ہیں۔ عجیب سماں ہوتا ہے۔" لارڈ ہرکولیس نے گفتگو کو پرکشش بنانے کی پوری کوشش کی، مگر نوجوانوں کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تمام وقت مضحکہ خیز قد والے خانساماں کو دیکھتے رہے جو ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر میز کی پلیٹیں اور گلاس بدلنے کے لیے انتہائی مزاحیہ انداز میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی حرکتوں پر انہیں ہنسی روکنا دشوار ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ ہنسی چھپانے کے لیے مصنوعی انداز میں کھانسنے لگے۔ ہرکولیس نے بظاہر یہ تاثر دیا کہ جیسے وہ کچھ محسوس نہیں کر رہا۔ اس نے مہمانوں کی توجہ مبذول کرانے کی آخری کوشش کے طور پر کھیلوں کو موضوع گفتگو بنایا۔ اس پر ایک نوجوان بولا۔ "فرڈیننڈ نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ خرگوشوں کے ماہر شکاری رہے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں آتا"۔

"یہ بالکل درست ہے" ہرکولیس نے جواب دیا اور سنجیدگی سے شکار کی تفصیلات بتانے لگا جب اس نے بتایا کہ اس کے چھوٹی نسل کے پگو کتے خرگوشوں کا تعاقب کرتے تھے تو سارے نوجوان قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔

کھانا ختم ہوتے ہی ہرکولیس چھلانگ مار کر اونچی کرسی سے اترا، اور نوجوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی بیوی کی مزاج پرسی کے لیے حویلی کی دوسری منزل پر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے تک اسے فرڈیننڈ اور اس کے دوستوں کی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ فلمونا بستر پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ نچلی منزل پر ہنگامے سے اس کے اعصاب چیخ رہے تھے ہرکولیس کوئی بات کیے بغیر چھوٹی کرسی فلمونا کے بستر کے قریب لا کر بیٹھ گیا۔ دونوں دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے

رہے۔ دس بجے کے قریب اچانک نیچے سے برتن ٹوٹنے کی آوازیں آئیں اور شور وغل کا ایک طوفان اٹھا۔ فلمونا خوف سے لرزنے لگی۔ ہرکولیس نے اسے تسلی دی۔ اور ہنگامے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے نیچے چلا گیا۔ زینہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہر قدم احتیاط سے رکھتا کھانے کے کمرے میں اترتا گیا۔ سیڑھیوں کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔ یہاں سے نیچے کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ فرڈیننڈ اور اس کے دوست ہاتھوں میں مختلف برتن تھامے میز بجا رہے تھے اور میز کے اوپر حویلی کا خانساماں رقص کر رہا تھا۔ سب نشے میں دھت تھے۔ سائمن رکتا تو بدمست تماشائیوں میں سے کوئی اپنی لمبے بازو بڑھا کر اسے پکڑ کر الٹا کھڑا کرنے کی کوشش کرتا اور وہ گھبرا کر دوبارہ ناچنے لگتا۔ مہمانوں کے ذاتی ملازم بھی دیوار سے پشت لگائے اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور دیوانہ وار قہقہے لگا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے وہ سب شراب کے گلاس بھر کر خود بھی پیتے اور سائمن کو گود میں اٹھا کر اس کے منہ میں شراب انڈیل دیتے تھے۔

"کل رات کھانے کے بعد......" چند لمحوں کے لیے ہنگامہ رکا تو فرڈیننڈ نے نشے میں ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ہم حویلی کے سارے بونوں کو جمع کر کے اجتماعی رقص دیکھیں گے"۔

"اور......" فرڈیننڈ کے ایک دوست نے جھومتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

"اور لارڈ ہرکولیس اس تقریب میں اپنے ملازموں کی قیادت کریں گے"۔ اس پر سب ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔ ایک مہمان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور فرش پر پڑی شیشے کی کرچیوں میں اضافہ ہو گیا۔

ہرکولیس کا دل اس کی پسلیوں سے ٹکرانے لگا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر تک وہ سیڑھیوں پر کھڑا لرزتا رہا۔ مگر پھر اُس نے اپنی کھوئی ہوئی قوت کو مجتمع کیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

فلمونا اب تک جاگ رہی تھی اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں ہرکولیس نے کہا۔

"فرڈیننڈ اور اس کے دوست بوڑھے سائمن کی توہین کر رہے ہیں......کل ہماری باری ہے"۔

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"میں کل تک زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی" بالآخر فلمونا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"تم نے میرے دل کی بات کہی ہے"۔ ہرکولیس نے جذبات سے عاری آواز میں کہا اور الماری سے ڈائری نکال کر دن بھر کے واقعات درج کرنے لگا۔ رات کے واقعہ پر اپنے تاثرات درج

کرنے کے بعد اس نے ڈائری بند کی۔ اور ایک نوکر کو غسلخانے کے ٹب کے لیے پانی گرم کرنے کو کہا۔ پانی گرم ہونے تک اس نے ایک پیالے میں افیم کا محلول تیار کیا اور اسے مہلک حد تک گاڑھا کرنے کے بعد فلمونا کے پاس لے گیا۔

''یہ تمہارے لیے پُرسکون ابدی نیند کا جام ہے''۔ اس نے نہایت ہموار لہجے میں کہا۔ ''میرے لیے دوسرا طریقہ زیادہ موزوں رہے گا''۔

فلمونا نے خاموشی سے پیالہ تھام لیا' مگر ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے وہ ہرکولیس کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''تمہیں یاد ہے شادی کے ابتدائی دنوں میں ہم کتنے خوش رہا کرتے تھے۔ بہار کے دنوں میں تو ہم صبح سے شام تک وائلن بجاتے اور گیت گاتے رہتے تھے۔ خاص طور پر وہ...... فلمونا کی آواز بھرا گئی'' وہ والا گانا...... دو آنکھیں اور اتنے منظر...... دو آنکھیں اور اتنے......'' اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ اور پھر وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ''کبھی لگتا ہے ان باتوں کو بہت عرصہ گزر گیا''۔ کچھ دیر بعد اس نے سنبھل کر کہا ''اور کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے''۔ ہرکولیس نے فلمونا کی گفتگو کے دوران ایک لفظ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اپنا منہ اتنی سختی سے بھینچ لیا تھا کہ اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آخر کار فلمونا نے آنسو پونچھ کر ایک سانس میں پیالہ خالی کر دیا اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی پلکوں نے بوجھل ہو کر آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ ہرکولیس نے اس کے چہرے پر بوسہ دیا اور سر جھکا کر غسلخانے میں چلا گیا۔ جب اس نے ٹب میں پاؤں رکھا تو اس کے دائیں ہاتھ میں تیز دھار استرا تھا۔ ٹب میں بیٹھ کر وہ اپنی بائیں کلائی آنکھوں کے قریب لایا' کچھ دیر تک اپنی نبض کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر یکلخت اس نے دائیں ہاتھ میں تھامے استرے سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ دیں۔ کلائی سے ابلتا ہوا لہو ٹب کے پانی کو تیزی سے سرخ کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے وہ اپنے زخم کو مزید گہرا کرتا رہا۔ غنودگی طاری ہونے سے پہلے وہ اپنی پوری زندگی کے بارے میں سوچ چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا سر ڈھلک گیا اس کے چھوٹے سے بدن میں خون ہی کتنا تھا۔

☆

الڈس ہکسلے کو دنیائے ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ مستحق تھا۔ نقادوں نے اسے بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کا اہم ادیب قرار دیا' اور اپنے تئیں سبکدوش سمجھ کر دیگر موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ مگر ادب کا میدان اس لحاظ سے بہت منفرد ہے کہ جو ہر قابل تمام تر بے انصافیوں

کے باوجود نہایت آسائش سے اپنی منزل حاصل کر لیتا ہے اور بقول نطشے بعد میں انصاف بھی لنگڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ہکسلے ان ادیبوں میں سے تھا جو بلند بینوں کو لاحق دائمی فکرِ ترقی کے باعث بالآخر روحانیت کے بھنور Crisis of Mysticism کا سامنا کرتے ہیں۔

There comes a time when one asks even of Shakespeare, even of Beethoven, is this all?

آخر اُلامر آہ کیا ہوگا　　　　کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

الڈس ہکسلے کا جملہ اور خواجہ میر درد کا شعر بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے دو رخ ہیں اور یہ سوال ارفع ترین ذہنوں کی آخری بے چینی سے جنم لیتا ہے۔

تمام عظیم ادیبوں کی طرح ہکسلے بھی عمر بھر انسانی نفس کی پیچیدگیوں اور تہہ داریوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وجود میں موجزن کائناتوں سے مسحور ہوتا رہا' اور پھر اس نے جدید عہد میں آدمی کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش کے یکلخت بکھر جانے کی نوحہ گری کا منصب سنبھال لیا۔ روحانیت کے بھنور تک پہنچ جانے والے تمام لکھاریوں کی طرح ہکسلے بھی عصرِ حاضر کی تہذیب کو کھوکھلا' سطحی اور انسان کے تنزل کی علامت سمجھتا تھا اس کے کہنے کے مطابق جدید دنیا اس قدر تیزی سے مادیت کے دلدل میں دھنستی جا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مادی آسائشوں کی مٹی آدمی کا چہرہ بھی ڈھانپ لے گی اور "...... جس دن روحانیت کی آخری رمق بھی ختم ہو گئی' اس دن کرۂ ارض کے تمام باشندے پاگل ہو جائیں گے۔"

ہکسلے کی روشنیٔ طبع نے ان گنت دماغوں کو منور کیا۔ ہر چند کہ اس کی عظمت پیشہ ور نقادوں کی نظر سے اوجھل رہی۔ لیکن وہ ایک حقیقی ادیب کی طرح نمود و نمائش سے بے نیاز اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے تحریر و تقریر کی تمام قوتوں کے ساتھ روحانی منزلوں کے حصول کے لیے نشہ آور کیمیائی عناصر کے استعمال کی حمایت شروع کر دی۔ اور خود بھی ذہن کو کشادہ کرنے والے مرکبات استعمال کرنے لگا۔

Die, and become what you are.

الڈس ہکسلے صوفیوں کے اس لرزہ خیز قال کو اپنا "حال" بنا چکا تھا اسی لیے 1963ء میں انہتر برس کی عمر میں بسترِ مرگ پر آخری دم تک اس کی سرشاری اور گفتگو قابلِ دید و شنید تھی۔

جین پال سارتر

دوام

سڑک پر چلتے آدمیوں کو بلندی سے دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں بتی بجھا کر کھڑکی سے جھانکتا ہوں۔ نیچے سے گزرتے راہ گیروں کو شک ہی نہیں ہوتا کہ کوئی انہیں یوں اوپر سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ عام طور پر ہر شخص اپنے بدن کا سامنے کا حصہ سجاتا ہے۔ یا تھوڑا بہت کمر کا خیال کر لیتا ہے۔ بہر حال اُس کی تمام آرائش اُن آنکھوں کے لیے ہوتی ہے جو تقریباً پانچ فٹ آٹھ انچ اونچی بلندی پر واقع ہوتی ہیں۔ کوئی بھی اپنی ٹوپی کا اُوپر والا حصہ یا اپنے کندھوں کی سجاوٹ کا خیال نہیں رکھتا۔ لوگوں کو ابھی تک احساس ہی نہیں ہوا کہ اُوپر سے دیکھنے والی آنکھ انسانیت کی کتنی بڑی دشمن ہے۔ میں کھڑکی سے جھک کر سب پر ہنستا ہوں۔ اب ان کی اکڑی ہوئی چال کی کیا حیثیت رہ گئی ہے؟ اس لمحے ان کی شخصیت فقط دو جھولتے کندھوں اور نیچے سے بے ڈھنگے پن سے نکلی ہوئی دو ٹانگوں پر مشتمل ہے۔

میں ساتویں منزل کی بالکونی پر تمام زندگی گزار سکتا ہوں۔ مجھے عام لوگوں پر یہی تو فوقیت حاصل ہے۔ میں اُن کے مقابلے میں بلند تر مقام کا حامل ہوں۔ کبھی کبھی مجھے نیچے بھی جانا پڑتا ہے۔ وہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ لوگوں کی سطح پر کھڑے ہو کر انہیں کیڑے مکوڑوں کی شکل میں دیکھنا بہت دشوار ہے۔ وہاں تو وہ میری برابری کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی مجھے چھو بھی لیتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سڑک پر ایک مردہ شخص بھی دیکھا تھا۔ وہ چلتے چلتے منہ کے بل گر کر مر گیا تھا۔ اسے سیدھا کیا گیا تو اُس کا خون آلود چہرہ دیکھ کر سب افسوس کرنے لگے۔ مجھے اُس منظر نے کوئی ایسا خاص متاثر نہیں کیا تھا۔

"اگر کسی کا خوف سے پتلون میں پیشاب نکل جائے"۔ مجھے خیال آیا تھا۔ "تو آدمی زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہے۔" لیکن اس خیال کے بعد میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ چند لوگ مجھے دواؤں کی دکان پر لے گئے تھے۔ اور میرے گالوں پر طمانچے مار کر مجھے ہوش میں لائے تھے۔ اگر میرا بس چلتا تو اُس لمحے میں اُن سب کو ہلاک کر سکتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے دشمن ہیں، مگر یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپس میں وہ دوست تھے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تھے۔ احوالیہ جملوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے تھے۔ وہ مجھے بھی اپنے جیسا سمجھ کر میری مدد کر رہے تھے۔ اگر انہیں حقیقت معلوم ہو جاتی تو وہ مجھے مار مار کر مجھے توڑ ڈالتے۔ کچھ عرصے بعد جب انہیں علم ہو گیا کہ دراصل میں کون ہوں تو انہوں نے مجھے مارا بھی تھا۔ وہ دو گھنٹے تک مجھے سرِ بازار زدوکوب کرتے رہے تھے۔ جب اُن کے تھپڑوں اور مکّوں سے نڈھال ہو کر میں گر گیا تو انہوں نے مجھے ٹھوکریں ماریں تھیں، اور ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا۔ میرے کپڑے پھاڑ دیے تھے۔ اور میری عینک اُتار کر دور پھینک دی تھی جب میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اپنی عینک تلاش کر رہا تھا، اس وقت کسی نے میرے منہ پر ایسی ضرب لگائی تھی کہ میرے دانت ٹوٹ کر حلق کے اندر چلے گئے تھے۔ مجھے شروع سے علم تھا کہ بالآخر ایک دن انہوں نے مجھے بہت مارنا ہے۔ چند لمبے چوڑے لوگ عرصے سے مجھے مارنے کا موقع تلاش کر رہے تھے۔ سڑک پر وہ میرے کندھے سے ٹکراتے تھے تاکہ میں جواب میں انہیں کچھ کہوں جسے بہانہ بنا کر وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں۔ لیکن میں یوں چلتا رہتا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ مگر آخر کار انہیں موقع مل ہی گیا۔ مجھے اوّل روز سے اندیشہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی کوئی بہانہ ڈھونڈ لیں گے۔ اسی لیے میں ابتدا سے ان سے نفرت کرتا تھا۔

صورتِ حال اتنی گمبھیر ہوگئی کہ مجبوراً میں نے ایک پستول خریدنے کا فیصلہ کیا۔ پستول حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک عجیب سی طاقت کا احساس ہوا۔ جسم کے ساتھ مستقل ایک ایسی چیز لگی رہے جو وقت پڑنے زوردار آواز سے چیزوں میں سوراخ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو تو آدمی دلیر ہو جاتا ہے۔ میں چھٹی کے دن جیب میں پستول ڈالتا اور تمام وقت شہر کی سڑکوں پر گھومتا۔ پتلون کی جیب میں پڑا پستول ٹانگ سے چھوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کیڑا بدن پر رینگ رہا ہے۔ ابتدا میں فولاد کی ٹھنڈک عجیب سی سنسنی پیدا کرتی لیکن کچھ وقت کے بعد وہ بدن جتنا ہی گرم ہو جاتا۔ چہل قدمی کے دوران میں جب بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہتھیار کو محسوس کرتا، میرا سر خود اعتمادی سے بلند ہو جاتا۔ جہاں کوئی ایسی دیوار نظر آتی جس کے ساتھ کھڑے ہو کر لوگ پیشاب کرتے ہیں، تو میں بھی دیوار کی جانب منہ کر کے رُک جاتا، اور اپنا پستول نکال کر ایک مرتبہ پھر اُسے غور سے دیکھتا۔

ایسے موقعوں پر مجھے بہت احتیاط کرنی پڑتی تھی کیونکہ کبھی کبھی دوسرا شخص بہت نزدیک کھڑا اجابت

میں مصروف ہوتا۔اس کے باوجود میں چند لمحوں کے لیے پستول کا آہنی دستہ اورادھ کھلی آنکھ جیسی لبلبی دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔سڑک سے گزرنے والے لوگ یہی سمجھتے کہ میں دیوار کی جانب منہ کیے فراغت حاصل کر رہا ہوں۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں گزرگاہوں پر پیشاب کرنے کو بہت برا سمجھتا ہوں۔

ایک رات مجھے لوگوں پر گولیاں برسانے کا خیال آیا۔یہ ہفتے کی رات تھی اور میں گھر سے اس بھورے بالوں والی لڑکی کو لینے نکلا تھا جو شہر کی مرکزی شاہراہ پر واقع ہوٹل میں کام کرتی تھی۔میں عورتوں سے مباشرت کرنے کو پسند نہیں کرتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ہم بستری کے دوران چاہے مرد ہی زیادہ غافل نظر آئے مگر اس عمل میں بالآخر عورت ہی کی جیت ہوتی ہے......بستر سے لڑکی ہی کچھ لے کر اُٹھتی ہے' میں کسی سے کچھ مانگتا نہیں ہوں' مگر میں کسی کو کچھ دینا بھی نہیں چاہتا۔ اسی لیے میری جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہی عورت موزوں رہتی ہے جو بنیادی طور پر سرد مزاج کی ہو اور میری خواہشات پر عمل کرنے سے اسے کراہت آئے۔ہر مہینے کی پہلی چھٹی کو میں آلی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رات گزارتا ہوں۔وہ میرے کہنے پر کپڑے اتارتی ہے۔اور میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہتا ہوں۔اُس رات آلی طبیعت کی خرابی کے باعث اپنے کام کی جگہ پر موجود نہیں تھی۔غالبًا اسے زکام ہو گیا تھا۔باہر جنوری کے مہینے کی سرد اُداسی پھیلی تھی اور میں بہت زیادہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔اس شام میں گھر سے بہت اُمنگ کے ساتھ نکلا تھا اور یہ مایوسی نہایت غیر متوقع تھی۔خیالی دنیا میں رہنے کے سبب مجھے کبھی کبھی عورت کی شدید طلب ہوتی ہے۔اچانک میرے ذہن میں ایک اور لڑکی کا خیال آیا۔وہ تھوڑی موٹی ضرور تھی مگر اس کا جسم ڈھیلا نہیں تھا۔ میں یوں بھی موٹے بدن والی عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔موٹی عورت کپڑے اُتارنے پر دُبلی عورت سے زیادہ ننگی نظر آتی ہے۔لیکن اُس روز جس فربہ لڑکی کا مجھے خیال آیا تھا وہ میری خواہشات سے آشنا نہیں تھی۔میں بھی اسے زیادہ نہیں جانتا تھا۔بعض اوقات پیشہ ور عورتیں بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔وہ اپنے دلال کو الماری کے پیچھے چھپا دیتی ہیں جو عین وصال کی حالت میں آپ کو پکڑ لیتا ہے اور ڈرا دھمکا کر سارے پیسے چھیننے کے بعد آپ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔مگر اُس رات میں ہر قیمت پر عورت کی صحبت چاہتا تھا' اس لیے میں نے کمرے میں واپس جا کر پستول اُٹھایا اور قسمت آزمانے نکل کھڑا ہوا۔

رات گئے جب میں اُس فربہ اندام لڑکی کے پاس پہنچا تو میری جیب میں پستول تھا اور میری چال

میں خوداعتمادی تھی.....نزدیک سے دیکھنے پر وہ لڑکی مجھے اپنے پڑوسی سارجنٹ کی بیوی جیسی دکھائی دی۔ میں اس بات سے بہت خوش ہوا' کیونکہ مجھے عرصے سے اپنے پڑوسی کی بیوی عریاں دیکھنے کی حسرت تھی۔

ہمیں جس کمرے کی چابی دی گئی وہ ہوٹل کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا' مگر لڑکی اپنے بھاری بدن کے باعث سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تھک گئی اور گہرے سانس لینے لگی۔ پانچویں منزل تک پہنچ کر وہ بے حال ہوگئی اور دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر جھک گئی۔ کمرے کی چابی اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔

''اتنی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تو کوئی بھی تھک جائے گا۔'' خفت مٹانے کے لیے اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور جب تک کمرے کی تمام بتیاں روشن نہیں کر لیں ایک ہاتھ سے اپنا پستول تھامے رکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں صابن کا ایک چھوٹا سا چوکور ٹکڑا تھا۔ یہ مختصر سا صابن بے معنی تھا۔ میں نے گھوم کر موٹی لڑکی کو دیکھا۔ اُس کا سانس ہموار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ فحش انداز میں دبا کر میری طرف بڑھی۔ میں نے فوراً اُسے پیچھے دھکیل دیا۔

''کپڑے اُتارو!'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اُس نے حیرت سے میری جانب دکھا اور کپڑے اُتارنے لگی۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اس نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ معلوم نہیں کیوں ایسے موقعوں پر میرا تمباکو نوشی کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اوپر کے کپڑے اتار کر وہ ساکت کھڑی ہوگئی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''رینی''

''ٹھیک ہے۔ رینی جلدی کرو۔ میں انتظار کر رہا ہوں''

''تم کپڑے نہیں اُتارو گے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''میری فکر مت کرو''۔ میرے لہجے میں تندی آ گئی۔ ''ننگی ہو جاؤ۔ فوراً چند لمحوں میں وہ مکمل برہنہ ہوگئی۔

''تو تم کاہل عاشق ہو'' اس نے اپنے لہجے میں مصنوعی پیار بھر کر کہا۔

''تم چاہتے ہو کہ تمہاری محبوبہ ہی سب کچھ کرے''۔ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ
آ کر مجھ پر جھکنے لگی۔

''پرے ہٹو''۔ میں نے ایک بار پھر اُسے دھکا دیا۔

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم کیا چاہتے ہوں؟ میں کیا کروں؟'' وہ چیخ پڑی۔

''کچھ نہیں۔ چلو۔ چل کر دکھاؤ''۔

وہ خاموشی سے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلنے لگی۔

عریاں حالت میں چل کر دکھانا عورت کی بے عزتی ہے۔ اسے اُس سے اذیت پہنچتی ہے۔ مجھے بہت لطف آرہا تھا۔ موٹی لڑکی میرے حکم پر ننگی ہو کر سر جھکائے آگے پیچھے چل رہی تھی۔ اور ہتک کے خیال سے سرخ ہو رہی تھی۔ بالآخر اُس نے میری طرف دیکھا اور کچھ کہنے کی خاطر کہا۔ ''اچھی لگ رہی ہوں؟'' ''تمہیں میرا جسم پسند ہے؟''

''فضول باتیں مت کرو۔ چلتی رہو''

''بات سنو''۔ اب اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ ''میں جانور نہیں ہوں۔ میں تھک گئی ہوں''

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اُس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر بال تھے۔ اچانک میں نے اُس سے ایک بات کہی جس سے وہ شرما گئی ''خبیث آدمی'' اُس نے جھینپ کر جواب دیا' اور میں بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ لیکن جب اُس نے بستر سے اپنے کپڑے اُٹھائے تو میں چونک گیا۔

''سنو'' میں نے یکلخت سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''میں تمہیں معاوضہ ادا کروں گا۔ مگر میری رقم کے بدلے مجھے کچھ ملنا چاہیے''۔

''بہت ہو گیا۔ سمجھے'' اُسے غصہ آ گیا ''مجھے نہیں معلوم تم کیا چاہتے ہو میں یہاں تماشہ بننے نہیں آئی تھی۔ تمہارے دماغ میں......''

میں نے پستول نکال لیا' اور اس کی آواز دم توڑ گئی۔ خوف زدہ ہو کر اُس نے کپڑے واپس بستر پر رکھ دیے۔

''چلو'' میں نے پستول لہرا کر کہا۔ ''چلتی رہو حرامزادی۔''

اس مرتبہ وہ چپ چاپ چلتی رہی۔ وہ سہم گئی تھی۔ بعد میں، میں نے اس سے مضحکہ خیز ورزشیں بھی کروائیں۔ اور پھر اُسے معاوضہ ادا کر دیا۔ ''میں نے تم سے رقم کے برابر ہی مزدوری کروائی ہے''۔ یہ کہہ کر میں اسے عریاں حالت میں چھوڑ آیا۔ مجھے پیسے خرچ کرنے کا قطعی افسوس نہیں تھا۔ وہ مجھ سے مل کر حیرت زدہ رہ گئی تھی اور کسی طوائف کو حیران کرنا معمولی بات نہیں تھی۔

''یہی تو میں چاہتا ہوں''۔ میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے سوچا۔ ''کہ پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دوں۔''

اس رات میں بچوں کی طرح خوش تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں رکھی صابن کی چھوٹی سی چوکور ٹکیا جیب میں ڈال لایا تھا۔ گھر آ کر میں نے اُسے دیر تک نلکے کی دھار میں ہاتھوں پر رگڑتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ اُس ٹافی جیسی ہو گئی جسے آخری حد تک چوس لیا گیا ہو۔

لیکن اُس رات میں سوتے سے اچانک جاگ اُٹھا۔ اور میری نظروں کے سامنے موٹی لڑکی کا چہرہ گھومنے لگا' اور وہ لمحہ جب اُس کی آنکھیں میرا پستول دیکھ کر حیرت سے پھیلی تھیں' اور اس کا جھریوں بھرا موٹا پیٹ جو ہر قدم پر اُچھلتا جاتا تھا۔ اچانک مجھے بہت پچھتاوا ہوا اسے گولی نہ مارنا میری نادانی تھی مجھے اُسی لمحے اُسے ہلاک کر دینا چاہیے تھا جب میں اُس پر حاوی ہو چکا تھا......اور پھر صبح کی روشنی پھیلنے تک میں سو نہیں سکا۔ مجھے اُس کی ناف کے گرد چھ سوراخ نظر آ رہے تھے۔

اُس دن کے بعد میں پستول کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں بازار میں چلتے ہوئے لوگوں کو پیچھے سے دیکھتا تھا اور ان کی چال سے اندازہ لگاتا تھا کہ گولی لگنے کے بعد وہ کس طرح زمین پر گریں گے۔ رات کے نو بجے میں تھیٹر کے باہر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ڈرامہ ختم ہوتا تو لوگ قطار در قطار باہر نکلتے۔ ان کی آنکھیں رومانی منظروں سے بھری ہوتیں۔ ان کے دل میں اب تک ہمدردی کے جذبات موجزن ہوتے۔ ان میں سے کئی ایسے ہوتے جو باہر نکل کر دائیں بائیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ انہیں چکا چوند کرتی روشنیاں عجیب لگتی تھیں۔ پھر وہ مخصوص انداز سے زیرِ لب مسکراتے تھے۔

وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں آ رہے تھے۔ میں دوسری دنیا میں ان کا منتظر تھا۔ اس موقع پر میں جیب میں ہاتھ ڈالتا اور اپنے پستول کو پوری قوت سے تھام لیتا۔ چند لمحوں بعد میں خود اُن پر گولیاں برساتے دیکھتا۔ جنہیں گولیاں لگتیں وہ مٹی کے برتنوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اچھل جاتے' باقی ماندہ چیخیں مارتے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے۔ پیچھے رہ جانے والے شیشے

کے دروازوں کو توڑتے واپس تھیٹر میں پناہ لیتے۔ میں اس ہیجان انگیز تصور سے پلٹتا تو میرے ہاتھ پسینے سے تر ہوتے اور مجھے اپنی سانس درست کرنے میں وقت لگتا تھا۔

میں عورتوں کو جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں اُن کے گردوں کو چھلنی کرنا چاہتا تھا۔ یا ان کی پنڈلیوں میں گولیاں مارنا چاہتا تھا تاکہ وہ گرنے سے پہلے رقص کریں۔

ہر چند کہ میں نے ابھی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں کب اور کہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے ایک نشانہ بازی کے کلب میں داخلہ لے لیا تھا۔ جہاں میں روزانہ شام کو مشق کرنے جاتا تھا۔ میں بہت اچھا نشانہ باز ثابت نہیں ہوا تھا۔ لیکن کلب میں دیے گئے نشان کے مقابلے میں زندہ انسانوں کے بدن کہیں بڑے ہدف ہوتے ہیں اور خاص طور پر جب انہیں نزدیک سے گولی ماری جائے تو نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ اگر میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کو گولیوں سے اُڑانا شروع کردوں تو میری کامیابی کے امکانات سو فیصد ہوسکتے ہیں۔ چھٹی کے وقفے کے بعد صبح کے وقت دفتر میں ماحول بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ سب دستانے اتار کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ عادت بُری لگتی ہے۔ وہ دستانے اتارتے ہوئے ایسی بے شرمی سے ایک ایک کر کے انگلیاں ننگی کرتے ہیں کہ کراہت محسوس ہوتی ہے۔ میں ہاتھ ملاتے ہوئے دستانے نہیں اتارتا۔ میرے خیال میں انہیں گولیاں مار کر ڈھیر کرنے کا سب سے مناسب وقت یہی ہے جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے دستانے اتارنے میں مصروف ہوں۔

گزشتہ سوموار کو ہماری گفتگو کا موضوع فلمی اداکارائیں اور اُن کا عالمگیر حُسن تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے مرد ہیرو پسند ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ فلموں کے اداکار ہوں۔

''کس طرح کے ہیرو؟'' میسے نے پوچھا۔

''جنہیں اُن کے سیاہ کارناموں پر دوام حاصل ہو'' میں نے جواب دیا۔

''سیاہ سے کیا مراد ہے؟''

''سیاہ یعنی کالا' جیسے کالا جادو' کالا ہیرو' جو بربادی پھیلا دے''

''لاقانونیت کا حامی؟''

''نہیں'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لاقانونیت کے حامی کالے ہیرو نہیں ہوسکتے۔ انہیں اپنے انداز میں انسانوں سے محبت ہوتی ہے''۔

''تب تو تمہارا مثالی کردار کوئی پاگل آدمی ہوگا''۔ لیمی شر نے کہا۔

''میں سمجھ گیا'' میسے جو تاریخ کا طالب علم تھا میرے جواب دینے سے پہلے بول پڑا۔

''تمہارا ہیرو ایروسٹریٹس'' کی طرح کا کوئی آدمی ہوگا۔

''ایروسٹریٹس'' تاریخ میں دوام حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کوئی ایسا کام نہیں کر پاتا تھا جو اس کی شہرت کا سبب بنے۔ بالآخر اُس نے ''ایفی سس'' کی عبادت گاہ کو جو دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک تھی جلا کر راکھ کر دیا۔''

''اور اس آدمی کا نام کیا تھا جس نے وہ عبادت گاہ تعمیر کروائی تھی؟''

''میں نہیں جانتا''۔ میسے نے اعتراف کیا۔ ''غالباً کوئی بھی نہیں جانتا''۔

''لیکن تم ''ایروسٹریٹس'' کا نام جانتے ہو جس نے اُسے آگ لگائی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تو ظاہر ہے کالا ہیرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا''۔

اس مکالمے پر گفتگو ختم ہو گئی۔ میں اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا' اور دل میں یہ سوچ کر لطف اندوز ہوتا رہا کہ جب وقت آئے گا تو انہیں میری بات کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ میں نے پہلے کبھی ''ایروسٹریٹس'' کا نام نہیں سنا تھا۔ مگر اُس کی کہانی نے میری ہمت بڑھائی۔ اُس کو دنیا سے رخصت ہوئے دو ہزار سال گزر گئے تھے مگر اُس کا نام سیاہ ہیرے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرا نام بہر حال اتنے عرصے پر محیط نہیں ہو سکے گا۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کم عرصے کے لیے بہت مشہور ہونا بھی اپنا ایک مزہ رکھتا ہے۔ یہ شہابِ ثاقب جیسا مقدر ہے کہ چند لمحوں کے لیے چمک کر آدمی اس قدر تاثر چھوڑ جائے کہ دیکھنے والوں کو وحشت ہونے لگے۔ اس روز میں سڑک پر آیا تو مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی قوت کا احساس ہوا۔ میرے پاس میرا پستول تھا۔ اور پستول کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی...... یہ زوردار آواز سے چیزوں میں سوراخ کر دیتا ہے۔ لیکن اُس روز میرا اعتماد فقط پستول کے سبب سے نہیں تھا۔ مجھے خود اپنا وجود دور تک تباہی پھیلانے والا ہتھیار معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں لاقانونیت کو انتہا تک پہنچا دینے والا شخص ہوں۔ میں اپنے بارودی وجود کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں' اور مقررہ وقت پر سلگتا ہوا مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ایک فلک شگاف دھماکا ہو گا' اور میں اور بادشاہ اور اُس کے حفاظتی دستے کے سپاہی ہوا میں اچھل کر عضو عضو بکھرے دکھائی دیں گے۔

اس دن کے بعد میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ میں تمام دن سڑکوں پر ان لوگوں کو دیکھتا رہتا جنہیں

میں نے گولیوں سے چھلنی کرنا تھا۔ پھر ایک صبح میں نے یہ خط لکھا اور اس کی ایک سو دو نقول بنا کر ایک سو دو لفافوں میں ڈالیں۔ اس خط میں' میں نے ملک کے ادیبوں کو خطاب کیا تھا۔

جنابِ عالی:

آپ ایک مشہور ادیب ہیں۔ آپ کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ خوش قسمت ہیں' کیونکہ جو انسانوں سے محبت کرتا ہے وہ دوسرے انسانوں میں شامل ہو کر اپنے وجود کو وسعت عطا کرتا ہے۔ آپ جیسی ہمدرد طبیعت والا آدمی' دوسرے آدمی کو دیکھتے ہی اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ دوسرے کے اعضا کی ساخت دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کی ٹانگوں اور بازوؤں سے ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر اسے دلی مسرت ہوتی ہے کہ وہ اس کے اپنے اعضا کی طرح ہی حرکت کرتے ہیں اور پھیلتے اور سکڑتے ہیں اور کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ تو آپ کے لیے بطورِ خاص تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ اُنگلیاں ہیں' اور جب وہ چائے کی پیالی اُٹھاتا ہے تو اس کے ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا ایک مخصوص شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ شکل انسانی ہاتھ سے وابستہ ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں اسے بیان کیا ہے۔ کوئی جانور' چاہے وہ کتنا ہی ذہین ہو اس طرح کی چیزوں کو گرفت میں نہیں لے سکتا۔ اس گرفت میں ذہانت کے علاوہ تخیل بھی ہے۔ گہرائی اور دور اندیشی ہے۔ آپ کو انسان اچھے لگتے ہیں' اسی لیے آپ ان سے خطاب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اسی لیے انسان قطار در قطار آپ کی کتابیں خریدتے ہیں۔ وہ انہیں گھر لے جا کر آرام کرسیوں پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں' اور آپ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس دوران وہ اپنی بدنصیبی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اپنی بدصورتی کو بھول جاتے ہیں۔ محرومیوں اور معذوریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہیں یاد نہیں رہتا کہ ان کے گھر والے اُن سے نفرت کرتے ہیں۔ اور یکم جنوری کو ان کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔

ممکن ہے آپ کو خیال آئے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جسے انسانوں سے محبت نہ ہو۔ میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ مجھے انسانوں سے اتنی کم محبت ہے کہ میں بہت جلد چھ آدمیوں کو ہلاک کر کے منہ کے بل گرانے والا ہوں۔ فقط چھ کیوں؟ اس لیے کہ میرے پستول میں اتنی ہی گولیاں ہیں۔ بہر حال چاہے میں صرف چھ آدمیوں کو قتل کروں' لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے تمام انسانوں سے نفرت

ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ مگر میں کیا کروں کہ آپ کو انسانوں کی جو چیزیں پسند آتی ہیں، مجھے انھی سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آدمیوں کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اب یہ میرا قصور ہے کہ مجھے چارہ کھاتے مویشی کم مکروہ معلوم ہوتے ہیں؟ اور جب کوئی تمیز کا مظاہرہ کرتے ہوئے منہ بند کر کے نوالہ چباتا ہے تو اس کے دونوں گالوں کے نیچے جبڑے کی ہڈیاں یوں لرزش کرتی ہیں جیسے کوئی خاص بات نہیں ہے مگر مجھے تو متلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ مجھے کیا معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے! میں اسی طبیعت کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ باقی تمام چیزوں کے بارے میں لوگوں کو ذاتی رائے رکھنے کا حق ہے مگر انسان سے محبت سب پر فرض کر دی گئی ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ ہی دیکھا ہے کہ جسے انسان سے محبت نہ ہو اُس کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے مجھے بھی مجبور کیا گیا کہ میں اُسے پسند کروں جسے میں پیدائشی طور پر ناپسند کرتا ہوں۔ مگر انسان کے بارے میں جو کچھ میرے ذہن میں آیا میں اس کا اظہار کرتا رہا۔ اگر میں اپنی سوچوں کو اپنے تک محدود رکھتا تو بہت جلد وہ خیالات چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی شکل اختیار کر کے میرے دماغ کو اپنی غذا بنا لیتے۔ خاموشی اختیار کرنے پر مجھے کئی بار اپنے سر میں ہزاروں سوئیاں چبھتی محسوس ہوئی تھیں...... انسانوں کے وجود سے مجھے اذیت پہنچی ہے۔ اس لیے جب میں اپنا پستول اُٹھا کر نیچے جاؤں گا تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میرا عمل حق بجانب نہیں تھا۔

بس اس بات کا خیال رکھیے گا کہ اخبارات بازاری زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھیں گے کہ ''ایک جنونی شخص نے غصے کے عالم میں چھ آدمیوں کو سرِ بازار ہلاک کر دیا'' اب کم از کم آپ تو یہ جانتے ہیں کہ میں جنونی نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے غصہ آتا ہے۔

مخلص

پال ہل برٹ

خط مکمل کرنے کے بعد میں کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اپنے ارادے کو حتمی شکل دینے کے لیے مجھے یکسوئی درکار تھی۔ آئینے میں اپنی بدلتی ہوئی شکل دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ میری آنکھیں بڑی ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ عرصے بعد میرے چہرے پر صرف آنکھیں رہ جائیں گی۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے میری آنکھیں سیاروں کی طرح گردش کرتی نظر آتیں۔ مجھے یقین تھا کہ چھ آدمیوں کو منہ کے بل گرانے کے بعد میرا چہرہ مزید تیزی سے بدلے گا۔ میں نے ان دو لڑکیوں

کی تصویریں دیکھی تھیں جنہوں نے اپنی مالکہ کو ہلاک کرکے اُس کا گھر لوٹ لیا تھا۔ جرم کا ارتکاب کرنے سے پہلے ان کے چہرے حفظانِ صحت اور ایمان داری کے اصولوں پر عمل کرنے والوں کے چہروں کی طرح چمک رہے تھے۔ دیکھنے والوں کو فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ بہنیں ہیں اور گھر سے خاص طور پر فوٹو کھنچوانے کے لیے تیار ہو کر فوٹو گرافر کی دکان پر آئی ہیں۔ جرم کے بعد کی تصویر میں ان کے چہرے پر خوف کی جھریاں اور آنے والے وقت کے سائے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے خون آلود پنجوں والا کوئی درندہ ان کے چہروں پر فراغت سے گھومتا رہا ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں کی آنکھوں کا تاثر ایک دوسرے سے جدا تھا۔ ایک ہی جرم میں ملوث دو مجرموں پر ان کے یکساں عمل نے مختلف اثرات مرتب کیے تھے۔

''اگر ایک اتفاقیہ جرم ان دونوں پر اس قدر اثر انداز ہوا ہے''۔ میں نے خوشی سے سرشار ہو کر سوچا۔ ''تو میرا جرم جو اتنی گہری سوچ بچار کا حامل ہے میری شباہت میں کیا کیا تبدیلیاں لائے گا۔ ممکن ہے یہ میری تمام بدصورتی کو خوش شکلی میں بدل دے۔ میری زندگی بھی دو واضح حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ جرم سے پہلے اور جرم کے بعد......'' میں نے اپنے سامنے ایک سیاہ ہیرا جگمگ کرتے دیکھا۔ اس ہیرے سے نکلنے والی نور کی شعاعوں نے مجھے ایک عجیب کیف سے آشنا کیا۔

بالآخر میں نے اوڈیسا کے چوک پر قتل عام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سڑک پر بھگدڑ مچنے سے میں شاہراہِ ایڈگر کی سمت نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب تک ہجوم اپنے مُردے اُٹھاتا میں ایڈگر سے ملحقہ آبادی میں پہنچ جاؤں گا۔ اُس کے فوراً بعد ڈیلمبر کی پُر پیچ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' اور وہاں سے میرے گھر تک کا فاصلہ چند لمحوں کی بات ہے۔ میرا تعاقب کرنے والے شاہراہِ ایڈگر پر بھٹک جائیں گے۔ اور ڈیلمبر کی گلیوں میں انہیں صبح ہو جائے گی۔ میں اپنے کمرے میں اُن کا انتظار کروں گا' اور جب آخر کار وہ میرے دروازے تک پہنچ جائیں گے تو میں اپنا پستول دوبارہ بھروں گا اور اس سے پہلے کہ اُن کے ہاتھ میری گردن تک پہنچیں میں پستول کی نالی اپنے منہ میں رکھ کر گولی چلا دوں گا۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے اپنی جمع پونجی دل کھول کر خرچ کرنی شروع کر دی۔ کھانے پینے کا معیار بڑھا دیا۔ اور مستقبل کی فکر سے آزاد ہو گیا۔

اکتوبر کی 27 تاریخ کو شام چھ بجے میرے پاس فقط دو وقت کے کھانے کی رقم باقی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا پستول اُٹھایا اور ایک سو دو خط کا پلندہ بھی ساتھ لیا جو مجھے ملک کے مختلف ادیبوں کو روانہ

کرنے تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کُھلا رکھا تا کہ واپسی پر مجھے اندر داخل ہونے میں قطعی تاخیر نہ ہو۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اور سر کی جانب خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں پسینے میں بھیگ رہے ہیں۔

شاہراہ پر حسبِ معمول لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کچھ میری راہ کی رکاوٹ بنے' کچھ نے مجھے آگے کی سمت دھکیلا اور کچھ کی کہنیاں میرے پہلوؤں کو چھیلنے لگیں۔ میں نے خود کو اُن کے حوالے کر دیا اور اُن کی زد میں آ کر دائیں بائیں لہراتا ہوا چلنے لگا۔ اچانک انسانوں کے اس سمندر میں مجھے اپنا وجود خوفناک حد تک بے بس اور تنہا محسوس ہوا۔ ''یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں''۔ مجھے خیال آیا۔ ''اگر انہیں میرا ارادہ معلوم ہو گیا تو یہ چند لمحوں میں مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا ہتھیار استعمال کروں یہ مجھ پر قابو پا لیں گے۔ اور اس کے بعد میں ان کی ٹھوکروں پر اُچھلتا جاؤں گا۔ ہر اچھال کے بعد میں زیادہ چھلنی اور نڈھال ہو کر ان کے پھیلے ہوئے پنجوں پر واپس گروں گا اور ہر بار یہ زیادہ شدت سے مجھے واپس ہوا میں پھینک دیں گے۔ میں بوٹی بوٹی بکھرتا رہوں گا اور یہ قہقہے لگائیں گے۔ ''دیکھو یہ ہمیں ہلاک کرنے نکلا تھا۔ اس کی وقعت کیا ہے...... کیا حیثیت ہے اس کی؟ اس کی آنکھیں نوچ لو''۔ میں نے اپنے ارادے کو دوسرے دن کے لیے ملتوی کیا۔ اور اپنی سانسوں کو درست کرتا ایک ریسٹوراں میں داخل ہوا' اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ باہر آ کر نہ جانے کیوں میں نے اپنی باقی ماندہ رقم ایک نالی میں پھینک دی۔

اس کے بعد میں پورے تین دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا' اور اس دوران میں نے پلک نہیں جھپکی۔ کھڑکی کے پردے نہیں ہٹائے۔ نیچے نہیں جھانکا۔ آخر میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت باہر روشنی پھیلی ہے یا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تیسرے دن کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے سانس روک لی۔ میرا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ دوبارہ دستک پر میں ایڑیوں کے بل چلتا گیا اور دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ لیکن کالے کپڑے پر ایک سفید بٹن کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہیں آیا تیسری دستک پر مجھے محسوس ہوا جیسے میں فرش پر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ مگر پھر اچانک ہی وہ چلا گیا...... یا چلے گئے۔ اُس رات میں نے خوش کُن خواب دیکھے۔ سرسبز و شاداب وادی۔ شفاف بہتا پانی۔ تنہا عبادت گاہ اور اُس پر پھیلا ہوا بے داغ نیلا آسمان۔ تمام رات میں وقفے وقفے سے اُٹھ کر پانی پیتا رہا۔ صبح کے قریب میں نے موٹی طوائف کو دیکھا۔ وہ اُس فلک بوس محل میں قید تھی جو میں نے شہر کے مضافات میں خاص طور پر اُس کے لیے تعمیر کرایا

تھا۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک عریاں تھی۔ میں نے اپنا پستول نکال کر اُسے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنے کا حکم دیا اور پھر اُسے گھوڑے کی طرح دوڑنے پر مجبور کیا۔ آخر میں اُسے میں نے محل کے مرکزی ستون سے باندھ دیا اور اُس کے سامنے اپنا موقف تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اُس کے چمبیلے بدن پر اپنا پستول خالی کر دیا...... ان خیالات نے میرے پورے بدن پر ارتعاش طاری کر دیا، اور بالآخر میں نے مُشت زنی کے ذریعے خود کو تسکین پہنچائی۔ اس کے بعد میں خالی الذہن ہو کر دیر تک اندھیرے میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ میں نے فرنیچر کے چٹخنے کی آوازیں سنیں۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا اور ہر قیمت پر کمرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا، مگر مجھے سڑک پر چلنے والے لوگوں کے تصور سے خوف آ رہا تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میری بھوک ختم ہو گئی۔ مگر مجھے بے تحاشا پسینہ آنے لگا۔ میری قمیص بھیگ کر بدن سے چپک گئی۔ شاید باہر دھوپ پھیل چکی تھی۔ جب میں نے خود کو دوسرا شخص تصور کیا...... ''وہ اپنے کمرے میں تاریکی اوڑھے پڑا ہے''۔ میں نے سوچا۔ ''تین دن سے اُس نے نہ کچھ کھایا ہے نہ ہی وہ ایک پل کو سویا ہے۔ اُنہوں نے اُس کے دروازے پر دستک بھی دی لیکن وہ اُن کا سامنا نہیں کر سکا۔ مگر بہت جلد وہ سڑک پر جائے گا اور چاروں سمت بربادی پھیلا دے گا۔ ہلاکت برپا کر دے گا''

غالباً شام کا وقت تھا جب مجھے دوبارہ شدید بھوک کا احساس ہوا۔ اس مرتبہ بھوک کے ساتھ ساتھ غصہ کا جذبہ بھی اُبھرا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے جلد از جلد عملی طور پر کچھ نہ کیا تو میں غصے سے پاگل ہو جاؤں گا۔ میں فرنیچر سے ٹھوکریں کھاتا اِدھر اُدھر بھاگا۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن کیں اور وجود کی تمام بچی کھچی طاقت سمیٹ کر بلند آواز سے گنگنانے لگا۔ بدن کی لرزش کم ہوئی تو میں نے ہاتھ دھوئے اور ایک نئے عزم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ڈاک کے بکس میں ایک سو دو خط ڈالنے میں مجھے تقریباً دو منٹ لگے۔ میں نے دس دس لفافے ایک ساتھ ڈالے اور ان کے گرنے کی آوازیں سنیں۔ جلد بازی کے باعث چند لفافے یقیناً شکن آلود ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میں مرکزی شاہراہ پر اوڈیسا کے چوک تک چلتا گیا۔ چوک کی ایک دکان پر لگے شیشے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آیا تو میں نے خود کو یقین دلانے کے لیے کہا۔ ''آج کی رات؟''

چوک پر نصب جلتی بجھتی روشنیوں کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے مناسب موقع کا انتظار شروع کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا بدن بالکل سرد ہونے کے باوجود پسینے میں ڈوب رہا تھا۔ دو عورتیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گزریں۔ میں نے انہیں جانے دیا۔ مجھے ایک ساتھ چھے آدمیوں کی تلاش

تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے تین آدمی آتے دیکھے۔ یہ بھی میرے لیے بے کار تھے ساڑھے سات بجے کے قریب دو ٹولیاں بہت کم فاصلے پر چہل قدمی کرتی دکھائی دیں۔ آگے چلنے والے مرد اور عورت کے ساتھ دو بچے تھے اور ان کے پیچھے تین بوڑھی عورتیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ عورت غصے سے بچے کا بازو جھٹک رہی تھی۔ مرد بھی کسی بات پر بچے سے خفا تھا۔

''اس حرامزادے کو عقل کب آئے گی''۔ اُس نے بپھر کر کہا۔

میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا کہ میرے بازوؤں میں درد شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے پستول پر گرفت سخت کر دی اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''آگے سے تو ہٹو''۔ مرد نے مجھے ایک طرف دھکیلتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

مجھے یاد آیا میں آتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ غلطی سے بند کر آیا ہوں' اور اب واپسی پر میرے چند نہایت قیمتی لمحے دروازہ کھولنے میں ضائع ہو جائیں گے۔ میں جھنجھلا گیا دروازے کے خیال سے چونکا تو دونوں ٹولیاں آگے جا چکی تھیں۔ میں اُن کے پیچھے گیا۔ مگر اب میرا ارادہ کمزور ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ آٹھ بجے کے بعد نو بجے کا وقت بھی آ گیا۔ ''میں ان لوگوں کو کیوں ماروں جو پہلے سے مرے ہوئے ہیں؟'' مجھے خیال آیا اور میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے ہنسوں۔ ایک آوارہ کتا اندھیری گلی سے نکل کر میرے پاؤں سونگھنے لگا۔

ایک لمبا چوڑا آدمی میرے سامنے سے گزرا' اور میں چھلانگ مار کر اُس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ وہ بلند آواز سے سانس لیتا اُچھل اُچھل کر چلتا رہا۔ میں اُس کی گدّی پر پڑنے والا بل دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا پستول نکالا۔ رات کی سردی بڑھ چکی تھی' اور مجھے ہلکی ہلکی متلاہٹ ہو رہی تھی۔ مجھے واضح طور پر یاد ہی نہیں رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کبھی میں پستول کو دیکھتا اور کبھی میری نظر سامنے چلنے والے موٹے آدمی کی گردن کے بل پر پڑتی۔ اُس بل کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی تلخی سے مسکرا رہا ہو۔ مجھے محسوس ہوا جیسے موٹا آدمی پشت کی جانب سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنا پستول کسی نالے میں پھینک کر گھر چلے جانا چاہیے کہ اچانک موٹے آدمی نے گھوم کر مجھے دیکھا۔

''......میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ......'' میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اُسے کہا۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ...... کہ شاہراہِ گائیٹ تک پہنچنے کے لیے کون سا......کون سا راستہ اختیار کرنا

چاہیے۔" میں نے زندگی میں کبھی کوئی جملہ ادا کرنے کے لیے اتنی طاقت استعمال نہیں کی تھی۔
اُس نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کی جانب بڑھایا۔ میں نے ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر کہا۔ "اصل میں مجھے معلوم کرنا تھا کہ......"

اچانک مجھے یقین ہو گیا کہ میں خوف سے چیخنے والا ہوں۔ میں نے چیخ دبانے کے لیے سختی سے منہ بند کیا اور گولی چلا دی۔ میں نے اُس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے تین گولیاں پیوست ہوتے دیکھیں، وہ زمین پر گرنے سے قبل گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور چند لمحوں تک عجیب احمقانہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔
"حرامزادے......" میں نے اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ "کمینے! ذلیل!"
اُس کی خرخراہٹ سن کر میں ہوش میں آ گیا اور یکلخت پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔ ساتھ ہی قدموں اور چیخوں کا طوفان بلند ہوا۔ "کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔ "لڑائی ہو گئی؟" پھر فوراً کوئی چیخا۔ "قتل......قتل ہو گیا"۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ان چیخوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس طرح بچپن میں آگ بجھانے کے لیے جانے والی گاڑیوں کی آوازیں......وہ خوفناک آوازیں ہوتی ہیں مگر گھر کے آنگن میں کھیلتے بچے سے ان آوازوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا......میں پوری طاقت سے بھاگتا رہا۔ اور اس دوران مجھ سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ میں ایک غلط گلی میں داخل ہو گیا اور پھر مرحلہ وار مزید بھٹکتا گیا۔ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اُس وقت تک میں ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں سے گھر کی جانب سعی کرنا ناممکن تھا۔ میں ہجوم میں پھنس چکا تھا۔
ہر موڑ پر حیرت زدہ آنکھوں والے سیکڑوں چہرے میری سمت گھوم رہے تھے۔ (ایک عورت کا چہرہ مجھے یاد ہے۔ اُس کے گالوں پر غازے کی دبیز تہہ تھی، اور سر پر زیبائشی ہیٹ تھا) اور میرے عقب میں وہ تھے جو پہلے چوک سے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ "قتل! گولی! قاتل!" ان کی چیخیں نئے لوگوں کو فوراً اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیتی تھیں۔ اچانک میں تھکنے لگا۔ اسی لمحے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے اندر کا وحشی بپھر گیا۔ میں نے پلٹ کر دو فائر کیے۔ چاروں سمت خوف زدہ آوازوں کا طوفان اُٹھا اور لوگ بکھرنے لگے۔ میں بھاگ کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میرے راستے میں آنے والے کرسیاں اور کھانے پینے کی اشیاء سے لدے میز اُلٹتے چلے گئے۔ ہوٹل کی دوسری سمت کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹوائلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ صورتِ حال قابو میں تھی۔ میں مجمع کے ہاتھوں ٹکڑے نہیں ہونا چاہتا تھا، اور میرے پستول میں ایک گولی باقی تھی۔

ایک لمحہ گزر گیا' میری سانس بُری طرح اُکھڑی ہوئی تھی اور میرے ہانپنے کی آواز دروازے کے باہر سُنی جا سکتی تھی۔ ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا' جیسے تمام لوگوں نے کسی سازش کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو۔ میں پستول آنکھوں کے قریب لا کر اُس کی نالی کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے چھوٹے سے سیاہ سوراخ میں جھانکا''...... یہ وہ جگہ ہے جہاں سے گولی نکلے گی اور میرے سر کے پچھلے حصے میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار میں جا لگے گی۔ میں ان بازاری لوگوں کے ہاتھوں خود کو اذیت نہیں پہنچنے دوں گا۔'' یہ سوچ کر میں نے اطمینان سے بازوں سیدھا کیا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بے پناہ شور بلند ہوا۔ فرش پر جوتوں کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت بڑا ہجوم ہے۔ انہوں نے میرے بے قابو سانس کی آواز ضرور سن لی ہوگی۔ کسی نے دروازے کے تالے کو گھما کر کھولنا چاہا۔ میں چاہتا تو اُسے بھی گولی مار کر منہ کے بل پھینک سکتا تھا۔ مگر پھر پستول میں میرے لیے کچھ نہ بچتا' اور میں کسی قیمت پر خود کو ان کے ناپاک ہاتھوں کے سپرد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کس چیز کا انتظار کر رہے تھے؟ اگر سب مل کر دروازے کو دھکا دیتے تو ایک لمحے میں مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ اس صورطمینان سے مرنے کا موقع دے رہے تھے۔ ان کی کمینگی واضح تھی۔

چند لمحوں بعد ایک آواز بلند ہوئی۔ ''دروازہ کھول دو۔ ضدمت کرو۔ کیا فائدہ؟ کچھ دیر سکوت طاری رہا' پھر وہی شخص بولا۔ ''اب تم کہیں نہیں جا سکتے۔ کیا فائدہ؟؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری سانس اب تک ناہموار تھی۔

''بالآخر مجھے خود کو گولی مارنی ہے۔'' میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا۔ ''اگر میں ان کے ہاتھوں میں چلا گیا تو یہ مجھ سے خوفناک سلوک کریں گے۔ میرے دانت توڑ ڈالیں گے۔ میری آنکھیں نوچ کر فرش پر پھینک دیں گے۔ میں ان کی ٹھوکروں پر اُچھلتا ہوا دور سے نظر آؤں گا''۔

شاید اب وہ دروازہ توڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ فرش پر کسی بھاری چیز کے گھسیٹے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں فوراً پستول کی نالی منہ میں رکھ کر خود کو گولی مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے پستول پر دانت گاڑ دیے۔ لیکن تمام تر کوشش کے باوجود میں گولی نہیں چلا سکا۔ میں نے پورا زور لگایا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا' مگر میری اُنگلیاں کام کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ میں ڈر گیا تھا۔

میں نے پستول پرے پھینکا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

جین پال سارتر

دیوار

آخرکار انہوں نے ہمیں ایک بڑے سفید کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز کے پیچھے چار آدمی سر جھکائے کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے۔ کمرے کے کونے میں بہت سے گرفتار شدگان سر جھکائے کھڑے تھے۔ پہلی قطار میں دو بھورے بالوں والے غیر ملکی قیدی تھے۔ ان کی شکلوں میں خاصی مماثلت تھی۔ غالباً دونوں فرانسیسی تھے۔ چھوٹی عمر والا غیر ملکی، خوف دور کرنے کے لیے بار بار اپنی پتلون کو کھینچ کر اوپر کر رہا تھا۔

کارروائی مکمل ہونے میں تقریباً تین گھنٹے صرف ہوئے۔ تھکن کے باعث میرا بدن نڈھال اور دماغ سوچنے سے عاری ہو چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک سردی کی شدت سے کانپنے کے بعد اب اس کمرے کی حرارت مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

سپاہی ایک ایک کر کے قیدیوں کو میز کے سامنے لے جا رہے تھے، جہاں ان سے کم و بیش یکساں باتیں پوچھی جا رہی تھیں۔

"پورا نام کیا ہے؟"

"کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے؟"

عام طور پر یہی دو سوال کئے جاتے۔ کبھی کبھی ان سوالات سے تجاوز کیا جاتا۔

"اسلحے کی تباہی میں تم بھی شریک تھے؟"

"نو تاریخ کی صبح تم کہاں تھے؟"

وہ جواب سننے میں زیادہ دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ سوال کرنے کے بعد وہ سامنے کھڑے قیدی کو غور سے دیکھتے اور پھر سر جھکا کر کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔

"تم انٹرنیشنل بریگیڈ کے لیے کام کرتے رہے ہو؟" انہوں نے ٹام سے پوچھا، اور جواب سنے بغیر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

جون سے انہوں نے صرف اس کے نام کی تصدیق چاہی اور پھر دیر تک کاغذوں پر کچھ تحریر کرتے

رہے۔

''میرا بھائی ان کے لیے کام کرتا رہا۔ میں نے کچھ نہیں کیا میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں۔ مجھے سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں''۔ جون بولتا رہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں بتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کے اعمال کا میں ذمہ دار نہیں ہوں''۔ جون کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک گارڈ اسے کھینچتا ہوا لے گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔

''ریمون کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم''

''چھ سے انیس تک تم نے اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا''

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے''۔

وہ سر جھکائے قلم چلانے لگا اور ایک گارڈ مجھے دھکیلنے لگا۔

بڑے کمرے میں ٹام اور جون دو گارڈز کے درمیان میرا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ ابتدائی کارروائی تھی یا مقدمہ ختم ہو گیا؟؟'' ٹام نے گارڈز سے پوچھا۔

''یہ مقدمہ تھا''۔ ایک گارڈ نے جواب دیا۔

''تو اب......اب کیا ہو گا؟''

''تمہاری کوٹھڑی میں فیصلہ سنا دیا جائے گا''۔

ہماری کوٹھڑی میں بے پناہ ٹھنڈ تھی۔ ہم نے ساری رات کانپتے ہوئے گزاری صبح کے وقت بھی درجۂ حرارت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جون تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ کم سنی اور نا تجربہ کاری کے باعث وہ خوف سے گنگ ہو گیا تھا۔ البتہ ٹام اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔

کوٹھڑی میں ایک بنچ اور چار کمبل پڑے تھے۔ عدالت سے آ کر ہم الگ الگ کمبلوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''غالباً ہم ٹھکانے لگ گئے''۔ ٹام نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر چھوٹا بلا وجہ ڈر رہا ہے۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے''۔

''کسے؟ جون کو؟ ہاں' یہ جوزے کا چھوٹا بھائی ہے۔ جوزے نے ان کے خلاف جان کی بازی لگادی ہے''
میں نے جون کی سمت دیکھا۔ وہ بدستور سکتے کے عالم میں دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔
کوٹھڑی کے جن سوراخوں سے صبح کی روشنی اندر آئی' اچانک انہی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے داخل ہو کر ہلچل مچادی۔ جون سردی سے کانپنے لگا۔
''خدا کی پناہ!'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔ ''میں تو سزا پانے سے پہلے سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا''۔
ٹام نے خود کو گرم کرنے کے لیے ورزش شروع کردی۔ ٹام مضبوط جسم کا مالک تھا مگر عمر ڈھلنے کے ساتھ اس کے بدن پر موٹاپے کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اسے ورزش کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کل کسی وقت اس کے فربہ وجود میں گولیاں اور سنگینیں یوں اتریں گی جیسے مکھن کی ٹکیہ میں چھری اُترتی ہے۔
شدید سردی کے باعث مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے بازو میرے وجود سے الگ ہو گئے ہوں۔ ایسے لمحوں میں مجھے اپنا جیکٹ یاد آتا۔ جو انہوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے سارے کپڑے اتروا کر سپاہیوں کو پہنا دیے تھے۔ اور ہمیں اس سوتی پاجامے کرتے میں ملبوس کر دیا تھا۔ جو ہسپتال کے مریضوں کا گرمیوں کا لباس ہوتا ہے۔
تھوڑی دیر ورزش کے بعد' ٹام سانس درست کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔
''کچھ گرمی آئی؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں'' اس نے برا منہ بنا کر کہا۔ ''مگر سانس پھول گیا''۔
آٹھ بجے کے قریب ایک فوجی افسر تین سپاہیوں کے ساتھ ہماری کوٹھڑی میں آیا۔
''ان تین کے نام کیا ہیں؟'' افسر نے ہمارے گارڈ سے سوال کیا۔
''ٹام' جون اور پابلو'' گارڈ نے جواب دیا۔
افسر نے عینک درست کی' اور ہاتھوں میں تھامی فہرست کو غور سے دیکھا۔
''ٹام......ٹام...... یہ ہے۔ ٹام' تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی ماردی جائے گی۔''
یہ کہہ کر وہ پھر فہرست پر جھک گیا۔
''اور......تم دونوں کو بھی۔ جون اور پابلو۔ سزائے موت'' اس نے فہرست پر انگلی پھیرتے

ہوئے کہا۔

''یہ ناممکن ہے'' جون چیخ پڑا۔

افسر نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''جون مریل۔''

''یہ...... یہاں تمہارا نام ہے''۔ افسر نے اطمینان سے تصدیق کی۔

''......اور تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے''

''لیکن میں نے کچھ نہیں کیا''۔ جون کی آواز میں وحشت تھی۔

افسر نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ہم دونوں کی جانب رُخ کر کے بولا'' کچھ دیر میں تم لوگوں کے پاس ایک ڈاکٹر آئے گا۔ اسے رات بھر تمہارے پاس رہنے کی اجازت ہے''۔

یہ کہہ کر افسر فوجی انداز میں ایڑیوں پر گھوم کے چلا گیا۔

''میں نے کیا کہا تھا''۔ ٹام فوراً بولا۔ ''ہم ٹھکانے لگ گئے ہیں''۔

''ہاں'' میں نے کہا۔ ''مگر چھوٹے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے''۔

میں نے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے چھوٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف کی زیادتی سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اور نقوش عجیب انداز میں مسخ ہو گئے تھے۔ اس کی یہ حالت مجھے بے چین کر رہی تھی۔ جس کے باعث مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ تین دن پہلے تک وہ محض ایک بچہ تھا لیکن اب وہ کسی دوسرے سیارے کی بوڑھی مخلوق لگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگر اسے رہائی مل بھی گئی تو وہ دوبارہ کبھی بچہ نہیں لگے گا۔ ممکن ہے وہ ہمدردی کا مستحق ہو لیکن مجھے ہمدردی کرتے ہوئے متلاہٹ ہوتی ہے۔ سزا سننے کے بعد وہ خاموشی سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ ٹام نے رحم کے جذبے سے مغلوب ہو کر اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا مگر اس نے خود کو نہایت شدت سے کونے میں سمیٹ لیا اور چہرہ بگاڑ کر ٹام کو گھورا۔

''اسے چھوڑ دو ٹام''۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''یہ دھاڑیں مارنے والا ہے''۔

ٹام چاہتا تھا کہ چھوٹے کو تسلی دے اس سے ہمدردی کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس عمل میں مصروف رہنے کے باعث خود اس کا دل بھی بہلا رہے گا۔ اور یوں وہ اپنے بارے میں سوچنے سے بچ

جائے گا۔ مجھے ٹام کی یہ حرکت بری لگ رہی تھی۔ میں نے بھی پہلے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔
پہلے کبھی موت واضح طور پر میرے سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ مگر اب جبکہ موت سامنے تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے جسم میں داخل ہوتی گولیوں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ مرنے سے پہلے چیخ مارنے کی فرصت ملتی ہوگی یا نہیں؟ تمام گولیاں جسم پار کرتی ہوئی دوسری سمت نکل جاتی ہیں یا......؟ مجھے جلدی نہیں تھی ان باتوں پر غور کرنے کے لیے میرے پاس تمام رات پڑی تھی۔
کچھ دیر بعد ٹام بھی خاموش ہوگیا۔ میں نے انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور چھت کے سوراخ سے ایک ستارہ چمکتے دیکھا۔ سرد اور شفاف رات کی ابتدا ہو چکی تھی۔
دروازہ کھلا اور دو گارڈز داخل ہوئے ان کے ساتھ بھورے بالوں والا ایک وردی پوش شخص تھا۔
''میں ڈاکٹر ہوں'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''جہاں تک ممکن ہوا' میں اس دردناک صورت حال میں آپ کی مدد کروں گا''۔
''تم کیا کرو گے؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔
''جو تم کہو گے۔ تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے خوش گوار بنانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں''۔ ڈاکٹر کے لہجے میں ہمدردی تھی۔
''تم ہمارے ہی پاس کیوں آئے؟ اور بہت سے ہیں۔ قید خانہ بھرا ہوا ہے''۔
''مجھے یہاں بھیجا گیا میں یہاں آگیا''۔ اس کی آواز دھندلا گئی۔ پھر وہ فوراً سنبھل گیا۔ ''تم سگرٹ پیتے ہو؟ میرے پاس سگرٹ ہیں سگار بھی ہیں''۔
''نہیں۔ شکریہ'' میں نے سگرٹ لینے سے انکار کر دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔
میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا اور پھر یکایک اس کی موجودگی سے لاتعلق ہوگیا۔ دونوں گارڈز فرش پر بچھے ایک کمبل پر بیٹھ گئے۔ طویل القامت گارڈ جس کا نام پیڈرو تھا اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا جب کہ دوسرا گارڈ نیند کے غلبے سے نجات حاصل کرنے کے لیے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔
میں نے پشت سیدھی کی اور اپنے دونوں ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ ٹام اپنا سر گھٹنوں پر رکھے

بیٹھا تھا۔ جون قابلِ رحم حالت میں تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھول رہے تھے۔
ڈاکٹر نے جون کی کلائی تھام کر اس کی نبض کی رفتار معلوم کرنی چاہی۔ جون نے خاموشی سے اپنا بازو ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیا۔ اور بدستور کھلے منہ کے ساتھ نتھنے پھلاتا رہا۔
معلوم نہیں کیوں میں ڈاکٹر کی اس حرکت پر جھنجھلا گیا۔ ''کتے کا بچہ'' میں نے خود کو بڑبڑاتے سنا۔ ''میرے پاس آیا تو حرامی کا جبڑا توڑ دوں گا''۔
وہ میرے پاس تو نہیں آیا۔ مگر جون سے فارغ ہو کر بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ میں حیران ہوا کہ وہ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے۔
''بہت ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے عجیب انداز میں مجھ سے پوچھا۔
''مجھے تو محسوس نہیں ہو رہی''۔ میں نے جواب دیا۔ لیکن وہ حسبِ سابق مجھے غور سے دیکھتا رہا۔
اچانک مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ میرا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ یہ عجیب انکشاف تھا۔ اس قدر سردی میں میرا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے سر کے بال گیلے ہو کر اکڑ گئے تھے۔ کپڑے جسم سے چپک گئے تھے۔ میں تقریباً ایک گھنٹے سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی اس حالت سے بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے دیکھے تھے اور سمجھ گیا تھا کہ میں خوف کی شدت سے پگھل رہا ہوں۔ وہ خاموشی سے میری اس حالت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ ڈاکٹر کا چہرہ نوچ لوں۔ میں اس ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اچانک مجھے میرا غصہ بے جا معلوم ہوا۔ اور میں نے خود کو لاتعلقی کی کیفیت طاری ہوتے محسوس کیا۔ میں نے کندھے اچکائے اور بنچ پر بیٹھ گیا۔
بینچ پر بیٹھ کر میں اپنے جسم کا پسینہ پونچھنے لگا۔ جلد ہی میرا رومال لبریز ہو گیا۔ مگر میرے بدن سے پسینہ بدستور نمودار ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے پسینہ خشک کرنے کی کوشش ترک کر دی اور خود کو ایڑی سے چوٹی تک بھیگتے محسوس کرنے لگا۔
''تم ڈاکٹر ہو۔ ہیں؟ یکلخت جون نے سوال کیا۔
''ہاں'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔
''بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے۔ ہیں؟''
''کب؟ اوہ۔ اس وقت۔ نہیں'' ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا۔

''سب کچھ جلدی ہو جاتا ہے''۔

''لیکن میں...... کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ کبھی کبھی...... کبھی کبھی دوسری مرتبہ بھی فائر کرنا پڑتا ہے''۔

''کبھی کبھی' ہاں پہلی مرتبہ چلائی جانے والی گولیاں اہم اعضاء کو چھوئے بغیر پار ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں۔ کبھی کبھی۔ ہاں''

''تو پھر وہ اپنی بندوقوں میں دوبارہ گولیاں بھرتے ہوں گے؟''

''ہاں''

''مگر اس وقت لگتا ہے'' چھوٹے کی آواز میں لرزش تھی۔ چھوٹا جسمانی اذیت کے خیال سے خوف زدہ تھا یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ مجھے ایسی کوئی تشویش نہیں تھی۔ پسینہ آنے کی کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

میں نے ٹام کی جانب نظریں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بھی پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ اس منظر سے بچنے کے لیے میں نے سر اٹھایا تو چھت کے سوراخ سے آسمان نظر آیا۔ کہکشاں اسی ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن آج ستارے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ جب میں اپنے گھر سے آسمان دیکھا کرتا تھا تو میرے احساسات اور ہوتے تھے۔ صبح کے وقت آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر مجھے بحرِ اوقیانوس کے روشن اور خوبصورت ساحلوں کا خیال آتا تھا۔ دوپہر کے وقت مجھے دور افتادہ جزیرے کا وہ چھوٹا سا مے خانہ یاد آتا جہاں منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لیے شراب کے ساتھ زیتون کا اچار پیش کیا جاتا تھا شام کے وقت جب سائے دراز ہوتے تو میں کھیل کے اس میدان کے بارے میں سوچتا جس کے نصف حصے میں چھاؤں پھیل جاتی تھی۔ اور نصف حصہ روشن رہتا تھا۔ اور جب مجھے خیال آتا کہ زمین بھی یوں ہی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی آسمان کی وسعت میں گھوم رہی ہے تو میرے سینے میں درد کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ مگر اس کوٹھڑی سے آسمان دیکھنے پر مجھے ماضی کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ میں نے آسمان سے نظریں ہٹا کر ایک گہرا سانس لیا۔ اور ٹام کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

بالآخر ٹام نے بولنا شروع کیا۔ خیالات کی یلغار سے بچنے کے لیے وہ گفتگو کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ میری جانب دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ میرا رنگ زرد ہو گیا تھا اور میں پسینے میں نہایا

ہوا تھا۔ ٹام کا بھی یہی حال تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن گئے تھے یہ ہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف دیکھے بغیر باتیں کر رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت کوٹھڑی میں فقط ڈاکٹر ایک زندہ شخص ہے۔

''تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے؟ میں تو کچھ نہیں سمجھ پا رہا'' ٹام نے طویل گفتگو کے اختتام پر کہا۔

''کیا سمجھنا چاہ رہے ہو''۔

''ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''فکر مت کرو سب سمجھ میں آ جائے گا''۔ میں نے کہا۔

اچانک مجھے ٹام کے پاس سے عجیب سی مہک آتی محسوس ہوئی۔ عام حالات میں میری ناک اتنی حساس نہیں تھی۔ میں نے نتھنے پھلا کر حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا''۔ ٹام مسلسل بول رہا تھا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں لیکن کچھ تو پتہ چلے۔ دیکھو میں جانتا ہوں وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے...... ٹھیک ہے؟؟ تمہارا کیا خیال ہے کتنے لوگ ہوں گے؟''

''کیا؟ ہاں لوگ!! معلوم نہیں پانچ ...... یا آٹھ۔ اس سے زیادہ تو نہیں ہوں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ فرض کیا کہ وہ آٹھ ہوں گے۔ کوئی چیخ کر انہیں نشانہ باندھنے کا حکم دے گا۔ ٹھیک ہے؟ فوراً مجھ پر آٹھ بندوقیں تن جائیں گی۔ میں دیوار کے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ پوری قوت لگا دوں گا۔ لیکن دیوار ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں میں ہوتا ہے...... میں جانتا ہوں ہمارے ساتھ کیا ہو گا۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''مت سوچو''۔ میں نے کہا ''سب جانتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا''۔

''بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔ سنا ہے چہرہ بگاڑنے کے لیے خاص طور پر آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔ کتے'' ٹام کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ ''مجھے تو ابھی سے اپنے بدن میں سوراخ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں...... ایک گھنٹہ ہو گیا چہرے اور گردن میں درد ہو رہا ہے۔ اصل میں تو یہ درد کل محسوس ہو گا۔ اور اس کے بعد...... اس کے بعد کیا ہو گا؟ ہیں؟''

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے، مگر میرے لیے انجان بنے رہنا بہتر تھا۔ جہاں تک درد کا تعلق تھا میں خود اپنے بدن میں سوراخ ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ اس لحاظ سے میں بھی اس جیسا تھا۔

ٹام دوبارہ بولنا شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بدستور ڈاکٹر پر گڑی تھیں۔ جبکہ ڈاکٹر ہر چیز سے

لاتعلق تھا۔ میں ڈاکٹر کے آنے کا مقصد جانتا تھا۔ وہ ہماری باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ وہ ہمارے جسموں کی نگہداشت پر مامور تھا۔ ہمارے جسم' جو زندگی ہی میں مر رہے تھے۔

''بالکل جس طرح بھیانک خوابوں میں ہوتا ہے''۔ ٹام بولے چلے جا رہا تھا۔ ''ٹھوس چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ دھوئیں کی طرح۔ یا جیسے ہوا یا بادل یا کوئی بھی چیز۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ گولیاں سوراخ اور درد۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر کہیں کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ میں خود اپنی لاش دیکھنے لگتا ہوں۔ عام بات نہیں ہے۔ خود اپنی لاش' اپنی آنکھوں سے۔ اپنی لاش کون دیکھنا چاہتا ہے؟ میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ آنکھیں بند کرلوں؟ میں تو کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ دنیا دوسروں کے قائم رہے' مجھے کیا ہے۔ میں نے دو راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ حد ہوتی ہے آدمی بکھر جاتا ہے۔ پابلو یقین کرو۔ میں کسی چیز کا انتظار کر رہا ہوں' مگر یہ وہ چیز نہیں ہے۔

''وہ چیز تو ہمیں پیچھے سے پکڑ لے گی۔ بے خبری میں......''

''بکواس بند کرو'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''پادری کو بلاؤں؟ وہی تمہاری سنے گا''۔

مجھے ٹام کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اب اگر ہمیں ساتھ مرنا پڑ رہا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگوں۔ اس وقت ریمون میرے ساتھ ہوتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ریمون میرا دوست تھا۔ ٹام اور جون کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

ٹام اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ میں اس کا مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مسلسل بول رہا تھا۔ اس طرح مرنا غیر فطری تھا۔ اور غیر فطری موت کے اس قدر نزدیک پہنچ کر مجھے ہر چیز غیر فطری لگ رہی تھی۔ بجھے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر' بینچ' ڈاکٹر کا چہرہ۔ سب کچھ غیر فطری تھا۔ ٹام کے اور میرے احساسات ایک جیسے تھے مگر میں اس کی طرح کا رویہ نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ ہم تمام رات ایک طرح کی باتیں سوچتے رہیں گے۔ ہمارے دھیان میں ایک جیسی چیزیں آئیں گی۔ ہم دونوں زرد پڑتے رہیں گے۔ لرزیں گے اور پسینے میں نہا جائیں گے' میں نے کنکھیوں سے ٹام کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سایہ تھا۔ میری انا کو دھچکا لگا۔ ہم چوبیس گھنٹے سے ساتھ تھے۔ میں نے اس سے باتیں کی تھیں' اس کی گفتگو سنی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے اس کے باوجود اب ہم جڑواں بھائیوں کی طرح ایک جیسے نظر آ رہے تھے۔ اس لیے کہ

ہمیں... مرنا تھا۔
ٹام نے میری جانب دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔
''پابلو۔ حیرت ہوتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہم مرتے ہیں تو ختم ہو جاتے ہیں۔ بالکل ختم۔ ہمیشہ کے لیے''
میں نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔
''نیچے دیکھو۔ غلیظ آدمی''۔
ٹام گیلے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی پتلون سے قطرے ٹپک رہے تھے۔
''کیا! یہ کیا ہے؟؟'' اس نے اپنے نیچے دیکھ کر خوف اور حیرت سے کہا۔
''تم اپنی پتلون گیلی کر رہے ہو'' میں نے اسے بتایا۔
''ناممکن ہے''۔ وہ غرایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا...... میں تو کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا''۔
میں نے ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ وہ لاتعلقی سے گیلے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ ''اس کی گرفت کمزور ہو گئی ہے''۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ رائے دی۔
''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے''۔ ٹام نے سختی سے کہا۔ ''میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ خدا کی قسم خوفزدہ نہیں ہوں''
ڈاکٹر کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا کر اپنی نوٹ بک میں تحریر کرنے لگا۔
میں اور ٹام ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ جون بھی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ہم تینوں کی نظریں ڈاکٹر پر گڑی تھیں، کیونکہ ڈاکٹر زندہ تھا۔ فقط وہ زندہ آدمیوں کی طرح مصروف تھا۔ اس کا تجسس زندگی کی نشانی تھا۔ ڈاکٹر کو سردی لگ رہی تھی۔ اس کا بدن زندہ آدمیوں کی طرح موسم سے متاثر ہو رہا تھا۔ جبکہ ہمیں اپنے جسموں کو محسوس کرنے کے لیے خود کو چھونا پڑ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید اب میں بھی گیلے فرش پر بیٹھا ہوں مگر شرمساری سے بچنے کے لیے میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں ہم سوائے ڈاکٹر کو دیکھنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر اپنی ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ اسے اپنے جسمانی اعمال پر کنٹرول تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ کل شام اور پرسوں صبح کو اس کی مصروفیات کیا ہوں گی۔ ڈاکٹر زندہ تھا اور ہم تین سائے اسے دیکھ رہے تھے اس کے جسم سے حرارت اور خون چوس کر دوبارہ زندہ ہونا چاہتے تھے۔

اچانک میں بلند آواز سے ہنسنے لگا۔ میرے قہقہے نے ایک گارڈ کو چوکنا کردیا۔ دوسرا بدستور کھلی آنکھوں کے ساتھ سویا رہا۔ سوئے گارڈ کی آنکھوں کا سفید حصہ نظر آرہا تھا اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

میں بیک وقت تھکن اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ صبح کیا ہوگا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لیے میں بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ لیکن جوں ہی میری توجہ کسی اور چیز پر مرکوز ہوتی' مجھے بندوق کی نالیاں دکھائی دیتیں جو دھیرے دھیرے میرے چہرے کی سمت اٹھنے لگتیں۔ متعدد مرتبہ گولیاں میرے وجود کو چیرتی چلی گئیں۔ ایک بار تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں واقعی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہوں۔ میں اونگھ گیا تھا۔ وہ مجھے دیوار کی سمت کھینچ رہے تھے۔ میں پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ نڈھال ہونے پر میں ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گولیوں سے چھلنی ہوتے ہی میں نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے انکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا مجھے ڈر تھا کہ شاید ڈاکٹر نے مجھے چیختے ہوئے سن لیا ہے۔ مگر ڈاکٹر ایک کونے میں بیٹھا لاتعلقی سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ اور اب میری آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ اگر میں چاہتا تو اس لمحے گہری نیند سو سکتا تھا مگر میں اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹے سو کر نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے لینے آئیں گے۔ اور میں غنودگی کے عالم میں سر جھکائے ان کے ساتھ چل دوں گا۔ شاید میں ان سے یہ پوچھ سکوں کہ مجھے جانوروں کی طرح کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ میں مرنے سے پہلے سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے نیند کے دوران ڈراؤنے خوابوں کا بھی اندیشہ تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کردیا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لیے میں ماضی کے خوش گوار لمحے دھیان میں لایا۔ کتنے دل کش چہرے تھے۔ کیسی دل چسپ باتیں تھیں۔ چھٹیاں' تہوار اور میلے اور جھولے' چھوٹے ماموں اور ریمون۔ شاید ریمون کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ کیسا عجیب دن تھا۔ جب میں نے احتجاجی جلوس میں شرکت کی تھی۔ اور غرناطہ کی وہ رات جو میں نے ایک بینچ پر جاگ کر گزاری تھی۔ اس کے باوجود صبح کے وقت میں اسے مسکرا کر ملا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور آزادی کی زندگی اور خوبصورت عورتیں۔ میں نے دیوانہ وار ان کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں آزادی کی تحریک

کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ نعرے لگا تا رہا تھا۔ تقریریں کرتا پھرا تھا...... اور اس دوران موت کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اب جبکہ زندگی ختم ہو رہی تھی ان ساری چیزوں کا کیا مطلب تھا؟ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ میں لڑکیوں کی صحبت میں اس قدر خوش تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں اس طرح مروں گا۔ تو میں تمام زندگی اپنے بستر سے اٹھنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میری پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اب سب کچھ اختتام کو پہنچ گیا تھا...... مجھے کسی بات کا زیادہ دُکھ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں مجھے کچھ چیزیں چھوڑنے کا افسوس ہوتا۔ اپنے پسندیدہ کھانوں کا ذائقہ یاد آتا۔ یا میں اس پرسکون جھیل کے تصور سے افسردہ ہوتا جہاں میں گرمیوں کی دوپہر میں تیرا کرتا تھا۔ لیکن موت نے تمام چیزوں کی دلکشی چھین لی تھی۔

''دوستو!'' اچانک ڈاکٹر نے ہمیں مخاطب کیا۔''...... اگر تم چاہو تو میں تمہارا آخری پیغام تمہارے پیاروں تک پہنچا دوں گا۔''

''میرا کوئی نہیں ہے۔'' ٹام ناگواری سے بولا۔

میں خاموش رہا۔

ٹام میری خاموشی پر حیران ہوا۔

''کانشہ! تم ''کانشہ'' کے نام کوئی پیغام نہیں بھجواؤ گے؟'' اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں''۔ میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

آج میرے لیے کانشہ کی اہمیت مختلف تھی۔ کل تک میں اس سے پانچ منٹ بات کرنے کے لیے اپنا ایک بازو کٹوانے پر رضامند ہو جاتا۔ اسی لیے میں نے کل ٹام سے کانشہ کا ذکر کر دیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کانشہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بات کرنا تو درکنار اب میں کانشہ کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جب سے میرا بدن پیلا پڑا تھا' اور میں پسینے میں نہا گیا تھا' مجھے اپنے بدن سے کراہت آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کانشہ کے بدن کی یاد سے بھی متلاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب اسے میری موت کی اطلاع ملے گی تو وہ روئے گی زندگی میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ کئی دنوں تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ مگر بہرحال وہ زندہ رہے گی...... جبکہ میں مر رہا تھا۔ مجھے اس کی خوبصورت آنکھیں یاد آئیں۔ جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی نہایت

لطیف چیز اس کے وجود سے نکل کر مجھ میں داخل ہو رہی ہے لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس لمحے وہ مجھے دیکھے گی تو مجھ پر اس کی نظروں کا قطعی کوئی اثر نہیں ہو گا...... اس مرحلے پر میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا۔ گو اس کی تنہائی کا انداز مختلف تھا۔

اس وقت وہ بینچ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بازو بڑھا کر لکڑی کو چھوا۔ اور پھر فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ایسا تاثر ابھرا جیسے اس نے نادانستگی میں کوئی چیز توڑ دی ہو۔ وہ دوبارہ کانپنے لگا مجھے ٹام کی حالت پر حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے خود یہ احساس ہو رہا تھا کہ چیزیں مضحکہ خیز انداز میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ دیواروں کا رنگ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ بینچ کی لکڑی' لالٹین یا کوئلوں کی راکھ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم مرنے والے ہیں۔ تمام چیزیں ایک فاصلے پر کھڑی سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بسترِ مرگ پر پڑے مریض کے تیماردار کمرے کے ایک کونے میں دائرہ وار کھڑے دبے لہجے میں اس کی موت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں۔

میں اس حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اب اگر بتایا جاتا کہ مجھے آزاد کر دیا گیا ہے تو میں اپنی جگہ منجمد ہو جاتا۔ ایک مرتبہ اپنے فانی ہونے کا احساس ہو جائے۔ تو موت میں چند گھنٹے یا چند برسوں کی تاخیر ایک ہی بات لگتی ہے۔ ایک لحاظ سے میں بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن خوفناک بات یہ تھی کہ میرا بدن میری مرضی کے بغیر کانپ رہا تھا اور میرے کپڑے پسینے میں یوں تربتر تھے جیسے میرا وجود اندر ہی اندر پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ میں نے خود کو چھوا' ہاتھ سے محسوس کیا یوں جیسے میں کسی اور بدن کو ہاتھ لگا رہا ہوں۔ یہ میرا جسم تھا اس میں ایک دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کچھ چیزیں جسم سے باہر آ رہی تھیں کچھ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ پورا وجود ایک انجانے بھاری پن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ساتھ چمٹ جانے والا مکروہ جاندار۔ یکلخت مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی کیڑے کے اندر قید ہوں۔

''ساڑھے تین بج گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ہم چونک گئے ہم بھول گئے تھے کہ وقت گزر رہا ہے رات ایک سیاہ عفریت کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شام کب اختتام کو پہنچی؟ رات کب شروع ہوئی؟

جون ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگا...... ''میں مرنا نہیں چاہتا...... میں کیوں مروں؟ میں نہیں مروں گا''۔
اس نے اپنے بازو ہوا میں بلند کیے اور کوٹھڑی میں ادھر ادھر بھاگنے لگا پھر وہ سسکیاں لیتا ہوا ایک کونے میں ڈھیر ہو گیا۔ ہر چند کہ جون پاگلوں کی طرح شور مچا رہا تھا لیکن حقیقت میں وہ مجھ سے اور ٹام سے زیادہ اچھی حالت میں تھا۔
وہ اس بیمار آدمی کی طرح تھا جو بیماری کا مقابلہ اپنے بلند ہوتے درجۂ حرارت سے کرتا ہے لیکن جب مریض کی حرارت بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہو تو یہ زیادہ خطرناک علامت ہوتی ہے میں اور ٹام ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔
جون رو رہا تھا اسے خود پر رحم آ رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنی حالت پر دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ مگر اس کے برعکس میں نے چھوٹے کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں غیر انسانی طور پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔
''میں باوقار انداز میں مروں گا'' میں نے خود کو کہتے سنا۔
صبح کے آثار دیکھنے کے لیے ٹام چھت کے سوراخ کے نیچے جا کھڑا ہوا جب سے ہمیں ڈاکٹر نے وقت بتایا تھا ہم اپنی زندگی کو قطرہ قطرہ ختم ہوتے دیکھ رہے تھے۔
''سن رہے ہو؟'' ٹام کی وحشت زدہ آواز آئی۔
''ہاں''
''ابھی رات باقی ہے لیکن انہوں نے احاطے میں چلنا شروع کر دیا ہے معلوم نہیں کم بختوں کا کیا ارادہ ہے بہر حال اندھیرے میں تو گولی نہیں ماریں گے''
''روشنی ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے'' میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ مجھے آسمان پر اندھیرے کی گہرائی کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔
کچھ دیر میں ماحول کا رنگ بدلنے لگا۔ دور کہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔
ٹام نے ڈاکٹر سے سگرٹ طلب کی۔
''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دروازے کی آہٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک افسر چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔
''ٹام؟ افسر نے پوچھا

ٹام خاموش رہا۔ مگر گارڈ نے اس کی سمت اشارہ کر دیا۔

''جون؟''

''وہ............وہ جو فرش پر بیٹھا ہے''۔ گارڈ بولا

''اٹھو'' افسر نے جون سے کہا۔

جون نے خود کو مزید سمیٹ لیا۔ سپاہیوں نے اس کی بغلوں میں بازو ڈالے اور گھسیٹ کر کھڑا کر دیا' لیکن جوں ہی سپاہی ہٹے' جون پھر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہیوں نے افسر کی جانب دیکھا۔

''اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا'' افسر نے کہا' اور پھر ٹام کی سمت گھومتے ہوئے بولا۔ ''چلو تم میرے ساتھ چلو''۔

ٹام دو سپاہیوں کے درمیان افسر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بقیہ دو سپاہیوں نے چھوٹے کو اٹھا لیا۔ وہ بے ہوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں بن رہی تھیں۔ میں کھڑا ہوا تو افسر نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔

''تمہارا نام پابلو ہے''؟

''ہاں''

''تم یہیں رکو تمہیں بعد میں لے جائیں گے''

ڈاکٹر اور دونوں گارڈ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اب میں بالکل تنہا تھا مجھے وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں' ہر آواز پر میں کانپ اٹھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنے بال کھینچوں اور زور زور سے چیخوں لیکن میں نے اپنے ہات جیبوں میں ڈال لیے اور ہونٹوں کو سختی سے دبا لیا۔

میں باوقار انداز میں مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے میں وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور اس قدر گرم تھا کہ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ یہاں دو افسر اپنے گھٹنوں پر کاغذات پھیلائے بیٹھے تھے۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں''

''ریمون کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم''

''یہاں آؤ۔'' پہلا سوال کرنے والے افسر نے اشارہ کیا۔

میں نزدیک گیا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور مجھے پوری قوت سے جھنجھوڑا۔ وہ مجھے خوف زدہ کر کے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں اسی حالت میں خاموش کھڑے رہے۔ اچانک مجھے ہنسی آنے لگی' جو مرنے والا ہو اسے ڈرانا بہت مشکل کام ہے ان کی ترکیب ناکام ہو رہی تھی اس نے جھٹکے سے مجھے پرے دھکیلا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا ہے'' اس نے سختی سے کہا۔ ''اگر تم نے ریمون کا پتہ بتا دیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے''

''یہ دونوں افسر بھی ایک دن مر جائیں گے'' مجھے خیال آیا۔

''میرے کچھ عرصے بعد سہی' مگر بہرحال یہ دونوں بھی جو اس وقت اتنی شان سے اکڑ کر بیٹھے ہیں ایک دن خاک ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بے خبر ہیں۔ یہ جو دوسروں کے نام تلاش کر رہے ہیں انہیں ڈھونڈ رہے ہیں تا کہ انہیں ہلاک کر سکیں...... ملکی امور پر ان کی اپنی رائے ہے دوسرے معاملات پر بھی ان ذاتی پسند اور ناپسند ہے۔ مگر انہیں نہیں معلوم کہ ان کی یہ تمام سرگرمی اور جوش و خروش کس قدر بے معنی اور مضحکہ خیز ہے انہیں اپنے پاگل پن کا ابھی قطعی علم نہیں ہے۔''

وہ افسر جس نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا مجھے اب تک گھور رہا تھا وقفے وقفے سے وہ اپنے ہاتھ میں تھامے چھڑی اپنے جوتوں پر مار کر کان میں چبھنے والی آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہ اپنی ہر حرکت سے خود کو خطرناک اور خوں خوار ثابت کرنا چاہتا تھا۔

''تو؟...... پھر؟...... تم سمجھ گئے؟ اس کی آواز میں دھمکی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم ریمون کہاں ہے؟ میں نے چڑ کر کہا۔ ''اسی شہر میں کہیں ہوگا''

دوسرے افسر نے تھکن ظاہر کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھا کر پیشانی پر رکھا۔ دراصل وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے عاجز آچکا ہے وہ بھی اداکاری کر رہا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ بالغ لوگ کیونکر بچوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔

''تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لئے پندرہ منٹ ہیں'' اس نے کہا اور پھر گھوم کر سپاہیوں سے مخاطب ہوا''۔ اسے چھوٹے کمرے میں لے جاؤ۔ پندرہ منٹ بعد واپس لے آنا۔ اگر یہ اپنی ضد پر

قائم رہا تو اسے گولی ماردی جائے گی"۔

میں جانتا تھا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ میں نے پوری رات انتظار میں گزاردی۔ پھر مجھے انہوں نے ایک گھنٹے تک کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ مجھے دوبارہ تہا بند کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی کے اعصاب بالآخر جواب دے جاتے ہیں۔ اور اگر میرے اعصاب ختم ہوگئے تو میں بول پڑوں گا۔ انہیں سب کچھ بتادوں گا۔

چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں کمزوری کے باعث نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے از سرنو چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جانتا تھا کہ ریمون کہاں ہے۔ وہ شہر کے مضافات میں اپنے چچازاد بھائی کے گھر چھپا ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے اس کا پتہ حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ جسمانی اذیت کی بات اور ہوتی ہے ممکن ہے میں جسمانی اذیت کے سامنے بے بس ہو جاتا۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ مجھے جسمانی اذیت پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔ میں اس صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ میں مر جاؤں گا لیکن ریمون سے غداری نہیں کروں گا......لیکن کیوں؟ مجھے تو اب ریمون سے کوئی لگاؤ بھی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت "کا نشہ" سے میری محبت اختتام کو پہنچی تھی تو زندگی سے میری وابستگی بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ریمون سے دوستی کا تصور بھی معدوم ہوگیا تھا۔ ایک وقت تھا جب میں اسے پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کی جگہ میں مرجاؤں۔ اس کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی کیسے ہوسکتی ہے؟ کسی کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے کسی بھی آدمی کو دیوار کے سامنے کھڑا کر کے اس پر گولیاں چلائی جاسکتی ہیں جسے بھی گولیاں لگیں گی وہ منہ کے بل زمین پر آگرے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہلاک ہونے والا آدمی میں ہوں یا ریمون ہے۔ یا کوئی اور ہے ممکن ہے ملک کی تحریکِ آزادی کے لئے ریمون کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہو۔ لیکن ملک کا کیا مطلب ہے؟ آزادی سے کیا ہوتا ہے؟ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس کے باوجود میں مر رہا ہوں۔ جب کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو ریمون کا پتہ بتا کر میں اس مضحکہ خیز صورت حال سے نکل کیوں نہیں جاتا؟ میری ضد اب کیوں قائم ہے؟

"میں اپنی انا سلامت لئے جارہا ہوں" میں نے سوچا اور مجھے عجیب طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے چل پڑے۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک ہمارے قدموں تلے سے ایک چوہا نکل کر دوسری طرف بھاگا۔ مجھے یہ منظر بہت دلچسپ لگا۔

''چوہا! تم نے دیکھا؟ چوہا تھا''۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا۔ سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ مجھے ہنسی آرہی تھی۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ ایک مرتبہ میں ہنس پڑا تو ہنستا چلا جاؤں گا۔ رُک نہیں سکوں گا۔ ہنسی سے بچنے کے لئے میں نے بڑی مونچھوں والے سپاہی کو غور سے دیکھا اور کہا۔

''احمق، تمھیں اپنی مونچھیں کاٹ دینی چاہئیں''

اس نے نیم دلی سے مجھے لات مارنے کی کوشش کی، مگر کچھ بولنے سے گریز کیا۔

''تم نے اچھی طرح سے سوچ لیا؟'' دوبارہ سامنا ہونے پر موٹے افسر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے افسروں کو غور سے دیکھا۔ وہ ایسے کیڑے لگ رہے تھے۔ جو صرف مخصوص موسموں میں دکھائی دیتے ہیں۔

''میں جانتا ہوں ریمون کہا ہے؟؟۔ میں نے روانی سے کہا۔'' وہ مرکزی قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ کسی دھنسی ہوئی قبر کے اندر یا گورکن کی چار دیواری میں''۔

بس میرا جی چاہا تھا کہ ان سے مذاق کروں۔ وہ میرے ہاتھوں بے وقوف بنیں اچھل اچھل کر پٹیاں کسیں۔ ٹوپی سیدھی کریں۔ اور بے معنی احکامات جاری کریں۔

اور وہ واقعی اُچھل پڑے تھے۔

''خوب! ٹھیک ہے! اچھا! پندرہ آدمی تیا کرو۔ فوراً''

اور تم موٹے افسر نے روانگی سے قبل مجھے مخاطب کیا...... ''اگر تم نے سچ بولا ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ ورنہ تم پچھتاؤ گے۔

وہ شور مچاتے رخصت ہو گئے۔ اور میں اطمینان سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے تصور کیا کہ اس لمحے وہ قبر کے پتھر الٹ رہے ہوں گے۔ گورکن کی چار دیواری میں کود رہے ہوں گے۔ اپنی ناکامی پر برے برے منہ بناتے، قبرستان کی جھاڑیوں میں اُچھلتے کودتے وردی پوش۔ میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں میں اپنی سزا سننے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

''اسے بیرونی احاطے میں لے جاؤ۔ فوجی کارروائی ختم ہونے کے بعد اس کا فیصلہ شہری انتظامیہ کرے گی''۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے غلط سنا ہو۔

''تو...... تو مجھے گولی نہیں ماری جائے گی۔'' میں نے پوچھا

''نہیں''

''لیکن...... کیوں؟''

اس نے لاعلمی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے اور خاموش ہو گیا۔ سپاہی مجھے باہر کی جانب گھسیٹنے لگا۔ بیرونی احاطے میں سیکڑوں کی تعداد میں بچے عورتیں اور بوڑھے قیدی جمع تھے۔ قیدیوں کے درمیان چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں آہستہ آہستہ پاگل ہو رہا ہوں۔ دوپہر کے وقت ہمیں کھانا دیا گیا۔ کھانے کے دوران مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے وقت چند نئے قیدی احاطے میں دھکیلے گئے میں نے اپنے محلے کے دکاندار کو پہچان لیا اس کا نام گارشیا تھا۔

''تم زندہ ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''مجھے موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ معلوم نہیں کیوں''۔

''مجھے دو بجے گرفتار کیا گیا۔ گارشیا نے بتایا۔

''کیوں تمہارا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا''

''جو بھی ان کی طرح نہیں سوچتا' وہ اسے گرفتار کر رہے ہیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گارشیا دبے لہجے میں بولا ''وہ ریمون کی تلاش میں کامیاب ہو گئے''۔

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''کب؟''

''آج صبح۔ ریمون نے عجیب احمقانہ حرکت کی۔ وہ چچا کے لڑکے سے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اسے کئی لوگ پناہ دینے کو تیار تھے مگر وہ کہنے لگا کہ پابلو ہوتا تو میں اس کے گھر رہتا۔ وہ

میرا دوست تھا مگر جب وہی گرفتار ہو گیا تو اس میں دوسروں کا احسان کیوں لوں۔ میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا"۔

"قبرستان میں؟"

"ہاں بس ریموں سے یہی غلطی ہوئی۔ صبح وہ وہاں آ گئے۔ یہ ہونا ہی تھا ظالموں نے اسے دیکھتے ہی گولیوں سے اڑا دیا۔"

"قبرستان میں؟"

"ہاں"

ہر چیز دائرہ دار گھومنے لگی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں زمین پر بیٹھا تھا۔ اچانک میں اتنی زور سے ہنسا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ٹالسٹائی کے بعد چیکوسلاواکیہ کا "فرانز کافکا" آئرلینڈ کا "جیمز جوائس" اور فرانس کا "جین پال سارتر" عالمی ادب کے افق پر عہد ساز ادیبوں کی حیثیت سے طلوع ہوئے۔ "کافکا" اپنی تخلیق کردہ خواب آلود دنیا اور اس کے عجوبہ مکینوں کو کسی منطقی انجام کی بنیاد فراہم کیے بغیر انتقال کر گیا۔ اور "جوائس" نے زبان کے سمندر میں اس وقت شناوری کی جب وہ جزر کی حالت میں تھا۔ نتیجتاً اس کی رفت تو قابلِ دید تھی مگر باز آمد ناممکن ثابت ہوئی۔ خالص قدرتِ کلام، خطیب کا نشتر ہے کہ وہ اس میں اپنی آواز کے نشیب و فراز سے بے پناہ کاٹ پیدا کر سکتا ہے، مگر کتاب تمام الفاظ یکساں لہجے میں ادا کرتی ہے یوں اس مقام پر جوائس کی تحریروں کے پیدائشی حسن میں کمی واقع ہوئی لیکن سارتر ان عیوب سے ماورا ہے۔

اسی لیے جین پال سارتر بیسویں صدی کی عظیم ترین ادبی شخصیت ہے۔ کافکا، جوائس اور سارتر بنیادی طور پر مساوی ادبی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ مگر سارتر کو بقیہ دونوں ادیبوں پر فلسفہ دانی اور ذاتی فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھنے کی فوقیت حاصل ہے۔ اور فلسفے میں اس کا موقف نہایت جدید معلوم ہونے کے باوجود دراصل اتنے قدیم اور مستند نظریۂ زندگی کی ایک شاخ ہے کہ "زندہ وجود" کی اہمیت پر سارتر کے اصرار پر کوئی باشعور شخص اعتراض کر ہی نہیں سکتا۔

"تم حیات ہو" اس لئے تم ہی زمانہ اور تم ہی کائنات ہو"

اگر تم خود پر حیران ہوئے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی حیرت ہوگی اور اگر تم خود سے ڈر گئے تو یہ دنیا کا

سب سے بڑا خوف ہے"

سارتر اپنی بے پناہ ادبی صلاحیتوں کے ساتھ اس فلسفۂ زیست کی تہہ میں اتر گیا کبھی کبھی وہ اپنا نیا ناول افسانہ یا مضمون ہاتھ میں لیے سطح پر آتا اور دنیا کو حیرت زدہ کر کے دوبارہ خود میں اتر جاتا۔

اس کا ناول متلاہٹ دنیا کا واحد ناول ہے جو عام تصور حیات سے ماورا ہونے کی نہایت سنجیدہ تعلیم دینے کے دوران ناول نگاری کے فن کی انتہا پر بھی قائم رہتا ہے۔ عالمی ادب کے دیگر تمام عظیم ناولوں میں جہاں فلسفے کی گہرائی آتی ہے وہاں داستان گوئی کی چاشنی ختم ہو جاتی ہے اور جہاں قصہ خوانی کا فن ابھرتا ہے وہاں گہرائی کا عنصر کم ہونے لگا ہے۔

سارتر فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔ تاریخ علم وادب میں اتنی بڑی سطح پر یہ واقعہ تیسری مرتبہ پیش آیا۔ افلاطون اور نطشے کے بعد اب سارتر کی شخصیت بھی فلسفے کے بلند امتزاج کی علامت بن گئی ہے۔

"متلاہٹ" کے علاوہ سارتر اپنے افسانے "دیوار" میں بھی زندگی کا ہولناک رُخ دکھانے میں کامیاب ہوا ہے۔ انسان دراصل ایک مخصوص شعور کا نام ہے۔ یہ شعور انفرادی سطح پر ایک "زندہ وجود" سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور زندہ وجود کو ایک ایسی کائنات میں زندہ رہنا ہوتا ہے جو کسی ضابطۂ حیات کی پابند نہیں ہے۔ آفاقی اصول موجود ہیں مگر ہر ذی نفس کو ذاتی سطح پر مکمل بے یقینی کی فضا میں سانس لینا ہوتا ہے۔ فرد کے لئے افق تا افق لاقانونیت پھیلی ہے۔

فرد سے کائنات کی لاتعلقی کے احساس سے "دیوار" کے مرکزی کردار پر اچانک اپنے عقائد اور نظریات کی لایعنیت واضح ہوتی ہے۔ اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ اصول جنہیں اس نے تمام عمر مقدس سمجھا درحقیقت خود ساختہ اور بے بنیاد تھے۔ آخری کوشش کے طور پر وہ اپنی انا سلامت رکھنا چاہتا ہے مگر اتفاقاتِ زمانہ میں فرد کی انا بھی ناچیز اور بے وقعت ثابت ہوتی ہے۔ یہ بے بسی کی انتہا ہے اور اس لرزہ خیز صورت حال کے فنکارانہ اظہار نے "دیوار" کو عہدِ جدید کا عظیم افسانہ بنا دیا ہے۔ اگر "دیوار" کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا افسانہ قرار دیا جائے تو بحث کے لیے صرف "کافکا" کا "فن کار" ہی اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

فرانز کافکا

فن کار

جدید عہد کی آمد کے ساتھ پیشہ ورانہ فاقہ کشی میں لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی ہے ایک زمانے میں فاقہ کشی کا مظاہرہ اچھی خاصی آمدنی والا پیشہ تھا لیکن اچانک اس پر زوال آ گیا۔ آج کی دنیا مختلف ہے۔ ماضی میں پورا شہر فاقہ کشی کرنے والے فن کار کا مداح ہوا کرتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے تماشائیوں کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ بعض شوقین مزاج لوگ تو شروع سے آخر تک کے ٹکٹ خرید لیتے اور روزانہ صبح سے شام تک فاقہ کش فن کار کے سلاخوں والے پنجرے کے سامنے بیٹھے رہتے۔ رات کے وقت مشعلیں روشن ہوتیں تو ماحول کا تاثر بڑھ جاتا۔ سردیوں کے روشن دنوں میں فن کار کا پنجرہ کھلے میدان میں رکھ دیا جاتا اور ایسے موقعوں پر وہ بچوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ بڑوں کے لیے اس کی حیثیت ایک دل چسپ تماشے کی ہوتی لیکن بچوں کو بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھا، ابھری پسلیوں والا وہ شخص نہایت عجیب معلوم ہوتا۔ طویل فاقہ کشی کے دوران کبھی وہ انکساری سے سر ہلاتا، کبھی اس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل جاتی اور کبھی وہ اپنا بازو سلاخوں سے باہر نکال دیتا تاکہ تماشائی اس کا دبلا پن ہاتھ سے چھو کر محسوس کر سکیں۔ اور پھر یکلخت، بغیر کسی ظاہری وجہ کے وہ دوبارہ اپنے اندر گم ہو جاتا۔ ہر شخص اور ہر چیز سے بیگانہ۔ دیوار سے لٹکی اس گھڑی سے بھی لاتعلق جو اس کے پنجرے میں جدید عہد کی واحد چیز تھی۔ وہ خاموشی سے افق کے پار دیکھنے لگتا۔ بس وقفے وقفے سے پیالے میں منھ ڈبو کر اپنے ہونٹ تر کرتا رہتا۔

عام تماشائیوں کے علاوہ پیشہ ور تماشائی بھی تھے جو فاقہ کش فن کار پر نظر رکھنے کے لیے عوام میں سے خاص اس مقصد کے لیے منتخب کیے جاتے تھے ان کا فرض تھا کہ وہ تین تین کی ٹولیوں میں دن رات پنجرے کے سامنے موجود رہیں تاکہ فاقہ کش کسی خفیہ راستے سے کھانے کی کوئی چیز حاصل نہ کر سکے۔ یہ محض ایک رسم تھی ورنہ جاننے والے جانتے تھے کہ فاقہ کشی کے دوران فنکار دنیا کی عظیم ترین نعمت کا ایک نوالہ تک نہیں چکھے گا۔ یہ اس کے فن کی عزت کا سوال تھا لیکن ہر نگہبان اس بات

کو نہیں سمجھتا تھا کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی نگہبانی کے دوران ایک کونے میں بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جان بوجھ کر فن کار کی جانب پشت کر لیتے تا کہ وہ اپنے پوشیدہ ذخیرۂ خوراک سے جو چاہے نکال کر کھالے۔ ایسے نگہبان، فن کار کے لیے عذاب بن جاتے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اگر اس نے کچھ کھانا ہوتا تو وہ فاقہ کشی کا فن کیوں اپناتا؟ اسی لیے جتنی دیر نگہبان اس سے منہ پھیرے بیٹھے رہتے وہ اُن کا شک غلط ثابت کرنے کے لیے گنگناتا رہتا۔ مگر یہ بھی لا حاصل تھا نگہبان فقط فن کار کی اس چالاکی پر حیران ہوتے کہ وہ کس طرح گنگنانے کے دوران بھی کچھ نہ کچھ کھالیتا ہے۔ ایسے نگہبان کے مقابلے میں فنکار ان کو پسند کرتا تھا جو رات کے وقت اس کے چہرے پر روشنی ڈال کر اس کا وجود نمایاں کرتے رہتے تھے۔ روشنی اس کے آرام میں کوئی خلل نہیں ڈالتی تھی۔ وہ یوں بھی ٹھیک طرح سو نہیں سکتا تھا۔ اور جب اس پر غنودگی طاری ہوتی تو وہ روشنیوں اور آوازوں کے سیلاب میں بھی اونگھ لیتا تھا منہ پر روشنی ڈالنے والے نگہبانوں کے ساتھ وہ خوش رہتا۔ ان سے وہ اپنے ماضی کے واقعات پر گفتگو کرتا ان کی باتیں سنتا گویا ہر طرح سے ان پر ثابت کرتا کہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ اس طرح کا فاقہ کرنے والا فن کار پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ہے صبح کے وقت وہ اس لمحے خوشی سے سرشار ہو جاتا جب نگہبانوں کے لیے مکھن اور انڈوں کا ناشتہ لایا جاتا' اور وہ رات بھر کے جاگے ہوئے لوگوں کی چمک جانے والی بھوک کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑتے۔ چند شکی مزاج ایسے بھی تھے جو کہتے کہ فن کار یہ ناشتہ نگہبانوں کو رشوت کے طور پر دیتا ہے مگر وہ یہ بھول جاتے تھے کہ اگر نگہبانوں کو صبح کے ناشتہ کا لالچ نہ ہو تو وہ اپنی رات فن کار کی نظر کیوں کریں؟

بہر حال اس طرح کے شکوک وشبہات فاقہ کشی کے فن کا لازمی حصہ ہیں۔ کوئی بھی شخص فاقہ کش فنکار کو شروع سے آخر تک دن رات نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے کوئی ایک ایسا آدمی مہیا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ فن کا فاقہ سو فیصد مکمل اور مسلسل رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں خود فن کار اپنے فن کا واحد مطمئن تماشائی تھا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک بات بھی جانتا تھا جو اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور وہ بات اُسے خود اپنی نظروں میں گرا دیتی تھی...... فقط فن کار جانتا تھا کہ فاقہ کرنا کتنا آسان کام ہے۔ فاقہ کرنا دنیا کا سب سے آسان کام تھا اور وہ لوگوں کو یہ بتا بھی دیتا تھا لیکن لوگ اس کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے فن کار کی انکساری قرار دیتے۔ وقت

گزرنے کے ساتھ وہ اسی صورت حال میں زندہ رہنے کا عادی ہوگیا تھا۔مگر حقیقت سے آگاہی اسے اندر سے بے چین رکھتی تھی۔
فنکار کو چالیس دن سے زیادہ فاقہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ مدت اس کے مالک نے مقرر کی تھی۔ مالک کا گزشتہ تجربہ گواہ تھا کہ بڑے شہروں میں بھی فاقہ کشی میں لوگوں کی دل چسپی تقریباً چالیس دن تک قائم رہتی ہے۔ یہ عرصہ مکمل ہونے تک فن کار کے بارے میں کی جانے والی اشتہار بازی بھی غیر موثر ہو جاتی ہے اس کے مظاہرے سے تماشائیوں کا دل بھر جاتا ہے۔
چالیسویں دن بینڈ بجانے والے رنگ برنگی وردیاں پہنے میدان میں قطاریں بنا کر جوشیلی دھنیں بجاتے۔ دو نوجوان لڑکیاں سیکڑوں تماشائیوں کی موجودگی میں پنجرے کا دروازہ کھولتیں سب سے پہلے ایک ڈاکٹر پنجرے میں داخل ہو کر فنکار کا معائنہ کرتا اور اس پر طویل فاقہ کشی سے مرتب ہونے والے اثرات با آواز بلند بیان کرتا۔ اس کے بعد اسے پنجرے سے نکال کر اس میز پر لے جانے کی تیاریاں کی جاتیں جس پر نہایت اشتہا انگیز کھانا سجا ہوتا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب فنکار ضدی ہو جاتا تھا وہ لڑکیوں کو اپنے نحیف و نزار بازو تھامنے دیتا لیکن اٹھنے سے یکسر انکار کر دیتا۔
"کیوں؟" اس کی آنکھوں میں سوال ابھرتا "جب میں نے چالیس دن تک ایک نوالہ نہیں چکھا تو اب کچھ کھانا کیا ضروری ہے؟ اتنے عرصے تک قائم رہنے والی میری قوت برداشت کو اب کیوں زبردستی ختم کرایا جا رہا ہے۔ اب جبکہ میں اپنے فن کی معراج پر ہوں یا شاید ابھی معراج پر نہیں ہوں تو مجھے آگے بڑھنے سے کیوں روکا جا رہا ہے۔ یہ دھوکہ ہے زیادتی ہے مجھے دنیا کے سب سے بڑے فاقہ کش ہونے کا امتیاز حاصل کرنے دیا جائے۔ اور اگر میں اس وقت تک دنیا کا سب سے بڑا فاقہ کش بن چکا ہوں تو مجھے اپنی انتہا تک پہنچنے کی اجازت دی جائے اگر میں مزید فاقہ کرنا برداشت کر سکتا ہوں تو تماشائی مزید فاقہ دیکھنا بھی برداشت کر لیں گے۔
یہ فن کار کے اصولی اعتراضات تھے اور پھر اس کے علاوہ پنجرے میں موجود بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھے رہنا اس قدر پُر کیف اور آرام دہ تھا کہ اسے وہاں سے اٹھنے کو قطعی دل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی اتنی پرسکون جگہ چھوڑ کر پورے قد سے کھڑا ہو اور کھانے کی میز تک جائے کھانے کے تو تصور سے اسے متلاہٹ ہوتی اگر اسے پنجرے میں موجود خوبصورت لڑکیوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ کھانے سے اپنی متلاہٹ کا عملی مظاہرہ کر دیتا۔ ان خیالات کے ساتھ وہ لڑکیوں کی آنکھوں میں دیکھتا جو بظاہر رحم

دل نظر آتیں لیکن حقیقت میں انتہائی سفاک تھیں۔ جب وہ لڑکیاں اسے اٹھنے کا اشارہ کرتیں تو وہ اپنے وجود کی تمام بچی کھچی طاقت کندھوں سے اوپر کھینچ لاتا اور نفی میں سر ہلا دیتا۔
اس کے بعد ہمیشہ کی طرح مالک پنجرے میں داخل ہوتا۔ فن کار کے بازوؤں تلے سے ہاتھ نکال کر اس کے سینے کو اپنی گرفت میں لیتا اور بینڈ کی بلند تر ہوتی دھن کے ساتھ اسے کھینچ کر کھڑا کر دیتا۔ اس سے پہلے کہ فن کار اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ دوبارہ بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھ جائے۔ دونوں لڑکیاں اس کے بازو اپنی گردن پر رکھ لیتیں اور اس کے بے وزن وجود کو گھسیٹتے ہوئے کھانے کی میز تک لے جاتیں۔ اچانک بینڈ کی آوازیں آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتیں۔ مالک فوراً ہاتھ بڑھا کر روٹی کا نوالہ توڑتا اور فن کار کے ہونٹوں کے اندر دھکیل دیتا۔ اس وقت تک وہ انکار اور اقرار کی منزل سے آگے جا چکا ہوتا تھا۔ اس کے بعد تماشائی اور ڈاکٹر اور لڑکیاں اور بینڈ والے تالیاں بجاتے اور ہنسی خوشی اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سوائے فن کار کے سب مطمئن ہوتے۔ ہمیشہ کی طرح پورے ہجوم میں صرف اور صرف فنکار ہی غیر مطمئن رہ جاتا۔
اسی طرح فن کار نے کئی برس گزار دیے۔ دنیا اس کے مقام اور مرتبے سے آشنا ہوتی گئی مگر وہ غیر مطمئن رہا۔ وہ کیونکر مطمئن ہوتا؟ اپنی دلی خواہش پر عمل کرنا اس کے لیے ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ وہ اداس رہنے لگا۔ اگر کوئی تماشائی ہمدردی میں کہہ دیتا کہ اس کی اداسی کا سبب اس کی مسلسل فاقہ کشی ہے تو وہ غصے سے لرزنے لگتا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اتنا غضب ناک ہو جاتا کہ پنجرے کی سلاخیں پکڑ کر کھینچتا اور وحشی جانوروں کی طرح دیواروں سے سر ٹکراتا۔ ایسے موقعوں پر مالک فوراً سامنے آ جاتا۔ تماشائیوں سے معذرت چاہتا اور انہیں بتاتا کہ فاقہ کش فن کار کے دل و دماغ پر جو گزرتی ہے وہ کھاتے پیتے لوگ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ یہ بھی بتاتا کہ فنکار کا دعویٰ ہے کہ وہ چالیس دن کی حد سے کہیں آگے جا سکتا ہے، مگر انسانیت کا تقاضا ہے کہ فاقہ کشی کی حد مقرر کی جائے۔ اس کے بعد مالک گزشتہ موقعوں کی تصویریں نکالتا جو چالیسیوں دن کے اختتام پر کھینچی گئی تھیں۔ ان تصویروں میں فن کار کی بگڑی ہوئی حالت دکھائی گئی تھی۔ اس سے مالک یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ چالیسویں دن فنکار کا فاقہ ختم کروانا ضروری ہو جاتا ہے۔ مالک کی اس زیادتی سے فنکار اپنی روح کی گہرائیوں میں کانپ جاتا۔ یہ ظلم کی انتہا تھی۔ مالک کا بیان حقیقت کے بالکل برعکس تھا یہ سچ تھا کہ تصویروں میں اس کی حالت غیر نظر آتی تھی۔ لیکن چالیسویں دن اس کا چہرہ فاقہ کشی کی زیادتی سے

نہیں بگڑا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دن اسے کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تماشائیوں کو کس طرح بتائے کہ طویل فاقہ کبھی کبھی اس کی حالت کے بگڑنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ جب اس کا فاقہ زبردستی ختم کروایا جاتا ہے تو وہ غم اور غصے سے بکھر جاتا ہے۔ دنیا اسے غلط سمجھ رہی تھی اور پوری دنیا سے لڑنا اس کے لیے ناممکن تھا ایک مرتبہ وہ سلاخیں پکڑ کر اس ارادے کے ساتھ مالک کو تماشائیوں سے گفتگو کرتے سنتا رہا کہ وہ بعد میں اپنے دفاع میں کچھ کہے گا۔ مگر مالک نے گفتگو کرتے ہی تصویریں نکالیں۔ تماشائیوں نے تصویروں پر نظر ڈال کر مالک کی تائید میں گردنیں ہلائیں۔ اور فنکار کے ہاتھ سے سلاخیں پھسلتی چلی گئیں۔ جب تماشائیوں نے دوبارہ پنجرے کے اندر دیکھا تو وہ اسی طرح بے حس و حرکت بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔

جب برسوں بعد نامعلوم وجوہ کی بنا پر پیشہ ورانہ فاقہ کشی کے فن پر زوال کے دن آگئے تو لوگوں کی فرصت کے اوقات زیادہ ہیجان انگیز مشاغل میں گزرنے لگے۔ ہر چند کہ فنکار کو یقین تھا کہ مستقبل [illegible]یک بار پھر فاقہ کشی میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ جائے گی مگر موجودہ صورت حال یہ تھی کہ [illegible]ں کی تفریح طبع کے لئے بہت سی نئی چیزیں وجود میں آگئیں تھیں۔ اور نئی چیز چاہے جیسی بھی [illegible]ے عرصے تک اپنے نئے پن سے متاثر کرتی رہتی ہے۔ وہ فن کار جس کے آس پاس ہمہ وقت [illegible]وں کا ہجوم حیرت سے منہ کھولے کھڑا رہتا تھا تقریباً تنہا رہ گیا تھا مالک نے اُسے کوئی نیا پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں نیا پیشہ شروع کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اور پھر فاقہ کشی سے اس کی قدیم جذباتی وابستگی تھی یہ اس کا فن تھا۔

آخر کار اس نے مالک کو کاروباری نقصان سے بچانے کی خاطر خود ہی اس سے رخصت طلب کی [illegible] فارغ رہنے کے بعد ایک سرکس میں نوکری کی درخواست دے دی۔ سرکس والوں کے [illegible]ح کے کمالات دکھانے والوں کی گنجائش ہوتی ہے انہوں نے متعدد کرتبوں میں ایک اور [illegible]ضافہ ہو جانے کو گھاٹے کا سودا نہیں سمجھا اور فن کار کو بھی احاطے کے لیے کونے میں فاقہ [illegible]ظاہرہ کرنے کی اجازت دے دی۔ دل شکنی سے بچنے کے لیے فن کار نے اپنی ملازمت کے اجازت نامے میں درج شرائط اور پابندیوں کا مطالعہ کیے بغیر اس پر دستخط کر دیے۔

فنکار نے سرکس والوں کو بتایا کہ اگر اسے اجازت دی گئی (اور یہاں اسے فوراً اجازت مل گئی) تو وہ فاقہ کشی کے طویل دورانیے سے ساری دنیا کو دنگ کر دے گا۔ وہ اتنی فاقہ کشی کرے گا کہ انسانی

تخیل لڑکھڑا جائے گا۔ قیامت تک کوئی اور فن کار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکے گا۔ سرکس کے دوسرے پیشہ ور استاد ڈھلتی عمر والے فاقہ کش کے عزائم پر مسکرا دیے مگر اس کی کوشش پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

جب فن کار کا پنجرہ سرکس کے وسط کے بجائے جانوروں کے باڑے کے قریب رکھا گیا تو اس نے اپنی بے قدری کو وقتی چیز سمجھ کر قبول کر لیا۔ ایک تختے پر اس کے فن کا نام جلی حروف میں تحریر کر کے پنجرے کی پیشانی پر آویزاں کر دیا گیا۔ کرتبوں میں وقفے کے دوران تماشائی جانور دیکھنے آتے تو راستے میں فن کار کے پنجرے کے سامنے بھی رک جاتے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ شوقین وہاں چند لمحے ٹھیرنا چاہتے ہوں لیکن پیچھے سے آنے والوں کا ریلا انہیں ہمیشہ آگے دھکیل دیتا۔ پیچھے سے آنے والے یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ جانوروں کو دیکھنے کی راہ میں کیا چیز حائل ہو سکتی ہے؟ شروع میں فن کار کرتبوں کے درمیانی وقفوں کا انتظار کرتا تھا مگر بعد میں وہ انھی وقفوں سے گھبرانے لگا۔ ابتدائی دنوں میں جب وہ ہجوم کو اپنی جانب دیوانہ وار بڑھتے دیکھتا تو سرشاری سے جھوم جاتا۔ وہ انھی لمحوں کی خاطر تو اب تک اپنے فن سے وابستہ رہا تھا لیکن بہت جلد اس پر یہ دردناک انکشاف ہوا کہ تمام تماشائی فقط جانور دیکھنے کے شوق میں بھاگے چلے آتے تھے۔ نزدیک آنے پر وہ اس کے سامنے سے گزر جاتے...... اسی لئے انہیں دور سے دیکھنا ہی اچھا لگتا تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے ان کا شور وغل اسے پریشان کر دیتا تماشائی دو واضح ٹولیوں میں تقسیم نظر آتے۔ ایک ٹولی ان چند افراد پر مشتمل ہوتی جو اس کے پنجرے کے سامنے چند لمحوں کو ٹھیرنا چاہتے۔ دوسری ٹولی وہ ہوتی جو جار از جلد جانوروں تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہوتی۔ اور پہلی ٹولی کے افراد کو دھکیلتی چلی جاتی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ ان لوگوں سے زیادہ نفرت محسوس کرنے لگا جو اسے دیکھنے کے لئے ٹھیرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں اس کے فن میں کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے وہ صرف اپنے وجود کو منوانے کے لیے جانوروں کے پر جوش تماشائیوں کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو اصل ہجوم کے بعد آنے والے اکا دکا تماشائی اس کے پنجرے کے سامنے کیوں کھڑے نہیں ہوتے ہیں؟ انہیں تو کوئی دھکیلنے والا بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود۔ یا شاید اسی وجہ سے اکا دکا آنے تماشائیوں میں سے کوئی بھی اسے ایک لمحے کی توجہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سب بھی جانور دیکھنے کی خواہش میں دوڑے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اپنے خاندان کے

ساتھ آنے والا کوئی شخص بچوں کے ہاتھ تھامے اس کے پنجرے کے مقابل ٹھیر جاتا اور بچوں کو بتاتا کہ کس طرح وہ اپنے بچپن میں فاقہ کشی کے اس سے بھی بڑے مظاہرے دیکھ چکا ہے بچوں کے لیے یہ بالکل انوکھا کرتب ہوتا لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک آجاتی جس سے فاقہ کش کو یقین ہو جاتا کہ اس فن کے اچھے دن ضرور آئیں گے۔

''ممکن ہے'' ایسے موقع پر فاقہ کش کو خیال آتا''......اگر میرا پنجرہ جانوروں سے ذرا دور رکھا ہوتا تو صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی......''

درندے تمام رات اپنے پنجروں میں بے چینی سے ٹہلتے رہتے اور ان کے جسموں سے آنے والی بو رات کی خاموشی میں زیادہ شدید ہو جاتی۔ سرکس کے کارکن درندوں کو خوراک پہنچانے کے لیے گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے اپنے سروں پر اٹھائے اس کے پنجرے کے سامنے سے گزرتے تو فن کار لرز جاتا۔ اپنا راتب کھانے کے دوران جانوروں کی غراہٹ اور دہاڑیں طوفان برپا کر دیتی تھیں فن کار یہ سب کچھ برداشت کر لیتا۔ مگر جانوروں کی نزدیکی کا نا قابل برداشت نقصان یہ تھا کہ اس سے تماشائیوں کے لیے فنکار اور جانوروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا نہایت آسان ہو جاتا تھا۔ وہ چند قدم بڑھا کر فنکار کی بجائے جانوروں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ اور یہ بات فن کار کو پریشان کر دیتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں سرکس کی انتظامیہ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اسے خیال آتا کہ سرکس کے اس کونے میں ہجوم کے جمع ہونے کا سبب جانور ہی تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ جانوروں سے دور ہو کر مکمل تنہا رہ جائے۔

درحقیقت وہ جانوروں تک پہنچنے کی راہ میں ایک رکاوٹ بن گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی رکاوٹ جو روز بروز مزید چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ فاقے کا دورانیہ اپنی خواہش اور استطاعت کے مطابق جتنا چاہے طویل کر سکتا تھا۔ مگر لوگ اسے دیکھنا ترک کر چکے تھے۔ فاقہ کشی کے فن کو سمجھنے والے ختم ہو گئے تھے پنجرے کے ماتھے پر درج تحریر میلی ہو کر نا قابلِ فہم ہو گئی تھی جس لکڑی کے تختے پر فاقے کے دنوں کا شمار کیا جاتا تھا اس پر بہت دنوں سے ایک ہی عدد درج تھا۔

مظاہرے کے ابتدا کے کچھ ہی عرصے بعد سرکس کے کارکنوں کو فاقے کا حساب رکھنے کا عمل لایعنی محسوس ہوا تھا۔ اب جبکہ فن کار اپنا فاقہ لا محدود مدت تک جاری رکھ کر اپنی دلی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ دنوں کا حساب رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ خود فن کار کو بھی علم نہیں تھا کہ اسے فاقہ کشی کرتے کتنے

زمانے بیت گئے ہیں۔ وہ فن کی کن بلندیوں پر پہنچ چکا ہے؟ کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا اور اس خیال سے فن کار کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔ کسی دن کوئی بھولا بھٹکا تماشائی پنجرے میں جھانکتا بھی تو کچھ دیر بعد مسکرا کر فن کار کے بارے میں کہتا۔ ''اس کا دھوکہ بہت گہرا ہے''۔ فن کار کسے دھوکہ دے رہا تھا؟ وہ تو پوری ایمانداری سے اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر دنیا اسے اس کے دن کا صلہ نہیں دے رہی تھی۔ اسے دھوکہ دے رہی تھی۔

مزید کچھ عرصہ بھی اتنی ہی تیزی اور آہستگی سے گزر گیا۔ ایک دن سرکس کے نگران کی نظر خالی پنجرے پر پڑی۔ اس نے کارکنوں سے اتنے کارآمد پنجرے کے خالی رہنے کا سبب دریافت کیا۔ کوئی بھی اصل وجہ سے آگاہ نہیں تھا۔ پھر کسی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے فاقہ کش فن کار کا ذکر کیا۔ بتایا کہ وہ اس بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھا کرتا تھا یہ سن کر سب پنجرے کے اندر داخل ہو گئے اور بھوسے کے ڈھیر میں لکڑیاں چبھو چبھو کر اسے تلاش کرنے لگے۔ بالآخر ایک کارکن نے اسے ڈھونڈ لیا۔ ''تم اب تک فاقہ کر رہے ہو؟'' نگران نے پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں چاہتا ہوں آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ فنکار نے سرگوشی کی۔

''ہم تمھیں معاف کرتے ہیں۔'' نگران تمسخر کے انداز میں بولا۔

''میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ آپ لوگ میری فاقہ کشی کی داد دیں۔ فن کار نے کہا

''ہم داد دیتے ہیں''۔ نگران نے جواب دیا۔

''لیکن آپ کو داد دینی چاہیے''۔ فنکار کی آواز میں انتہا کی سنجیدگی تھی۔

''تو ہم داد نہیں دیتے'' نگران کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''......مگر ہم داد کیوں نہ دیں؟'' کسی کارکن نے پوچھا

''کیونکہ فاقہ کرنا میری مجبوری ہے۔ میں اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ فنکار نے ایک ایک لفظ واضح ادا کیا۔

''تم اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کیوں؟'' نگران نے سوال کیا۔

فنکار نے اپنا منہ بھوسے کے ڈھیر سے اوپر اٹھایا ان سب کی طرف باری باری دیکھا اور کہا۔ ''اس لیے کہ مجھے آج تک کوئی غذا اچھی ہی نہیں لگی۔ اگر مجھے کوئی غذا اچھی لگتی تو میں کبھی فاقہ نہ کرتا میں بھی تمہاری طرح' یا کسی بھی عام آدمی کی طرح خوب کھاتا' خوب کھاتا''

یہ فن کار کے آخری الفاظ تھے لیکن اس کی آنکھوں کی بجھتی ہوئی چمک، فخر سے بتا رہی تھی کہ اس کا فاقہ اب بھی جاری ہے۔

نگران کی ہدایت پر شام تک پنجرہ صاف کر دیا گیا۔ فن کار کا وجود بھی بھوسے کے تنکوں کی طرح زمین میں جذب ہو گیا۔

دوسرے دن ایک نوجوان چیتا پنجرے میں داخل کر دیا گیا۔ ایک مدت سے ویران پڑے پنجرے میں زندگی کی رونق مچلتے دیکھ کر تماشائیوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ درندے کی طاقتور اُچھل کود سے پورا ماحول لبریز ہو گیا۔

سرکس کے کارکن چیتے کے سامنے اس کی پسندیدہ خوراک کا ڈھیر لگا دیتے۔ اور وہ اس پر وحشیانہ شدت سے ٹوٹ پڑتا۔ وہ اپنی آزادی کھو دینے پر ذرا بھی افسردہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا بھرپور بدن اپنے ہر عضو میں آزادی لیے حرکت کرتا نظر آتا۔ خاص طور پر اس کے جبڑوں کے آس پاس آزادی کی جھلک بہت نمایاں تھی جب اس کے وجود میں زندگی زور مارتی تو وہ یوں دھاڑتا کہ تماشائی لرز جاتے لیکن پھر بھی وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے پنجرے کی سلاخیں تھامے رہتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اب تماشائی وہاں سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔

فرانز کافکا

محتاج

بجھی ہوئی آگ سرد انگیٹھی، منجمد کمرہ، ٹھنڈی سانسیں، وحشی برف باری اور ہڈیوں میں اُترتی ہوا مجھے تپش کی ضرورت ہے۔ میں حرارت کی کمی سے مر رہا ہوں آگ روشن کرنے کے لیے میرے پاس کوئلے نہیں ہیں پیچھے سرد دیوار ہے سامنے موت کی یخ بستہ وادی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے مجھے آگ جلانی ہوگی۔ کوئلے لانے ہوں گے۔

کوئلوں کا بیوپاری میری مدد کرسکتا ہے لیکن وہ اتنے حاجت مند دیکھ چکا ہے کہ اب اُس پر عام منت سماجت کا اثر نہیں ہوتا۔ اُسے دلائل کے ساتھ یقین دلانا ہوگا کہ میرے پاس ایندھن بالکل ختم ہوگیا ہے اور اب فقط وہ ہی میری ٹھٹھری ہوئی دنیا کا سورج ہے اس کا انکار مجھے نابود کردے گا۔ مجھے وہ فقیر بننا ہوگا جو بند دروازے کی دہلیز پر آخری سانسیں لیتا ہے تو دربان اس کے آگے کچھ کھانے کو ڈالنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ کوئلوں کا بیوپاری چاہے کتنی سرد مہری اختیار کرچکا ہو مگر وہ کسی انسان کی ہلاکت کا سبب نہیں بننا چاہے گا۔

میری کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا کہ میں بیوپاری تک کس حالت میں پہنچتا ہوں۔ مناسب یہی ہوگا کہ میں کوئلوں سے خالی اپنی بالٹی پر سوار ہوکر جاؤں۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لیتا ہوں اور بالٹی میری اشد ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے روانہ ہوجاتی ہے۔ سیڑھیوں پر اسے دھچکے لگتے ہیں لیکن گلی میں آکر وہ ہوا میں نہایت ہموار سفر کرنے لگتی ہے۔ دنیا کا کوئی جانور اتنے وقار سے نہیں اُٹھتا۔ کوئی پرندہ اس شان سے زمین نہیں چھوڑتا۔ میں اور میری بالٹی منجمد ہوا کو چیرتے چلے جاتے ہیں۔ عمارتوں کی پہلی منزل سے نیچے، اور دروازوں کی سطح سے اوپر ..... بالآخر میں اس جگہ جاتا ہوں جہاں سے مجھے بیوپاری کا زمین دوز کمرہ نظر آتا ہے۔ کمرے کی ایک جانب کوئلوں کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ دوسری جانب ایک بڑی انگیٹھی دہک رہی ہے اور درمیان میں بیوپاری سر جھکائے حساب کرنے میں مصروف ہے۔ فالتو حرارت کی نکاسی کے لیے بیوپاری نے کمرے کی کھڑکی کھول رکھی ہے۔

''بھائی بیوپاری!'' میں سردی سے لرزتی آواز میں پکارتا ہوں۔ ''خدا کے لیے مجھے تھوڑے کوئلے دے دو۔ میری بالٹی خالی ہو کر اتنی ہلکی ہو چکی ہے کہ میں اس کے سہارے اُڑنے لگا ہوں۔ رحم کرو میں جلد از جلد تمھیں کوئلوں کی قیمت ادا کر دوں گا۔''

بیوپاری اپنے کان کے پیچھے ہاتھ کر وضاحت سے سننے کی کوش کرتا ہے ''یہ کیسی آواز آ رہی ہے؟؟'' وہ اپنی بیوی سے دریافت کرتا ہے۔ ''کوئی گاہک آیا ہے؟''

''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا''۔ اُس کی بیوی جواب دیتی ہے اور اطمینان سے دوبارہ سویٹر بننے لگتی ہے۔ کمرے کی خوشگوار حرارت میں وہ نہایت شگفتہ اور تازہ دم لگ رہی ہے۔

''تمھیں تمام مقدس چیزوں کا واسطہ۔ سنو!'' میں تقریباً رو پڑتا ہوں۔

''میں ہوں۔ میں تمہارا پرانا گاہک۔ معاملے کا کھرا اور دیانت دار فقط اس لمحے میں قوتِ خرید سے محروم ہوں''۔

''سنو'' بیوپاری سرگوشی کرتا ہے۔ ''کوئی ہے۔ ضرور کوئی ہے۔ میری سماعت ابھی اتنی بھی خراب نہیں ہوئی۔ یہ کوئی پرانا گاہک لگتا ہے۔ بہت پرانا گاہک۔ اِس کی آواز کس قدر دردناک ہے''

''تمہارا تو دماغ چل گیا ہے'' اس کی بیوی چبھتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ اور اپنی اُدھ بنی سویٹر کو سینے پر رکھ کر چند لمحے خاموش رہتی ہے ''کوئی نہیں ہے''۔ اُس کا لہجہ ہموار ہو جاتا ہے۔ ''گلی خالی پڑی ہے ہمارے تمام گاہکوں کے پاس کوئلوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ہم چاہیں تو اب دکان بند کر سکتے ہیں۔ آرام کر سکتے ہیں۔

''لیکن میں تو خالی بالٹی میں بیٹھا کانپ رہا ہوں''۔ یہاں اُوپر میری آواز منہ سے نکلتے ہی منجمد ہو کر پانی کی دھار سی بن جاتی ہے اور میرے سانسوں کے ساتھ نکلنے والی دھند چند لمحوں کے لیے میرا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ ''خدا کے لیے بندو ایک بار اوپر دیکھ لو۔ بس ایک بار۔ میں تمھیں فوراً نظر آ جاؤں گا میں کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہا۔ صرف میری بالٹی کا پیندہ کوئلوں سے ڈھک جائے تو میری دنیا سنور جائے گی۔ اس سے زیادہ کوئلے تو مجھے خوشی سے پاگل کر دیں گے۔ بس ایک بار مجھے بالٹی میں کوئلے گرنے کی آواز سنوا دو۔''

''میں آ رہا ہوں'' بیوپاری اُچھل پڑتا ہے۔

''ٹھہرو'' اس کی بیوی اُسے بازو سے پکڑ کر بٹھا دیتی ہے۔ ''تمہارے وہم کا کوئی علاج نہیں۔ میں خود دیکھ کر آتی ہوں۔ ٹھنڈی ہوا میں نکلے تو پھر رات بھر کھانسو گے۔ تمہارے وسوسے تمھیں مار

ڈالیں گے''

''اُسے کوئلے کی تمام قسمیں بتا دینا میں کھڑکی سے اُن کی قیمتیں بتا تا جاؤں گا''۔ بیوپاری آخری ہدایت کے طور پر چیختا ہے۔

''ٹھیک ہے!'' اُس کی بیوی کہتی ہے اور باہر نکلتی آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے دیکھ لیتی ہے۔

''تم پر خدا کی رحمت ہو۔ بیوپارن'' یہ کہتے ہوئے میں چبوترے پر اُتر جاتا ہوں''۔ بس اتنے کوئلے کہ بالٹی کا پیندہ ڈھک جائے۔ گھٹیا قسم کے ہی۔ میں پوری قیمت ادا کر دوں گا۔ بہت جلد بہت جلد'' میرے الفاظ عبادت گاہ کے میناروں پر بجنے والی گھنٹیوں کی آواز میں تحلیل ہو کر چہار اطراف گونجنے لگتے ہیں۔'' گاہک کیا چاہتا ہے؟ بیوپاری کھڑکی سے سر نکال کر پوچھتا ہے۔'' اجنبی کیا مانگ رہا ہے؟''

'' کچھ نہیں!'' اُس کی بیوی بلند آواز میں جواب دیتی ہے'' کچھ بھی نہیں مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیا۔ کچھ نہیں سنائی دیا۔ سب تمہارا وہم ہے۔''

''لیکن میں نے خود آواز سنی ہے۔'' بیوپاری مطمئن نہیں ہوتا۔

''چھ بجے کی گھنٹیاں بجی تھیں''۔ بیوی یوں کہتی ہے جیسے یہی حقیقت ہو'' قیامت کی ٹھنڈ پڑ رہی ہے اب ہمیں دکان بند کر دینی چاہیے''۔

وہ کچھ نہیں دیکھتی۔ وہ کچھ نہیں سنتی۔ اس کے باوجود وہ اپنی شال اُتار کر زور زور سے ہلاتی ہے تا کہ میں واپس ہوا میں اڑ جاؤں اور اسے کامیاب ہونے میں دیر نہیں لگتی کیونکہ میری بالٹی غیر معمولی خصوصیات کی حامل ہونے کے باجود مزاحمت کی صفت سے محروم ہے۔ یہ بہت ہلکی ہے۔ عورت کے دامن کی ہوا اسے فضا میں اُچھال دیتی ہے۔

''خبیث عورت!'' میں بلند ہوتی بالٹی سے گردن جھکا کر چیختا ہوں۔

''خبیث عورت' میں تھوڑے سے کوئلے مانگنے آیا تھا۔ گرم رہنے کے لیے زندہ رہنے کے لیے لیکن تو نے میرے وجود کی نفی کر دی۔ مجھے دروازے سے ہشکار دیا''۔

یہ کہتے ہوئے میرا رُخ پہاڑوں کی سمت ہو جاتا ہے اور میں منجمد وادیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

فرانز کافکا

انصاف

انصاف کے دروازے پر پہرے دار کھڑا ہے۔ ایک مسافر دور سے آتا ہے اور اندر جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ پہرے دار جواب دیتا ہے کہ فی الحال اُسے اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مسافر کچھ دیر سوچتا ہے اور پوچھتا ہے کہ بعد میں ایسا ہونا ممکن ہے؟

"ممکن ہے۔" پہرے دار کہتا ہے۔ "لیکن اس وقت تمھیں اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی"۔

دروازہ کھلا ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ مسافر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہرے دار کو اُس کی یہ حرکت مضحکہ خیز لگتی ہے۔

"اگر تمھیں اتنا ہی شوق ہے"۔ پہرے دار ہنس کر کہتا ہے۔ "تو میری اجازت کے بغیر اندر جانے کی کوشش کر دیکھو۔ لیکن یاد رکھنا! میں طاقت ور ہوں اور اندر کھڑے پہرے دار مجھ سے بڑھ کر طاقت ور ہیں۔ ہر کمرے کے لیے ایک پہرے دار مقرر ہے' ہر پہرے دار پہلے سے زیادہ خطرناک ہے۔ دو ہی کمروں بعد ایسا پہرے دار آجاتا ہے کہ میں بھی اُس کے چہرے پر نظر ڈالنے سے گریز کرتا ہوں"۔

مسافر کو اُن مشکلات کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر چلا تھا کہ انصاف کا گھر سب کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے لیکن اب وہ انتظار کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے؟ پہرے دار اُسے دروازے کے پاس ایک کونے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ وہاں وہ کئی دن اور کئی برس بیٹھا رہتا ہے اس دوران وہ اندر داخل ہونے کی کوشش مسلسل جاری رکھتا ہے۔

کبھی کبھی پہرے دار اُس کے ماضی کے حالات اور واقعات دریافت کرتا ہے مگر ذاتی سوالات کرتے ہوئے بھی پہرے دار کے چہرے کی لاتعلقی قائم رہتی ہے اور گفتگو کے اختتام پر وہ مسافر کو یہ بتانا کبھی نہیں بھولتا کہ فی الحال اُسے اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ پردیسی اپنے سامان کی ایک ایک چیز پہرے دار کو رشوت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پہرے دار تمام چیزیں قبول کرتا جاتا ہے اور کہتا ہے" یہ بھی کر دیکھو تمھیں کوشش کرنے کا حق حاصل ہے"۔

دور دروازے سے آنے والا مسافر ان تمام برسوں میں مستقل پہرے دار ہی کا چہرہ دیکھتا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ دوسرے تمام پہرے داروں کو بھول جاتا ہوں اور محسوس کرتا ہے کہ بس یہی پہرے دار انصاف تک پہنچنے کی راہ میں واحد رکاوٹ ہے۔ ابتدائی چند سال وہ اپنی بدقسمتی اور محرومی کو با آواز بلند کوستا ہے۔ لیکن ضعیف ہونے پر اُس کا لہجہ مدہم ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں وہ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ عمر بھر وہ پہرے دار کو اتنے غور سے دیکھتا رہا ہے کہ اب وہ پہرے دار کے لباس میں پائے جانے والے کیڑوں تک سے آشنا ہو چکا ہے۔ وہ ان کیڑوں کی بھی منتیں کرتا ہے کہ اُس کی مدد کریں اور پہرے دار کا ذہن بدلنے کی کوشش میں اُس کا ساتھ دیں۔

آخر مسافر کو اندھیرا پھیلتا محسوس ہوتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ اُس کی آنکھوں کی کمزوری کے باعث ہے یا واقعی روشنی کم ہو رہی ہے اندھیرے میں فقط انصاف کے گھر سے پھوٹنے والی روشنی کی کرن باقی رہتی ہے۔ مسافر کو اپنی زندگی کے دن پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان تمام برسوں میں اُس نے جو کچھ محسوس کیا۔ وہ اُس کے وجود میں ایک سوال بن کر اُبھرتا ہے۔ مسافر ناتوانی کے سبب اپنا جسم اُٹھانے سے معذور ہو چکا ہے' اس لیے وہ پہرے دار کو اشارے سے اپنے پاس جھکنے کو کہتا ہے۔ مسافر کی بات سننے کے لیے پہرے دار کو اب اپنی کمر دہری کرنی پڑتی ہے۔ اور اُسے یہ ناگوار گزرتا ہے۔

''اب تم مزید کیا جاننا چاہتے ہو؟'' پہرے دار تند لہجے میں کہتا ہے ''تمہارے تو سوال ہی ختم نہیں ہوتے''۔

''ہر شخص انصاف تک رسائی چاہتا ہے''۔ مسافر نحیف آواز میں کہتا ہے...... ''تو پھر اس تمام عرصے میں یہاں کوئی اور کیوں نہیں آیا؟''

پہرے دار کو محسوس ہو جاتا ہے کہ مسافر اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے وہ اپنا منہ اُن کے کان کے نزدیک لے جاتا ہے تا کہ مسافر واضح طور پر سن سکے۔

''یہاں کسی اور کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' پہرے دار ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے۔ ''یہ دروازہ صرف تمہارے لیے بنایا گیا تھا...... اور اب تمہارے بعد میں اُسے بند کر دوں گا''۔

فرانز کافکا

فرمان

شہنشاہ نے بسترِ مرگ سے تمہارے نام ایک فرمان جاری کیا ہے۔ تم ناچیز و نابود ہستی جو شہنشاہیت کے سورج سے لامحدود فاصلے پر...... ان گنت سایوں کے درمیان ایک حقیر سایہ ہو۔ تمہارے نام شہنشاہ نے اپنا خصوصی فرمان بھیجا ہے۔

شہنشاہ نے شاہی پیغامبر کو اپنے بستر کے قریب جھکنے کا حکم دیا اور اس کے کان میں اپنا مدعا بیان کیا۔ شہنشاہ کے لیے یہ فرمان اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ اس نے بعد میں پیغامبر کو ہدایت کی کہ اب وہ فرمان کے الفاظ واپس اس کے کان میں دہرائے۔ پھر اس نے سر کی جنبش سے بتایا کہ پیغامبر فرمان کے الفاظ درست سمجھا ہے۔ شہنشاہ کے بستر کے گرد کھڑے تمام شہزادے اور مشیر اور وزیر اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ شہنشاہ نے خاص طور پر تمھیں کوئی بات کہنی چاہی تھی۔

پیغامبر، جو کہ نہایت طاقت ور اور صحت شخص ہے پیغام پاتے ہی تمہاری جانب گامزن ہو چکا ہے راستے میں رکاوٹ بننے والے ہجوم کو وہ کبھی بائیں ہاتھ سے اور کبھی دائیں ہاتھ سے ہٹاتا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ناقابلِ عبور مقام پر پیغامبر اپنے سینے کی جانب اشارہ کرتا ہے جہاں سورج کا چمکدار نشان اس بات کا گواہ ہے کہ وہ شاہی فرمان پہنچانے پر مامور ہے نشان دیکھتے ہی اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یوں اسے کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں ہے۔ لیکن ہجوم بے پایاں ہے۔ اس میں شامل افراد لامحدود ہیں۔ اگر وہ کھلے میدانوں میں پہنچ جائے تو اس کی رفتار تیز ہو سکتی ہے اور تم بہت جلد اپنے دروازے پر شاہی نامہ بر کی خوشگوار دستک سن سکتے ہو مگر ایسا کیوں کر ہو؟ وہ اب تک اپنے وجود کی پوری طاقت کے ساتھ محل کی مرکزی خواب گاہ سے باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے اگر وہ زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد وہاں سے نکل بھی آیا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسے زینوں سے اترنے کے لیے پہلے سے زیادہ محنت درکار ہوگی۔ اگر وہ زینوں سے اترنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ عمل بھی لاحاصل

ہوگا۔اس کے سامنے دربار عبور کرنے کا مرحلہ آئے گا اور دربار کے بعد محل کا بیرونی دائرہ اور ایک بار پھر زینے اور دربار اور پھر محل کا تیسرا دائرہ...... اور یوں ہزاروں سال گزر جائیں گے بفرض محال وہ کئی زمانوں کی جدوجہد کے بعد محل کے آخری دروازے سے باہر نکل بھی آیا تو کیا ہوگا؟ اس کے قدموں کے سامنے دنیا کا دارالخلافہ اپنے ہی وجود کی پستیوں سے لبریز ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا۔اور اس مقام سے کوئی نہیں گزر سکتا کبھی نہیں گزر سکتا چاہے وہ کسی مردہ شخص کا پیغامبر ہی کیوں نہ ہو۔لیکن تم گہری ہوتی شام کے اندھیرے میں اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھے سوچتے ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

فرانز کافکا

دستاویز

محسوس ہوتا ہے کہ ہماری بستی کے دفاعی انتظامات میں ابتدا سے کچھ کمزوری رہ گئی تھی جس کے باعث آج ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہم اپنے روزمرہ کاموں میں اتنے مشغول رہے کہ اس طرف توجہ ہی نہ دے پائے لیکن گزشتہ چند دنوں سے جو کچھ ہو رہا ہے اس نے ہمیں مضطرب کر دیا ہے۔

میں شہر کے چوک پر جوتے بنانے کا کام کرتا ہوں ایک صبح جوں ہی میں نے اپنی دکان کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چوک سے منسلک ہر سڑک پر سپاہیوں کا پہرہ ہے۔ اجنبی شکلوں والے ان سپاہیوں کا ہماری فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ شمال کی وحشی نسلوں کا ہراول دستہ ہے مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ دور دراز وادیوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہمارے دارالخلافہ کے چوک تک کیسے آ گئے جبکہ ہمارا شہر اپنے ملک کی سرحدوں کے بہت اندر واقع ہے بہرحال وحشی یہاں تک پہنچ چکے ہیں اور ہر روز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

وہ اپنی فطرت کے مطابق کھلے آسمان تلے قیام کرتے ہیں۔ سر پر چھتوں کی موجودگی سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک وہ اپنی تلواروں کو چمکانے' نیزوں کی نوکیں تیز کرنے اور شہ سواری کی مشق میں مصروف رہتے ہیں۔ شہر کا خوبصورت اور پر سکون چوک ان کی آمد کے بعد سے اصطبل نما جگہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ابتدا میں ہم لوگ موقع ملتے ہی چوک صاف کرنے کے لیے اپنی دکانوں سے نکل آتے تھے اور تندہی سے کام کرتے تھے لیکن اب ہم ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک تو وحشیوں کی تعداد زیادہ ہونے سے گندگی میں اضافہ ہمارے بس سے باہر ہو گیا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اب وہ کام کے دوران ہمیں کوڑے مارتے ہیں اور بعض اوقات گھوڑوں کے سموں تلے روندنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وحشیوں سے گفتگو ناممکن ہے انہیں ہماری زبان کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا' اور ان کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے۔ وہ آپس میں پہاڑی کووں کی طرح باتیں کرتے ہیں ان کی دل خراش آوازوں سے ہماری سماعتیں متاثر ہو رہی ہیں۔ انہیں ہماری اخلاقیات یا معاشرتی قدروں سے کوئی غرض

نہیں ہے۔ وہ ہمارے تہذیبی اداروں پر قہقہے لگاتے ہیں۔ ہمارے اشاروں کی زبان بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے بس ہنستے ہیں۔ شور مچاتے ہیں اور کوؤں کی طرح چیختے رہتے ہیں۔ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے جبڑے دکھ جاتے ہیں اور ہم ہاتھ ہلا ہلا کر نڈھال ہو جاتے ہیں لیکن وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ اکثر وہ اپنے چہرے بگاڑ لیتے ہیں کبھی کبھی ان کا منہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ اور نچلا سفید حصہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس موقع پر ان کے منہ سے جھاگ بھی نکلتی ہے لیکن اس حرکت سے وہ کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتے یہ دھمکی بھی نہیں ہوتی بس اس طرح کرنا ان کی فطرت ہے۔

جو چیز بھی انہیں پسند آئے وہ لے جاتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں طاقت بھی استعمال نہیں کرنی پڑتی۔ وہ اپنی مطلوبہ چیز کی طرف بڑھتے ہیں' اور ہمیں ان کا راستہ چھوڑ کر اپنی رضامندی کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

میرے ذخیرے سے بھی انہوں نے کئی چیزیں اُٹھالی ہیں' لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ قصائی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں تو میری شکایت دم توڑ دیتی ہے۔ وہ قصائی کا سارا گوشت کھا جاتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی گوشت خور ہیں۔ اس سے پہلے ہماری بستی میں کبھی کسی نے گوشت کھانے والا گھوڑا نہیں دیکھا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وحشی اور اس کا گھوڑا ایک ہی گوشت کے لوتھڑے کو مخالف سمتوں سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ قصائی تمام وقت اپنی دکان میں بیٹھا کانپتا رہتا ہے۔ وحشیوں کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہے ہم چندہ کر کے قصائی کا نقصان کسی حد تک پورا کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو قصائی دوسرے دن گوشت نہیں لا سکے گا۔ اور اگر وحشیوں کو گوشت نہ ملا تو نہ جانے وہ کیا کریں۔ یوں تو وہ گوشت ملنے کے بعد بھی نہ جانے کیا کریں۔

ذبح کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے قصائی ایک دن زندہ بیل لے آیا تھا۔ آئندہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ میں اپنی دکان کے تہہ خانے میں چمڑے کے ٹکڑوں میں منہ چھپا کر لیٹ گیا تھا مگر اس کے باوجود ایک گھنٹے تک بیل کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔

وحشیوں نے دائرہ وار کھڑے ہو کر زندہ بیل پر دانت گاڑ دیے تھے' اور اسے ہر سمت سے ادھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ شام کو میں ڈرتے ڈرتے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ بیل کے ڈھانچے کے گرد' وحشی یوں بدمست پڑے تھے جیسے جشن کے اختتام پر مے نوش شراب کے بڑے برتن کے آس

پاس لیٹے نظر آتے ہیں۔
یہ ہی وہ موقع تھا جب میں نے بادشاہ کو محل کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا۔ عام طور پر وہ محل کے اندرونی کمروں تک محدود رہتا تھا لیکن اس دن بیرونی راہداری کے جھروکے سے سر لگا کر جھانک رہا تھا۔ چوک پر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔
اب کیا ہوگا؟ ہم سب کے ذہنوں میں یہی سوال گونجتا ہے بادشاہ کے محل کی کشش وحشیوں کو یہاں تک کھینچ لائی ہے' اور ہم میں سے کوئی بھی انہیں واپس دھکیلنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ محل کے آہنی دروازے بند رہتے ہیں۔ وحشیوں کی آمد سے قبل جو شاہی دربان ان دروازوں کے باہر کھڑے پہرہ دیتے تھے' اب وہ سلاخوں کے اندر ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ ہم کب تک وحشیوں کا عذاب سہیں گے؟ یوں لگتا ہے جیسے بستی کے دفاع کا فریضہ کاریگروں اور ہنر مندوں کو سونپ دیا گیا ہے مگر ہم یہ فرض انجام دینے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم نے کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ تو پھر کون ہے جسے یہ غلط فہمی ہوئی ہے؟ ہم سب کس کی غلطی سے برباد ہو رہے ہیں؟؟

فرانز کافکا

دوغلا

میرے پاس ایک جانور ہے جو پچاس فی صد بلی اور پچاس فی صد بکری ہے۔ یہ عجیب جانور مجھے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا لیکن اس کی نشوونما میرے سامنے مکمل ہوئی ہے۔ ابتدا میں اسے دیکھ کر بلی سے زیادہ بکری کا خیال آتا تھا مگر بعد میں یہ بلی اور بکری میں برابر تقسیم ہو گیا۔ آنکھوں کی چمک اور بے چینی میں دونوں جانوروں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جسم کے بالوں میں بھی دونوں کا امتزاج ہے اور اس کی چال بھی کبھی بلی کی طرح بے آواز اور پرسکون ہوتی ہے اور کبھی یہ بکری کے بچے کی طرح قلانچیں بھرتا ہے۔ سردیوں کی دھوپ میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر یہ خود کو گیند کی طرح گول کر کے اونگھتا ہے اور باہر چراگاہ میں نکل کر ایسے ہیجانی انداز میں دوڑتا ہے کہ کبھی کبھی اسے پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ راستے میں بلیاں آئیں تو یہ ایک طرف کو دبک جاتا ہے مگر بکریاں دیکھ کر بھڑنے لگتا ہے۔ چاندنی راتوں میں اسے مکان کے چھجوں پر ٹہلنے کا شوق ہے چوہوں سے اسے کوئی رغبت نہیں اور نہ ہی اسے کبھی غراتے ہوئے دیکھا گیا ہے مرغیوں۔ کے ڈربے کے سامنے یہ گھنٹوں گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے لیکن اس پر کسی جاندار کی ہلاکت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

میرے پالتو کی خوراک صرف دودھ ہے۔ نوکیلے دانتوں کے ساتھ یہ دودھ پیتا بہت معصوم لگتا ہے بچوں کے لیے اس کی شخصیت میں بہت کشش ہے چھٹی والے دن اُسے گود میں لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور محلے کے بچے میرے پاس کھڑے ہو کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پھر مجھ سے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن کے جواب کوئی نہیں دے سکتا۔

''ایسا جانور دنیا میں ایک ہی کیوں ہے؟''

''یہ کہاں سے آیا تھا؟''

''اس سے پہلے کبھی کوئی جانور پیدا ہوا ہے؟ اگر یہ مر گیا تو کیا ہوگا؟''

''اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کے بچے کیوں نہیں ہوتے؟''

میں کوئی جواب دیے بغیر اپنی ملکیت کی نمائش جاری رکھتا ہوں۔ کبھی کبھی بچے اپنے ساتھ بلیاں

لے آتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو وہ دو بکریاں بھی لے آئے۔ مگر ان کی توقعات کے برعکس جانوروں کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں اُبھری۔ وہ آپس میں گنگ نگاہوں کا تبادلہ کرتے رہے اور پھر یوں لگا جیسے انہوں نے ایک دوسرے کے وجود کو مقدس حقیقت کے طور پر قبول کرلیا ہے۔

گود میں بیٹھ کر میرا پالتو تو خوفزدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے دل میں کسی چیز کا لالچ باقی رہتا ہے میرے سینے سے لگ کر اُسے دنیا کی تمام خوشیاں حاصل ہوجاتی ہیں۔ وہ میرے خاندان کا وفادار ہے۔ ہم نے اسے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ ایسا جانور جس کے دنیا میں اَن گنت ادھورے رشتے دار موجود ہوں لیکن کسی سگے بہن بھائی کا سوال ہی پیدا نہ ہو وہ مکمل طور پر اسی خاندان سے وابستہ ہوگا جس نے اسے پناہ دی۔

کبھی کبھی اسے مجھ پر بے تحاشا پیار آتا ہے۔ تب وہ منہ سے عجیب آوازیں نکالتا ہے اور میرے قدموں سے یوں لپٹ جاتا ہے کہ اسے مجھ سے جدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے موقع پر یوں لگتا ہے جیسے وہ بلی اور بکری ہونے کے علاوہ کتا بھی بننا چاہتا ہے۔

ایک دن جب مجھے اپنی کاروباری مشکلات سے نکلنے کا کوئی رستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور میں بے پناہ اضطراب کا شکار ہو کر اسے گود میں لے کر بیٹھ گیا تو کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو رواں تھے۔ مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ یہ بلی اور بکری کا ملاپ' انسانوں جیسے جذبات بھی رکھتا ہے۔ میں نے اپنے باپ سے وراثت میں اور کچھ نہیں پایا لیکن یہ ورثہ بہت انوکھا ہے۔

بلی کی بے چینی اور بکری کی بے چینی میں بہت فرق ہوتا ہے' مگر میرے پالتو میں ان دونوں جانوروں کی بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے وجود سے باہر نکلتا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے پہلو میں کھڑے ہو کر سامنے کے پنجے میرے کندھے پر رکھ کر اپنا منہ اس طرح میرے کان سے لگا دیتا ہے جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ اس کے بعد وہ میری جانب دیکھتا بھی ہے جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میں کیا سمجھ پایا ہوں۔ اس کا دل رکھنے کے لیے میں یوں گردن ہلاتا ہوں گویا اس کی پوری بات سمجھ گیا ہوں۔ اس پر وہ خوش ہو کر کمرے میں رقص کرنے لگتا ہے۔

ممکن ہے کہ قصائی کی چھری اس جانور کا واحد علاج ہو' مگر خاندانی ورثہ ہونے کے باعث میں اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کروں گا۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب اس کی سانس از خود بند ہوگی۔ ہر چند کہ کبھی کبھی وہ کسی انسان کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے یوں گھورتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ تم میں ہمت ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔

فرانز کافکا

یہ کہانی

"......یہ کہانی کائنات گیر ہے۔ اسے دنیا کی ہر کتاب میں شامل کیا جاتا ہے تمام اسکولوں کے تختہ سیاہ پر یہی کہانی تحریر کی جاتی ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچتی ہیں۔ بوس و کنار کرنے والے اپنی سرگوشیوں میں یہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ سپاہی یہ کہانی دہراتے میدانِ جنگ کو روانہ ہوتے ہیں۔ دکانداروں اور گاہکوں کی گفتگو میں اس کہانی کی باز گشت سنائی دیتی ہے۔ مذہبی تقریروں میں اسی کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ روزانہ اخباروں میں شائع ہوتی ہے اور مسافر اسے پڑھنے کے بعد ساتھ والے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ مطالعہ گاہوں میں بیٹھے تاریخ دان اس کہانی کی قدامت پر حیران ہوتے ہیں۔ ٹیلی گرام اس لیے ایجاد ہوا تھا کہ یہ کہانی دنیا میں زیادہ تیزی سے پھیل سکے۔ آثارِ قدیمہ کی تلاش میں ہونے والی کھدائیوں سے یہی کہانی نکلتی ہے۔ بلند و بالا عمارتوں کی سیڑھیاں اس کہانی کو چھت تک لے جاتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح اجنبی جگہوں پر اس کہانی کا ذکر چھیڑتے ہیں لیکن ان سے پہلے وحشی نسلوں کے افراد مقامی لوگوں سے اس کا تذکرہ کر چکے ہوتے ہیں۔ ستارے یہی کہانی سناتے ہیں۔ جھیلوں پر اسی کا عکس نظر آتا ہے۔ دریا کی لہریں اسے پہاڑوں سے نیچے بہا لاتی ہیں لیکن بادل اُسے دوبارہ چوٹیوں پر بکھیر دیتے ہیں۔
اور تم......تم یہاں بیٹھ کر اس کہانی کے بے ربط ہونے کی شکایت کرتے ہو۔ تم نے یقیناً تلخ بچپن گزارا ہے......"

"......جو پیغام میں بھیج رہا ہوں وہ کسی کو نہیں ملے گا۔ اس تحریر کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا جائے گا۔ کوئی میری مدد کو نہیں پہنچے گا۔
اگر شہر میں اعلان بھی کرا دیا جائے کہ میری مدد کو پہنچنا ضروری ہو گیا ہے تب بھی کھڑکیاں اور دروازے بند رہیں گے۔ میرے بارے میں سنتے ہی ہر شخص اپنے بستر پر جا کر سونے کی کوشش کرے گا۔ چادر سے منہ ڈھانپ لے گا......اور اس کی وجہ بھی ہے۔
کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا بھی ہے کہ میں کون ہوں تو اسے یہ نہیں

معلوم کہ میں کہاں ہوں اور بفرضِ محال کسی کے دھیان میں آ بھی جاتا ہے کہ میں کہاں ہوں تو اسے یہ قطعی علم نہیں ہوتا کہ میری مدد کیسے کی جا سکتی ہے۔

''میری مدد کرنے کا خیال آنا ایک بیماری ہے اور اس بیماری کا واحد علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے بستر پر جا کر کچھ دیر کے لیے گہری نیند سو جائے......''

یہ کافکا ہے۔ خواب آلود' سحر انگیز' حیرت زدہ اور حیران کن کافکا۔

دنیا میں جتنے افراد ہیں اتنے ہی اعصابی امراض ہیں مگر آج تک کوئی کافکا جیسے دل کش اور تہہ دار انداز میں اپنا روگ بیان نہیں کر سکا۔

''......تنگ آ کر میں خود سے باہر نکلا۔ ہوا میں مکے چلائے' اور اپنے دشمن کو فنا کرنے کے بعد پرسکون ہو کر خود میں واپس آ گیا''۔

کافکا اپنے نظارے میں محو کہاں پہنچ گیا تھا! بحیثیت ادیب اس نے ایک غیر دریافت شدہ سمت میں سفر شروع کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ سارتر کا پیش رو ہے مگر سارتر نے گہرائی سے واپسی پر بیان کا سیدھا راستہ اختیار کیا' جبکہ کافکا علامتوں سے لتھڑا ہوا واپس آیا۔

پہاڑ کی طرح اٹل باپ کے سائے میں کافکا کی شخصیت ادھوری رہ گئی تھی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تقریباً تمام تخلیقات نامکمل ہیں۔ اس کی زندگی بھی ناتمامی کی حالت میں اختتام پذیر ہوئی مگر جس طرح بہت خوبصورت عورت کی کج ادائی بھی اس کی ادا بن جاتی ہے کافکا اتنا عظیم افسانہ نگار تھا کہ اس کے افسانوں کی ناتمامی ان کی دل کشی میں اضافے کا سبب بن گئی۔

''میری کہانیاں ثابت کرتی ہیں کہ ناقابلِ بیان' ناقابلِ بیان ہوتا ہے......اور یہ بات سب لوگ پہلے سے ہی جانتے ہیں۔

کافکا نے اپنے ناقابلِ بیان اندیشوں اور وسوسوں کے لیے نہایت ٹھوس علامتیں تلاش کیں اور انہیں بنیاد بنا کر وہ اپنے اندر کو یوں بیان کرنے لگا جیسے عظیم بیانیہ ناولوں کے خالق شہروں' صحراؤں اور جنگلوں کی جزئیات بیان کرتے ہیں۔

کافکا کے اس اچھوتے انداز نے قصہ گوئی کی روایت میں ایک ایسی جہت کا اضافہ کیا جو اس سے قبل یکسر مفقود تھی۔

کافکا کے انتہائی منفرد اسلوب سے افسانے کی سلطنت میں اولاً خاموشی چھا گئی اور پھر طوفان برپا ہو گیا۔ نازی پارٹی نے اقتدار حاصل کرتے ہی جرمنی میں کافکا کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دبانا

چاہا۔ مگر اس دوران کافکا کی تحریریں فرانس پہنچ چکی تھیں۔ فرانس پہنچنے پر ہوا کی تندی میں کمی واقع ہوئی، دھول بیٹھی، تو کافکا کے اصل خدوخال واضح ہوئے اور جدید فرانسیسی ادب کے ستون، البرٹ کامیو اور سارتر جرمن زبان کے اس خواب آلود عقبری کی تخلیق کردہ سہم ناک فضا میں داخل ہوئے اور حیرت سے الٹے واپس آئے۔

''کافکا کے فن کی اصل خوبی یہ ہے کہ ایک بار پڑھنے والا اسے دوبارہ ضرور پڑھتا ہے اور جو دوبارہ پڑھ لیتا ہے وہ تیسری مرتبہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا...... دنیا کی تمام بڑی تحریروں کی یہی خاصیت ہوتی ہے''۔ البرٹ کامیو نے کافکا کو فرانسیسی قوم سے متعارف کراتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

افسانہ نگاروں کا افسانہ نگار فرانز کافکا 1883ء میں چیکوسلاواکیہ کے شہر پراگ میں پیدا ہوا۔ پراگ کی عام زبان چیک تھی مگر وہاں جرمنی بولنے والوں کا بھی ایک طبقہ تھا۔ یہودی خاندان میں جنم لینے کے باعث کافکا اس محدود جرمن حلقے کی نمائندگی سے بھی محروم ہو گیا۔ کافکا اقلیت در اقلیت تھا۔

''جب میرا خود سے ہی کوئی تعلق نہیں ہے تو یہودیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' اس نے لکھا۔ اقلیت کو تمام عمر دوسروں کا مذاق سہنے کے علاوہ کبھی کبھی خود اپنی تحقیر بھی کرنی پڑتی ہے۔ کافکا کے تمام کردار کسی ستم انگیز صورتِ حال سے نکلنے کی لایعنی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں اور کرداروں کے ذریعے اپنی حالت بیان کرنے میں کافکا کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

ہر ادیب کی طرح کافکا لکھنے سے سکون حاصل کرتا تھا اسی لیے مضطرب کافکا دن رات لکھنا چاہتا تھا، مگر بیرونی حالات اسے نوکری کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

''نوکری کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے مقبرے کے لیے پیسے جمع کر رہا ہو''۔ وہ اس طرح باتیں کرتا رہا اور سارا دن ایک انشورنس کمپنی کے بدمزا ماحول میں بند رہنے کی سزا جھیلتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ اس صورتِ حال سے بے چین ہو کر دیوانہ وار تحریر سے تسکین حاصل کرتا۔ یہ مقدس بے چینی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی کتابوں کے تمام بڑے جملے اسی کیفیت میں تخلیق ہوئے ہیں۔ کافکا کی تحریر بھی اپنی انتہا پر پہنچ کر الہامی محسوس ہوتی ہے۔ یکساں کیفیت سے جنم لینے والے الفاظ یکساں تاثیر رکھتے ہیں۔ کافکا کو ڈوب کر پڑھنے والے بھی زندگی بھر کے لیے کافکا سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

''افسانہ لکھنے کے دوران......'' کافکا نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا''......کئی بار میں خود کو اپنی پشت پر سوار کر کے چلتا ہوں...... مجھے اپنا بوجھ ڈھونا پڑتا ہے''۔

آئن اسٹائن اپنے دوست کو کافکا کے افسانوں کی کتاب لوٹاتے ہوئے مسکرا دیا۔

''اس کے افسانے......'' آئن اسٹائن نے کہا'' دماغ پر خراشیں ڈال دیتے ہیں''۔

معلوم انسانی تاریخ کے سب سے پُر تخیل اور ذہین ریاضی دان کا یہ جملہ کافکا کے افسانوں کو بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

لیکن کافکا کی تمام تحریریں عظمت کے اس درجے پر فائز نہیں ہیں۔ اس کے ناول نہایت اچھوتے اور طاقتور خیال پر تعمیر ہونے والی کمزور عمارتیں ہیں۔ اس کے خطوط اور ذاتی ڈائری کے اوراق بھی جگہ جگہ چنگاریاں اڑانے کے باوجود بحیثیتِ مجموعی خشک ہیں مگر اس کے مختصر افسانے دفعتاً ذات کے پاتال میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اور وجود کی تہ میں نہایت پیچدار جنگل اور جذب کر لینے والے دلدل ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں شعور و لاشعور کا تصادم اتنے دلکش انداز میں بیان کرتا ہے کہ اکثر اوقات کافکا کو دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ماننے میں قطعاً تامل نہیں ہوتا۔

کوئی افسانہ نگار کافکا سے زیادہ قدرت کی ستم ظریفی سے آشنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آدمی پیدائش سے موت تک نہایت کڑی قید میں ہونے کے باوجود خود کو آزاد تصور کرتا ہے اور جب فرد کو احساس ہوتا کہ وہ اب تک محض خود فریبی کے سہارے زندہ رہا ہے اس وقت تک انفرادی زندگی تقریباً گزر چکی ہوتی ہے خود کو مختارِ کل سمجھنے والا انسان مجبورِ محض ہے اور یہ اس کا مقدر ہے۔

؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کافکا پر یہ حقیقت وقتِ مرگ سے پہلے منکشف ہو گئی تھی۔ یہ انکشاف اس کا مسئلہ تھا اور اپنے افسانوں میں کافکا نے اس مسئلے کا مؤثر ترین اظہار کیا ہے۔

''ممکن ہے کچھ لوگ میرے بارے میں سوچتے ہوں لیکن مجھے اس کا علم نہیں ہے''۔

کافکا کی شہرت بعد از مرگ شروع ہوئی اس لیے اس کے بارے میں دنیا بھر میں اتنے لوگوں نے جو کچھ سوچا وہ اس سے باخبر نہ ہو سکا۔ کافکا کے فن اور شخصیت پر پچاس برسوں میں لکھی جانے والی کتابوں کی مجموعی تعداد شکسپیئر پر تین سو سال میں لکھی جانے والی کتابوں سے زیادہ ہے۔

تپ دق میں مبتلا کافکا نے اکتالیس برس کی عمر میں ویانا کے نزدیک ایک پُر فضا قصبے میں انتقال کیا۔ مرنے سے قبل اس نے اپنے دوست میکس براڈ سے درخواست کی کہ اس کے بعد اس کی تمام تحریریں نذرِ آتش کر دی جائیں۔ یہ کافکا کی بے پناہ خوبصورت ادبی شخصیت کی آخری ادا تھی۔

میری لیوین

زندگی

''تم کتنے مردہ لوگوں کو جانتے ہو؟'' مائیک نے اچانک سوال کیا۔
مجھے معلوم تھا کہ مائیک کے مقابلے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن خاموش رہ کر میں خود کو کمتر ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''تمہارا مطلب ہے' جنات...... بھوت وغیرہ؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔
''نہیں'' مائیک نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے مرے ہوئے انسان...... لاشیں۔ کتنی دیکھی ہیں؟''
''لاشیں؟''
''ہاں''
''لیکن انہیں تو دفن کر دیا جاتا ہے۔ زمین کے اندر''۔
''تین دن تک نہیں دفنایا جاتا''۔ مائیک میری کم علمی پر مسکرا رہا تھا۔
''انہیں نہلایا جاتا ہے۔ کھینچ تان کر لٹایا جاتا ہے۔ پھر کوئی شخص ساری رات ان کی نگرانی کرتا ہے تین دن سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے ورنہ ان کی آنکھیں ایسی ہو جاتی ہیں''۔ مائیک نے اپنی آنکھوں کے نچلے پپوٹے کھینچ کر ڈھیلے اُوپر کو اٹھائے' اور ایک خوفناک منظر کا عملی مظاہرہ کیا۔ ''اُن سے بو آتی ہے...... وہ پھولنے لگتی ہیں''۔ اُس نے آنکھوں سے انگلیاں ہٹا کر مزید تفصیل بیان کی۔
''دیکھو! دیکھو! گر پڑو گے'' میں نے تیزی سے کہا۔ وہ پھولی ہوئی لاش کا حجم دکھانے کے لیے بازو پھیلا رہا تھا جس سے اس کا توازن بگڑ سکتا تھا میں اور مائیک بڑے پھاٹک کے ستونوں پر آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
''تم کتنے ایسے لوگوں کو جانتے ہو' مائیک جو...... جو مر گئے''۔ میں مائیک کے تجربے اور دنیاوی دانش کے سامنے خود کو ہمیشہ بہت بے حیثیت محسوس کرتا تھا۔
''اوہ۔ اُس نے کندھے اچکائے۔ بے شمار۔ کس کس کا نام لوں۔ مگر یہ طے ہے' تم کسی کو نہیں جانتے۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''۔

''میرے دادا فوت ہو چکے ہیں''
''کب؟''
''جس سال میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔''میری پیدائش کے دوسرے دن میرے دادا فوت ہو گئے تھے۔ دوسرے ہی دن۔''میں نے اہمیت جتلانے کے لیے بات کو دہرایا۔ یہ وہ بات تھی جو میری موجودگی میں امی اکثر لوگوں کو بتایا کرتی تھیں۔
''چپ کرو، بے وقوف'' مائیک کے لہجے میں تمسخر تھا۔''تم اپنے دادا کو ان لاشوں میں شمار نہیں کر سکتے جو تم نے دیکھیں۔ اس طرح تو تمہارے دادا کے دادا کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اور اُن کے دادا کا بھی اور ان کے...... اور ان کے''۔ اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ مجھ پر ہنسنے لگا۔''قبرستان ایسے مردوں سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا...... اگر تم کدال اٹھا کر زمین کھودنی شروع کر دو...... کہیں سے بھی...... تو کچھ دیر بعد تمھیں ہڈیاں ملیں گی۔ کیا سمجھے ہڈیاں...... انہیں کون جانتا ہے؟ ناں! میں اُنھیں نہیں گنتا جنہیں مرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ یا کم از کم جن کی لاش کے سامنے کھڑے نہیں ہوئے جیسے...... جیسے میرے انکل باٹ تھے۔ کرسی پر بیٹھے اُبلا ہوا انڈا کھا رہے تھے۔ اور مر گئے...... بس ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے ہاتھ میں انڈا۔ اور مر گئے...... بس...... اور وہ دو بوڑھی بہنیں۔ اتنی بوڑھی تھیں کہ چھوٹی بڑی کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا پہلے ایک مر گئی پھر دوسرے ہفتے دوسری مر گئی۔ لوگ کہنے لگے اتنے کم وقفے سے مرنا تھا تو ساتھ مر جاتیں'ایک ہی بار ساری رسمیں ادا ہو جاتیں لیکن...... لیکن وہ ساتھ مرتیں تو میں انہیں ایک ہی لاش گنتا سمجھے؟ بہر حال کتنی ہو گئیں؟؟ اُس نے مجھ سے فخریہ انداز میں پوچھا۔
''تین'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔'' اور دل میں دُعا کی کہ اسے کوئی اور واقعہ یاد نہ آئے۔
''ٹھیک ہے''۔ اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پہلے میں ذرا مزیدار والی لاشیں گن لوں''۔ مائیک کو ہرانا محلے کے کسی لڑکے کے بس میں نہیں تھا بچوں کے والدین اسے بگڑا ہوا لڑکا سمجھتے تھے اور اپنے بیٹوں کو اس کی صحبت میں بیٹھنے سے منع کرتے تھے لیکن ہمارے لیے وہ اس منصب پر فائز تھا جس کی سب کے دل میں آرزو تھی۔
''سنو مائیک'' میں نے اُسے سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا۔''تم میرے لیے مزیدار مردے مت سوچو...... جتنے دیکھے ہیں سب بتا دو' کیوں کہ میرے لیے تو سب ایک جیسے ہیں۔ میں نے تو آج

تک ایک بھی لاش نہیں دیکھی......''

مائیک میری جانب دیکھ کریوں مسکرایا جیسے اُسے میری بے چارگی پر ترس آ رہا ہو۔

''میں نے تو ایسے ایسے تابوت دیکھے ہیں''۔اُس نے کہا'' حالانکہ سب سے دل چسپ واقعہ انکل بات ہی کا ہے' کیونکہ ابھی زندہ ابھی مردہ کا لطف ہی کچھ اور ہے اس طرح کا موقع تو قسمت سے ملتا ہے۔لیکن عام لاشیں......تم نے تو عام مردہ بھی نہیں دیکھا۔تم ہمیشہ اپنی امی کی گود میں بیٹھے رہے۔وہاں سے اٹھتے تو کچھ نظر بھی آتا......''

میں نے سر جھکالیا۔مجھے شرمندگی ہورہی تھی۔

''یاد آیا......سنو'سنو'ادھر دیکھو'' مائیک اچانک ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔'' آج ریلوے گارڈ کے گھر کے پیچھے تابوت کی تیاری ہے۔وہ مرگیا وہ......ریل کی پٹریوں کے اس طرف کچے گھر والی عورت کا بیٹا......یاد آیا؟ وہی عورت جو پھاٹک کھولتی بند کرتی ہے تم نے اس کا بیٹا دیکھا تھا؟؟''

''موٹا سا......لال بالوں والا......وہ''

''ہاں۔ہاں۔وہی۔وہ مرگیا......وہ ہر وقت کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔دھوپ میں آنکھیں بند کرکے اونگھتا تھا''۔مائیک اب دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا۔وہ ستون سے گرنے کی قطعی پروا نہیں کررہا تھا۔

''پھاٹک کھولنے والی کا بیٹا مرگیا......وہ یہاں سے کھسکا ہوا تھا''۔مائیک نے کنپٹی پر اُنگلی گھمائی

''بے چارہ......بہر حال مرگیا......اچھا ہوا نا' یاد آگیا؟ تمہاری قسمت تھی......تمھیں لاش دیکھنے کا موقع مل گیا۔مل گیا نا؟'' یہ کہہ کر مائیک نے ستون سے خاردار جھاڑیوں میں اتنے اطمینان سے چھلانگ لگادی جیسے کوئی بلی یا کتا دیوار سے کودتا ہے''۔اسے کانٹے بھی نہیں چبھتے''۔میں نے حیرت سے سوچا۔

''چلو! چلو!'' اس نے مجھے کودنے کا اشارہ کیا۔''بس یہی موقع ہے تم اپنی فہرست میں ایک مردہ ڈال سکتے ہو۔لیکن ہمیں وہاں دوسروں سے پہلے پہنچنا پڑے گا۔چاہے ہم کوئی بھی ہوں اگر ہم وہاں سب سے پہلے پہنچ گئے تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔تمام رات کی صفائی ستھرائی اور گھر کو قرینے سے سجانے کے بعد وہ صبح کے وقت لوگوں کی آمد پر کھل جاتے ہیں......اور بچوں کو دیکھ کر تو وہ جھومنے لگتے ہیں......میرا مطلب ہے شروع میں تو واقعی خوش ہوتے ہیں''۔یہ کہہ کر مائیک نے آواز بدل کر بوڑھی عورتوں کی نقل اتارنی شروع کردی'' ......دیکھو تو کون آیا ہے۔صاف دل معصوم مخلوق۔اللہ کے پیارے......آجاؤ ننھی سی شفاف جان آجاؤ۔

اندر چلے آؤ''۔

''یہ کہہ کر وہ تمہیں بہلاتی پھسلاتی اندر لے جاتی ہیں۔اور ساتھ ساتھ کہتی جاتی ہیں کہ بچوں کی دعا جیسی کوئی دعا نہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمہیں بستر تک لے جاتی ہیں اور اپنے ہاتھ سے تمہارے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور جب تک تم دعا مانگتے ہو یا خالی ہونٹ ہلاتے رہتے ہو وہ پیار سے تمہاری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی رہتی ہیں۔لیکن...... شام کو ایسا نہیں ہوتا...... ناں...... بالکل نہیں...... شام تک دوسرے لوگ آچکے ہوتے ہیں یا پتہ نہیں کیا ہوتا ہے وہ تمہارے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔''چلو بھاگو یہاں سے شیطانو۔یہ بچوں کی جگہ نہیں...... منہ بنا رہا ہے؟ اٹھاؤں جھاڑو! ٹھہر جاؤ کم بخت تجھے تو میں......''

''چلونا'' مائیک نے گفتگو کے دوران رک کر کہا۔''تم کس سوچ میں ہو؟''

''مجھے امی نے یہاں سے ہلنے سے منع کیا تھا''۔میں نے بے چارگی سے کہا۔

''لیکن امی نے تو تمہیں ستون پر چڑھنے سے بھی منع کیا تھا''۔مائیک چڑ کر بولا۔

''اسی لیے تو تم اتنے سادہ رہ گئے۔کسی چیز کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔چلو! چلو! چھلانگ مارو۔میں تمہیں دنیا دکھاؤں گا۔اس میں کیا برائی ہے؟ ماں باپ کا تو کام ہی یہ ہے کہ ہمیں دنیا نہ دیکھنے دیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟ میں نے تو اپنے والدین کو سمجھا دیا ہے کہ مجھے میری زندگی گزارنے دیں تمہارا کیا بنے گا؟ تم ایسے ہی پنجرے کے پنچھی رہ جاؤ گے۔امی کی گود میں ہی بیٹھ کر زندگی گزار دینا۔واہ بھئی واہ۔تمہارا انجام سوچ کر تو ہنسی آتی ہے'' وہ مجھے غور سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

سردیوں کی ہلکی ہلکی تپش والی خوشگوار دھوپ میں ہم دونوں قصبے کے نواحی علاقے کی سمت چل پڑے۔یہاں گاڑی کی پٹریاں کچھ فاصلے تک دو کے بجائے چار ہو جاتی تھیں' اور پھر آگے دو پٹریاں واضح طور پر دائیں جانب گھوم جاتی تھیں۔یہیں پر پھاٹک کھولنے بند کرنے والی رہتی تھی۔ پٹریوں سے ذرا سا ہٹ کر ایک بھورے رنگ کا چھوٹا سا مکان تھا اس کے برآمدے میں کھڑی معذوروں کی کرسی پر کوئی چیز حرکت کرتی رہتی تھی۔جب میں چھوٹا تھا تو امی میری انگلی پکڑ کر مجھے بھی اپنے ساتھ کھلے مقام پر چہل قدمی کے لیے لے جاتی تھیں۔اکثر یوں ہوتا کہ ہمیں پھاٹک کھلنے کے انتظار میں کھڑے رہنا پڑتا۔اگر دندناتی ہوئی گاڑی گزرنے کے بعد بھی پھاٹک کھلنے میں دیر ہوتی تو امی اس بڑھیا کی سستی سے چڑ جاتی تھیں۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟ امی بے صبری سے کہتیں۔
''مجھے سگنل کھلنے کا انتظار کرنا ہے' میڈم'' عورت اطمینان سے کہتی۔'' آپ کو دیر ہو رہی ہے تو چھوٹے گیٹ سے خود نکل جائیں۔ مگر میری ذمہ داری نہیں ہوگی''
''اوہ نہیں۔ ہمیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم صحیح راستہ اختیار کریں گے''۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ساتھ نہ ہوتا تو امی چھوٹا گیٹ کھول کر دائیں بائیں دیکھتیں پٹریاں پار کر جاتیں لیکن وہ مجھے درست راستہ اختیار کرنے کا سبق سکھانا چاہتی تھیں۔ حالانکہ وہ ایسا نہ بھی کرتیں تو میرے گمراہ ہونے کا امکان نہیں تھا اس لیے کہ مائیک نے مجھے بتایا تھا کہ پٹری پر رکھے آدھی پینی کے سکے پر سے ٹرین گزر جائے تو وہ پوری پینی کے برابر ہو جاتا ہے اور مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں پھیل کر ابا کے برابر ہو جاؤں۔ اس کے علاوہ مجھے پٹری عبور کرنے سے زیادہ اس بھورے رنگ کے مکان میں دل چسپی تھی جس کے برآمدے میں پہیوں والی کرسی پر ایک انتہائی موٹا لڑکا دھوپ تاپتا تھا اس لڑکے کی گردن خود بخود ہلنے لگتی تو مجھے ہنسی آتی ایک لحاظ سے وہ لڑکا مجھے خوش نصیب معلوم ہوتا تھا کہ جب چاہے پہیوں والی کرسی پر سیر کر سکتا ہے۔ ہمارے گھر کے لان میں بہت سی کرسیاں پڑی تھیں مگر کسی ایک میں بھی پہیے نہیں تھے کہ ذرا اِدھر اُدھر سواری ہی کر لیں۔
''یہ عورت اُسے رات کو اندر لے جاتی ہوگی'' میں نے امی سے پوچھا۔
''ارے۔ اور کیا؟ حد ہو گئی'' امی نے حیرت سے کہا۔'' تو تمہارا خیال ہے باہر رہنے دیتی ہوگی؟ حد ہو گئی''۔
میں خاموش ہو گیا' امی سمجھیں میں لڑکے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں' جبکہ میرا سوال کرسی کے بارے میں تھا۔
''......ارے تم اُسے گھورو مت'' امی کا مزاج برہم ہو گیا تھا۔''تمھیں ہزار مرتبہ سمجھایا ہے لوگوں کو گھورتے نہیں ہیں...... تمھیں کب عقل آئے گی؟''
جب پھاٹک کھل جاتا اور ہم تیز تیز قدم اٹھاتے چل پڑتے تو فقط اُس لمحے امی گھوم کر اس کی جانب دیکھتیں اور عورت سے پوچھتیں۔'' آج اس کا کیا حال ہے؟''
''خراب ہی ہے'' عورت ہمیشہ یہی جواب دیتی تھی کبھی کبھی وہ اس میں کسی بات کا اضافہ کر دیتی''۔
معلوم نہیں کیوں خدا نے مجھے اتنی کڑی آزمائش میں ڈالا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے''۔
''اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی۔'' امی نیم دلی سے کہتیں اور پھر پٹریوں کے دوسرے سمت پہنچ کر دم

لیتیں۔ یہاں انہیں اچانک میری موجودگی کا خیال آتا۔ ''یہ...... یہ پھاٹک ہمیشہ ہی بند ملتا ہے' چاہے کوئی بھی وقت ہو''۔ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی خاطر کہتیں۔

اور آج زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ پھاٹک مستقل کھلا تھا۔

''آج پھاٹک کی نگرانی کوئی نہیں کر رہا'' میں نے کہا۔

''آج وہ باؤلے کی لاش پر بیٹھے یا پھاٹک کا خیال رکھے'' مائیک نے جواب دیا۔

''ٹھہرو، مائیک'' میں گھبرا گیا ''میرا خیال ہے مجھے لاش نہیں دیکھنی چاہیے''

''کیوں؟''

''پچھلے سال میری ایک آنٹی کا انتقال ہوا تو انہوں نے مجھے کمرے سے باہر بٹھائے رکھا۔ سب باری باری اندر جاتے رہے مگر کوئی نہ کوئی میرے ساتھ باہر رک کر باتیں کرتا تھا تا کہ...... تا کہ میرا دل بہلا رہے''۔

''کیوں؟''

''پتہ نہیں...... میرے خیال میں وہ سمجھتے ہیں بچہ ڈر جاتا ہے بعد میں اُسے برے برے خواب آتے ہیں۔ تابوت اور قبریں اور کفن......''

مائیک چمکدار پٹریوں کے درمیان کھڑے ہو کر ہنسنے لگا۔ ''تم بالکل بچے ہو۔ تمھیں تو اُنگلی پکڑ کر چلانا پڑے گا''۔ پھر وہ کچھ دیر تک مجھے رحم بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ بولا۔ ''کبھی تم مردوں سے ڈرتے ہو اور کبھی...... اور کبھی کھلے ہوئے پھاٹک سے۔ ٹرین سے۔ پھاٹک کھلا بھی رہ گیا تو کیا ہو جائے گا تمہاری آنکھیں نہیں ہیں؟ کان نہیں ہیں؟ اور...... اور ٹانگیں تو ہیں۔ ٹرین آ بھی گئی تو کیا ہوگا...... ٹانگیں تو ہیں۔ چلو آؤ''

''ہم سب سے پہلے پہنچے ہیں'' مائیک نے بھورے مکان کے سامنے پہنچ کر کہا۔

''ابھی صفائی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی بستر پر نئی چادریں بچھائی جائیں گی''۔

میرے لیے وہ چھوٹا سا خاموش مکان اور اس کے آس پاس کا تمام ماحول آج بھی ویسا تھا۔ بس آج برآمدے میں پہیوں والی کرسی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''بہت ہی جلدی پہنچ گئے'' مائیک نے زیرِ لب دہرایا' اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا مکان کے عقب میں بڑی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ میں نے بھی شیشے کے ایک کونے سے آنکھیں لگا کر اندر دیکھا۔ کمرہ نیم تاریک تھا لیکن جو کچھ نظر آیا اُس۔ نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

میں اس منظر سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن مائیک نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر کھینچا۔ ''ابھی گھر والے بالکل تیار نہیں ہیں۔ چلو چلیں'' اُس کی دل چسپی کم ہو رہی تھی مگر میرا تجسس بڑھ گیا تھا۔
''تم کبھی پٹریوں کے درمیان دور تک چلتے گئے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔
''مجھے پٹریوں کے درمیان چلنے کی اجازت نہیں ہے......اور شوق بھی نہیں ہے میں نے بے صبری سے کہا۔ ''مجھے کھڑکی سے جھانکنے دو۔ میں کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں'' میں مائیک سے بازو چھڑا کر بھاگا اور دوبارہ شیشے سے آنکھیں جوڑ دیں۔
بستر پر پھولے ہوئے آدمی کو لیٹے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پتھر کی سل پر انسان کے نقوش ابھارے گئے ہوں۔ سوائے سر کے بالوں کے' وہ چہرے سے پاؤں تک مکمل پتھرایا ہوا تھا۔ گڑیا کے بالوں کی طرح فقط اس کے ملائم سرخ بال حقیقی اور زندہ لگ رہے تھے۔
''مائیک' مجھے ذرا اُوپر کرنا'' میں نے کھڑکی سے منہ ہٹائے بغیر کہا۔
''پاگل ہوئے ہو'' مائیک کے چیخنے پر میں نے گھوم کر اس کی جانب دیکھا۔
''اگر کسی نے تمھیں اندر جھانکتے دیکھ لیا تو وہ تمہارے سر سے فٹ بال کھیلیں گے یوں'' اُس نے ایک سفید پتھر کو اس طرح ٹھوکر ماری کہ پتھر کی سطح پر اُس کے جوتے کی کالی پالش کا داغ رہ گیا۔
''یہ حقیقت ہے'' اچانک ایک آواز پر ہم دونوں کے سر گھوم گئے۔ ''اگر تم نے ایک لمحے میں اپنی منحوس شکلیں گم نہ کیں تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ کر درخت سے لٹکا دوں گی۔ مردود وتم لاشوں سے بھی دور نہیں رہ سکتے''۔ کالے کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی عورت ہمیں مار بھگانے کے لیے آستینیں چڑھا رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم چھلانگ مار کر پھولوں کی باڑھ عبور کر جاتے' ایک اور آواز نے ہمارے قدم روک لیے۔ ''موت کے گھر کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے'' یہ اُس عورت کی آواز تھی جو پھاٹک کی نگرانی کرتی تھی۔
''ارے یہ آس پاس کے شریر لڑکے ہیں''۔ پہلی عورت نے دوسری کو سمجھانا چاہا۔
''وہ بھی ایک لڑکا ہی تھا''۔ پھاٹک والی کے لہجے میں گہری اُداسی تھی۔ ''ہاں اس کے نصیب میں شرارتیں نہیں تھیں۔ اس لیے وہ حقیقی بچپن گزار ہی نہیں سکا۔ پادری یہی تو کہتا ہے اس کے لیے دعاؤں کی بھی ضرورت نہیں۔ اس نے مکمل معصومیت کی حالت میں دنیا چھوڑی ہے''۔ عورت ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر یکدم اُس کی آنکھیں سرخ اور چمکدار ہوگئیں ''کتنی عجیب بات ہے'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی ''بچپن میں وہ بڑے آدمیوں جیسا لگتا تھا اور بڑا ہو کر وہ بچوں جیسا ہو گیا

تھا" وہ دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیلے مگر دوسرے بچے اس کے ساتھ وقت ضائع کیوں کرتے؟ اسے کیسے کسی قابل سمجھتے"۔

مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہم سے مخاطب ہے یا دوسری عورت سے بات کر رہی ہے میں اسے یہ بتانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ مجھے اس کے بیٹے کے ساتھ کھیلنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا...... لیکن شاید میری امی یہ بات پسند نہ کرتیں۔ ورنہ پہیوں والی کرسی کے مالک سے کھیلنے میں تو مزا آتا۔ مگر میں کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تمام وقت دوسری عورت سے بات کر رہی تھی۔

"صبر کرو۔ صبر کرو"۔ دوسری عورت ہمدردی سے بولی۔ "دیکھو یہ بھی اچھا ہوا کہ خدا نے تم سے پہلے اُسے اٹھا لیا۔ ورنہ...... ماں جیسا کون خیال رکھ سکتا ہے"۔

"میں یہی دعا کرتی تھی"۔ پھاٹک والی نے کہا۔ "لیکن...... لیکن یہ بھی کتنی غیر فطری بات ہے"۔ اب وہ ہچکیاں لینے لگی تھی۔ "کتنی...... کتنی غیر فطری بات ہے یہ کہ ماں کو اپنے بچے کی موت کی دعا مانگنی پڑے۔ ہر ماں اپنے بچوں سے پہلے مرنے کی دُعا مانگتی ہے اور میں...... اور میں اس کے برعکس جسے دنیا میں لائی اس کے خاتمے کی خواہش کرتی رہی۔ اسی کی بہتری کے لیے مگر بہرحال وہ جیسا بھی تھا زندہ تو رہنا چاہتا تھا۔ تم کبھی نہیں سمجھ سکو گی میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کسی اور کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا تو میں کبھی نہ سمجھ سکتی...... دراصل ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ جس کا غم ہوتا ہے وہی جانتا ہے...... وہی جانتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور وہ کچھ کچھ پاگل سی لگ رہی تھی۔

"وقت مرہم رکھتا ہے...... وقت گزرنے دو۔ تم مختلف محسوس کرو گی"۔ دوسری عورت نے اسے گھر کی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

"واقعی؟" وہ حیرت سے بولی "سب یہی کہتے ہیں۔ سب...... ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بھی یاد نہ رہے۔ کچھ بھی...... آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو بھی...... صبح کو پرندے بولیں تو بھی...... کچھ یاد نہ آئے...... لیکن یہ تو اور بھی بری بات ہے!!" اُس نے دوسری عورت سے بازو چھڑا لیا۔ اور چیخنے لگی "یہ تو بہت بری بات ہے۔ بہت بری بات ہے...... یہ تو ایسا ہوگا جیسے وہ ایک بوجھ تھا جو اُتر گیا۔ بوجھ اُتار پھینکا...... دُعائیں مانگ مانگ کر"۔

دوسری عورت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہمیں بھاگنے کا اشارہ

کیا۔لیکن روتی ہوئی عورت نے ہمارے ہاتھ پکڑ لیے۔ ''اندر چلو۔ وہ ابھی زمین کے اندر نہیں گیا ہے ابھی تم اسے دیکھ سکتے ہو'' وہ ہمیں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بستر تک لے گئی۔ ''جھک جاؤ۔ اس کے لیے جھک کر دُعا مانگو...... دل سے...... تمہارا دوست تھا'' اس نے ہمیں زبردستی گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا۔ پھر اُس کی آواز بہت نرم اور دھیمی ہوگئی۔ ''وہ خود اپنے لیے دعا مانگنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ دعا مانگنا سیکھ جائے لیکن...... لیکن وہ اس دنیا کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ میں اُسے پھول دکھا کر کہتی دیکھو یہ پھول کتنا خوبصورت ہے اسے خدا نے بنایا ہے تو پتہ ہے وہ کیا کہتا تھا؟'' وہ جملہ مکمل کرنے سے پہلے آنسوؤں سے لبریز آواز میں ہنسی' اور پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''وہ کہتا تھا'' خدا پھول بنانے کے لیے ٹرین پر آتا ہے پھر وہ گھوم کر پیچھے دیکھتا تھا جیسے خدا اس کے پیچھے کھڑا ہے...... لیکن پادری کہتا ہے خدا اس کی بات کا برا نہیں مانے گا۔ خدا ایسے لوگوں سے پیار کرتا ہے۔ خدا سب بچوں سے پیار کرتا ہے۔ ان کی دعائیں قبول کرتا ہے...... تم اس کے لیے دعا کرو۔ دعا کرو...... دل سے......''

عورت بولتی چلی گئی۔ مگر مجھے اب اس کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں بستر پر لیٹے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ عورت اسے بچہ کیوں کہہ رہی ہے؟ یہ تو پورا آدمی ہے۔ اتنا بڑا اتنا موٹا''۔

چانک عورت اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگی۔ ''کاش تم انہیں دیکھ سکتے۔ یہ دو پیارے بچے تمھیں ملنے آئے ہیں''۔ پھر اُس کی آواز دوبارہ لرزنے لگی۔ اور اس کی آنکھوں میں دیوانگی اُبھر آئی۔ ''کبھی کسی ماں نے اپنے بچے کو اس مکان میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ میرا بچہ کبھی کسی دوسرے بچے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا۔ اس نے تنہا زندگی گزاری۔ مکمل تنہائی......'' وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عورت کو کس طرح تسلی دوں۔ یہ انتہائی دردناک صورتِ حال تھی۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے آ جاتا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا ہے؟ میں نے کنکھیوں سے خوف ناک آواز میں روتی عورت کی طرف دیکھا۔

''اس سے ہاتھ ملاؤ''۔ عورت نے اشارہ کیا۔ ''یہ خوش ہوجائے گا ابھی یہ زمین میں نہیں اُترا ہے۔ ابھی یہ زمین کے اُوپر ہے۔ اس کی زمینی زندگی ختم نہیں ہوئی۔ شاباش'' میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھایا تو عورت کے منتشر ذہن میں ایک اور خیال بجلی کی طرح کوندا ''نہیں ٹھہرو! وہ تڑپ کر بولی۔ ''یہ لو......'' یہ اُس نے ایک کنگھی میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بال سنوار دو''۔

میں عورت کے ہاتھ سے کنگھی لینے ہی والا تھا کہ مائیک مجھے اور عورت کو دھکیلتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔
''نکلو یہاں سے فوراً'' اس نے میرے بازو کو یوں جھنجھوڑا جیسے مجھے گہری نیند سے جگا رہا ہو۔ میں نے مائیک کا اشارہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی' اور جست لگا کر اُس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ریل کی پٹریاں پار کرنے کے بعد ہماری رفتار کم ہوئی تو میں نے مائیک سے کہا'' چلو جو کچھ بھی ہوا مگر میں اب یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ایک لاش دیکھی ہے''
''کہہ تو سکتے ہو''۔ اُس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان جواب دیا۔'' مگر ایک لحاظ سے اسے اصلی لاشوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا''۔
''کیوں؟'' میں بجھ گیا۔
''یہ تو......'' وہ مناسب لفظوں کی تلاش میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔
''یہ تو زندگی میں بھی مردہ تھا۔ تمھیں بتایا ہے نا...... یہ'' اس نے ایک بار پھر اپنی کنپٹی پر انگلی گھمائی۔
''یہ یہاں سے آدھا تھا۔ آدھا بھی نہیں تھا''۔
''لیکن بستر پر پورا لگ رہا تھا''۔ میں نے اصرار کیا۔
''ارے اب اسے دفع کرو...... آؤ چبوترے پر بیٹھیں''۔ مائیک نے کہا۔
''تم بیٹھو میں تو گھر جاؤں گا''۔ یہ کہہ کر میں گھر کی سمت بھاگنے لگا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچ کر امی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آج اتنا کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ میں صبح تک اس موضوع پر بات کر سکتا تھا مردے اور تابوت اور کفن اور قبریں...... اور رات بھر جاگ کر مردے پر نظر رکھنے والے اور سب سے بڑھ کر یہ میں موت کو پہچان گیا تھا۔ موت کتنی عجیب چیز ہے۔ موت پر کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ موت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ گھر کے تمام بالغ افراد تو موت کو کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ تو پھر وہ موت کے موضوع پر گفتگو کیوں نہیں کرتے مجھے یقین تھا وہ مجھ سے چھپ کر تمام وقت موت کے بارے ہی میں باتیں کرتے ہیں۔ ان لاشوں کے بارے میں جن کے لیے انہوں نے دعائیں کیں۔ وہ مردے جوان کے سامنے تابوتوں میں رکھے گئے اور......
''اپنے پاؤں صاف کر کے اندر آنا''۔ امی نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔'' آج ہی فرش صاف کیا ہے''۔ اتنے میں ان کی نظر میرے بڑے بھائی پر پڑی جو دوسرے دروازے سے اپنی سائیکل اندر لا رہا تھا۔'' اور تم...... تم اتنے گندے ٹائروں والی بلا کو باہر کھڑا کرو۔ جاؤ فوراً نکلو'' وہ اسے دھکیل کر واپس گھومیں تو میں تو انہوں نے ابا کو دیکھا جو

باورچی خانے سے ایک کھلے برتن میں گرم پانی لیے نکل رہے تھے۔ وہ حسب عادت گرم پانی میں پاؤں ڈال کر آتش دان کے سامنے بیٹھنے والے تھے۔ ''یہ پاؤں دھونے کی جگہ نہیں ہے...... غسل خانے میں جاؤ''۔ امی نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ ابا مسکرانے لگے ''میں پانی چھلکاؤں گا نہیں۔ وعدہ!

امی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تم لوگ میری بات نہیں مانو گے۔ تم گھر کو صاف نہیں رہنے دو گے''۔ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے مسکرانے لگیں۔ ''ویسے گھر کا سب سے آرام دہ اور گرم کمرہ تو یہی ہے۔ باروچی خانہ بھی ساتھ ہے۔ تمھیں کھانے کی خوشبو بھی آتی رہتی ہے''۔

''اور تم بھی نظر آتی رہتی ہو''۔ ابا نے پیار سے کہا۔

''خیر مجھے دیکھ کر تو تم مایوس ہی ہوتے ہو۔ امی کی آواز میں مصنوعی غصہ تھا۔ اس انداز میں بات کرنے کے بعد وہ ہمیشہ گردن اُونچی کر کے خود کو آئینے میں دیکھتی تھیں اور اپنے سراپے پر نظر ڈال کر ہلکی سی شرماہٹ کے ساتھ مسکراتی تھیں انہیں معلوم تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔

''وقت گزرنے کے ساتھ تمہارے حسن میں اضافہ ہو رہا ہے اور تمہاری صحت بھی...... ابا نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور تم پھر بچوں کے سامنے...... کچھ تو خیال کرو اب ہم بوڑھے ہو رہے ہیں''۔

ہمیشہ کی طرح امی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور ان کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔ ''اور تم...... جمی تم اپنی انگلیاں زخمی کر لو گے۔ تمہارا ہاتھ پہیے میں پھنس جائے گا۔'' وہ میرے بھائی کو روکنے کے لیے چل دیں۔ جواب اپنی سائیکل کو گدی پر کھڑا کر کے اس کا پچھلا پہیہ زور زور سے گھما رہا تھا۔

''......اور تمہارے یہ لمبے لمبے بال پہیے میں پھنس جائیں گے۔ مجھے تمہارے بال زیادہ عزیز ہیں'' ابا نے امی کو بالوں سے پکڑ کر روک لیا۔ امی کے دراز بالوں کی دل کشی پورے خاندان میں مشہور تھی۔

''خدا کے لیے مجھے جانے دو'' امی نے غصے کی اداکاری میں شدت کا رنگ بھرتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں کب عقل آئے گی؟''

''مجھے کبھی بھی عقل نہیں آئے گی''۔ ابا نے قہقہہ لگایا۔ ''اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمھیں زیادہ عقل آ جائے مجھے تم احمق ہی اچھی لگتی ہو''۔

''ہماری اولاد بالغ ہو گئی مگر تم بچے ہی رہے۔ امی نے اپنے بال چھڑانے کے لیے زور لگاتے

ہوئے کہا۔

'بچو!'' ابا نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری امی کے ہاتھوں میں بھی اتنی طاقت ہوتی جتنی زبان میں طاقت ہے تو یہ اب تک اپنے بال چھڑا چکی ہوتیں۔ مگر افسوس...... '' یہ کہہ کر انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور اس مرتبہ امی بھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ابا نے ان کے بال چھوڑ دیے لیکن وہ بدستور ابا کے ساتھ کھڑی ہنستی رہیں۔

مجھے خیال آیا کہ میں امی سے آج کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ ریلوے کراسنگ پر رہنے والا بچہ۔ اُس کی میت......اور گھروں سے اُٹھنے والے جنازے......اور......لیکن امی اور میری بہنیں کھانا لگانے کی تیاری کر رہی تھیں اور ابا آتش دان کے سامنے بیٹھے مسکرا رہے تھے اور جمی' سائیکل کے پہیے کو پوری قوت سے گھمانے میں مصروف تھا......اور میرے ذہن سے جنازوں کا تصور آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا۔

ریمنڈ کارور

زندگی

دوپہر کے وقت وہ بیکری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی کونے میں رکھے مختلف کیکوں کے نمونے دیکھنے کے بعد اس نے ایک کیک منتخب کیا اور بیکری کے مالک کو ایسا ہی کیک بنانے کو کہا جس پر جلی حروف میں بطورِ خاص اس کے بیٹے کا نام "اسکوٹی" درج ہو۔ "آج ہفتہ ہے" اُس نے موٹی گردن والے بیکر کو کہا "اور سوموار کو اسکوٹی آٹھ سال کا ہوجائے گا۔ پرسوں صبح...... کیا خیال ہے؟"

"ہوجائے گا"۔ بیکر نے اپنا بے تاثر چہرہ ہلایا۔ "پرسوں صبح کیک تیار ہوگا...... اس رجسٹر پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ دو"

اس نے نام کے خانے میں اپنا نام "اینی وائز" درج کیا اور سامنے والے خانے میں ٹیلی فون نمبر لکھ دیا اور پھر بات پکی کرنے کے لیے زیرِ لب دہرایا "پرسوں صبح...... پارٹی دوپہر کو ہوگی۔ تازہ رہے گا۔ کیا خیال ہے؟"

اس اس بار بیکر نے منہ سے کوئی لفظ ادا کیے بغیر محض گردن کی خفیف سی جنبش پر اکتفا کیا۔ اینی نے اُس کا شکریہ ادا کیا' اور بیکری سے باہر نکل گئی۔

سوموار کی صبح اسکوٹی اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ اچھلتا کودتا اسکول کی جانب روانہ تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی سالگرہ پر اسے کیا تحفہ دینے والا ہے۔ گفتگو کے جوش میں وہ اچانک فٹ پاتھ سے سڑک پر اُتر گیا' اور ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔ جتنی دیر اسکوٹی آنکھیں موندے زمین پر لیٹا رہا اس کو ٹکر مارنے والی کار بھی کچھ فاصلے پر رکی رہی مگر جونہی وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی ٹانگوں پر دوبارہ کھڑا ہوگیا کار ایک مرتبہ پھر تیز رفتاری سے روانہ ہوگئی۔

اسکوٹی کچھ دیر بالکل خاموش رہا۔ اس نے اپنے ساتھی کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس گھر کی جانب روانہ ہوگیا جبکہ اس کا ہم جماعت حسبِ سابق اچھلتا

کودتا اسکول کی طرف چلنے لگا۔ گھر پہنچ کر اسکوٹی نے اپنی امی کو تمام واقعہ سنا دیا۔ مسز وائز نے پوری بات سننے کے بعد اسکوٹی کا ہاتھ تھام کر کہا '' جو ہوگیا سو ہوگیا' مگر تم اب بالکل نارمل محسوس کر رہے ہو نا؟'' اسکوٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں موند کر صوفے سے سر ٹکا دیا۔ '' کار سے تمہارا سر تو نہیں ٹکرایا تھا؟'' مسز وائز نے پوچھا۔ جواب نہ ملنے پر انہوں نے اسکوٹی کا بازو ہلایا اس کی آنکھیں بدستور بند رہیں تو وہ اس کے کندھے جھنجوڑنے لگیں اور پھر چیخ مار کر ٹیلی فون کی طرف لپکیں۔ اسکوٹی بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہسپتال سے ایمبولینس منگوانے کے بعد انہوں نے اپنے خاوند کے دفتر فون کیا'' گھبراؤ مت۔ بالکل مت گھبراؤ'' دوسری جانب سے مسٹر وائز کی آواز گونجی۔ '' میں سیدھا ہسپتال پہنچ رہا ہوں''۔

اسکوٹی کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور سالگرہ کی تقریب منسوخ ہوگئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسکوٹی کی نیند' سر کی چوٹ اور جذباتی صدمے کا ردِ عمل ہے۔ قے کرنے کے باعث کچھ سیال مواد اسکے پھیپھڑوں میں بھی داخل ہوگیا ہے جسے شام تک پمپ کے ذریعے صاف کر دیا جائے گا اس کی موجودہ حالت کو غیر فطری گہری نیند کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بے ہوشی نہیں ہے ماں باپ کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے سائے دیکھ کر ڈاکٹر فرانس نے مسکر کر دہرایا۔ '' بے خبری کی نیند۔ لیکن بہرحال نیند۔ بے ہوشی ہرگز نہیں''۔

گیارہ بجے رات تک تمام ایکسرے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے تشفی بخش نتائج موصول ہونے کے بعد مسٹر وائز نے اپنی بیوی سے گھر جانے کی اجازت طلب کی میاں بیوی دوپہر سے اپنے بیٹے کے ساتھ تھے اور اب جبکہ خطرہ تقریباً ٹل چکا تھا اور ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب ہمیں فقط اس لمحے کا انتظار کرنا ہے جب بچہ خود بخود آنکھیں کھول دے گا وائز کے دل میں گھر جا کر نہانے اور کپڑے بدلنے کی خواہش پیدا ہونا فطری بات تھی۔ '' میں تقریباً ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا'' اُس نے اطمینان سے کہا اور اپنی بیوی کی پیشانی چوم کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر پہنچ کر وہ کار سے اترا تو اسے سب سے پہلے اپنے پالتو کے بھونکنے کی آواز آئی۔ بے چارہ صبح سے گھر میں قید تھا۔ وائز دروازہ کھول کر کتے کی کمر سہلانے والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی '' خدایا'' گھنٹی کی آواز پر وہ چونک گیا۔ اس کے ہاتھ خوف سے لرزنے لگے۔ '' مجھے ہسپتال ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ مجھے گھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی...... وہ بڑبڑاتا ہوا لاؤنج

میں رکھے ٹیلی فون تک پہنچا۔ ''ہیلو'' اس نے ریسیور اٹھا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ''خیریت ہے نا؟''

''کیک لینے کوئی نہیں آیا'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کیا؟؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' وائز حیران رہ گیا۔

''کیک'' وہی آواز گونجی ''سولہ پاؤنڈ کا کیک......''

وائز نے ریسیور کان سے لگائے رکھا اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وائز جلد از جلد معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سب قطعی ناقابلِ فہم تھا ''میں کسی کیک کے بارے میں نہیں جانتا'' اس نے کہا ''خدایا' تم کیسی عجیب بات کر رہے ہو''

''عجیب بات تو تم کر رہے ہو'' آواز میں ہلکی سی جھلاہٹ آ گئی تھی۔

وائز نے ٹیلی فون رکھ کر شیشے کی الماری کا رخ کیا۔ بوتل نکال کر وہسکی کا گلاس بنایا اور ایک بڑا گھونٹ لینے کے بعد ہسپتال فون کیا۔ اُسے بتایا گیا کہ بچہ بدستور گہری نیند سو رہا ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔ بالآخر وہ جاگ جائے گا۔ وائز نے برش اُٹھا کر شیو کے لیے چہرے پر جھاگ کی تہ گاڑھی کرنی شروع کر دی۔ ابھی اُس نے شیو ختم کرنے کے بعد ٹب کے نیم گرم پانی میں بیٹھ کر اطمینان سے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا' اس نے اپنی کمر کے گرد تولیہ لپیٹا اور زیرِ لب بڑبڑاتا ٹیلی فون کی طرف چل پڑا ''احمق...... میں احمق ہوں۔ مجھے اس کے بستر کے ساتھ کھڑے رہنا چاہیے تھا۔ کسی وقت بھی...... کچھ بھی ہوسکتا ہے''۔ لیکن جب اس نے ریسیور اٹھا کر گھبرائی ہوئی آواز میں زور سے ہلو کہا تو دوسری سمت خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے سکوت طاری رہا' پھر فون کرنے والے نے بغیر بات کیے فون بند کر دیا۔

وہ آدھی رات کے بعد ہسپتال واپس پہنچا۔ این اب تک بستر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نگاہیں اپنی واحد اولاد پر مرکوز کر دیں۔ اسکوٹی کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اس کا سر پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا اس کی سانسیں بہت دھیمی اور ہموار تھیں۔ دائیں جانب ذرا سی بلندی پر ایک گلوکوز کی بوتل ٹنگی تھی جس سے ایک ربڑ کی نالی منسلک تھی جو دوسرے حصے پر لڑکے کے بازو میں پیوست تھی۔

''اسکوٹی کیسا ہے؟'' وائز نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' اُس نے ٹیوب اور بوتل کی جانب اشارہ

کیا۔

''ڈاکٹر فرانس کے انتظامات ہیں'' اینی بولی۔ ''اسے توانائی کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی طاقت بحال رہنی چاہیے...... لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سب کچھ ٹھیک ہے تو یہ جاگتا کیوں نہیں؟

وائز نے اپنی بیوی کی کمر تھپتھپائی۔ ''حوصلہ مت ہارو'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''بس وقت کی بات ہے کچھ وقت اور گزرے گا تو یہ جاگ جائے گا۔ آخر تو اس نے جاگنا ہی ہے۔ ڈاکٹر فرانس کو اس طرح کی بیماریوں کا مکمل علم اور تجربہ حاصل ہے''۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اینی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''تم گھر جا کر کچھ دیر آرام کرو۔ میں تو یہیں ہوں۔ بس اس سرپھرے سے کوئی بات نہ کرنا جو فون کیے جا رہا ہے۔ تم خاموشی سے فون بند کر دینا۔ بس''

''کون فون کر رہا ہے؟'' اُس نے پوچھا

''معلوم نہیں'' وائز نے کندھے اُچکائے ''ہوگا کوئی فالتو آدمی...... بے کار آدمی ہی اِدھر اُدھر فون گھماتے رہتے ہیں۔ تم اب جاؤ''۔

اینی نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں'' وہ بولی۔ ''میں یہیں ٹھیک ہوں''۔

''کیوں؟'' وائز نے حیرت سے پوچھا ''تم اب گھر جا کر صبح تک آرام سے سو سکتی ہو۔ تم آؤ گی تو تھوڑی دیر کے لیے میں چلا جاؤں گا۔ یوں ہم دونوں تازہ دم رہ سکتے ہیں ڈاکٹر فرانس نے کیا کہا ہے یہ اپنے وقت پر جاگ جائے گا اسے کچھ نہیں ہوا یہ صرف سو رہا ہے۔

ایک باوردی نرس دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اسکوٹی کا بایاں بازو بستر سے باہر نکالا اور اس کی کلائی پر انگلی رکھ دی۔ پھر اس نے اپنی گھڑی پر نظریں گاڑ کر نبض کی رفتار معلوم کی۔ کچھ دیر بعد اُس نے بازو واپس بستر کے اندر رکھ دیا۔ اور پلنگ کی دوسری جانب لٹکے چارٹ پر کچھ درج کیا۔

''اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟'' اینی نے سوال کیا۔ وائز اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا تھا۔

''ایک سطح پر قائم ہے'' نرس نے بتایا۔ پھر غالباً اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا ''ڈاکٹر فرانس جلد ہی یہاں آنے والے ہیں۔ وہ ہسپتال میں تو آ چکے ہیں۔ ابھی دوسرے وارڈ میں

ہیں''

''میں اپنی بیوی کو گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔'' وائز نے نرس سے بات کرنی چاہی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ اس میں کوئی حرج تو نہیں؟''

''قطعی نہیں'' نرس نے کہا ''میرے خیال میں تو آپ دونوں کو گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ پھر شام کو آجائیں۔ بیچ میں فون کرتے رہیں۔ یہ جاگ گیا تو ہم آپ کو بتا ہی دیں گے۔'' نرس ایک اونچی لمبی یورپین عورت تھی۔ اس کا لہجہ بتاتا تھا کہ وہ سویڈن یا ڈنمارک سے تعلق رکھتی ہے۔

''پہلے ہم یہ تو معلوم کرلیں کہ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔'' اینی نے رائے پیش کی۔ ''اب تو اسے سوتے بہت دیر ہوگئی۔ اتنی نیند؟ میں نہیں سمجھتی کہ یہ کوئی اچھی علامت ہے''۔ اینی کی آواز بھرا گئی۔ وائز نے پیار سے اُس کا کندھا دبایا۔

''بہرحال ڈاکٹر فرانسس کچھ دیر بعد کمرے میں ہوں گے۔ آپ بات کرلیجیے۔ نرس نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

وائز کچھ دیر تک اپنے بیٹے کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ نہایت مختصر اور دھیمے سانس لے رہا تھا۔ اس کے سینے کے پھیلنے اور اُبھرنے کے عمل چادر کے اُبھار اور دباؤ سے واضح ہو رہا تھا۔ وائز کو پہلی مرتبہ ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ اپنے گھر میں اپنے بستر کے بجائے ہسپتال کے بستر پر سو رہا تھا۔ اور اس کے سر پر پٹیاں بندھی تھیں، اور بازوں میں ایک ٹیوب پیوست تھی۔

ڈاکٹر فرانسس نے کمرے میں داخل ہو کر اینی اور وائز سے مصافحہ کیا۔ ''ڈاکٹر ...... اینی نے کچھ کہنا چاہا مگر ڈاکٹر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''پہلے ہم اس کی طبیعت معلوم کریں گے''۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ اس نے بستر کے قریب کھڑے ہو کر بچے کی نبض محسوس کی۔ پھر یکے بعد دیگرے اُس نے اسکوٹی کی بند آنکھوں کے پپوٹے پلٹا کر دیکھے۔ اس کے بعد وہ اپنا ہاتھ چادر کے اندر لے گیا اور اسٹیتھی سکوپ کے ذریعے دل کی رفتار اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کا معائنہ کیا اور آخر میں اس نے اسکوٹی کے پیٹ کے مختلف حصوں پر انگلیاں رکھ کر کچھ معلوم کیا۔ جب معائنہ مکمل ہوگیا تو وہ پلنگ کے دوسرے حصے کی جانب گیا اور پائنتی سے لٹکے چارٹ کو غور سے پڑھنے لگا۔ پھر خود ہی چارٹ پر کچھ لکھنے کے بعد اُس نے اینی اور وائز کے چہروں کی جانب نگاہیں اٹھائیں۔

''ڈاکٹر اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' وائز نے کہا ''اسے کیا ہو گیا ہے کچھ پتہ تو چلے''۔
''یہ جاگتا کیوں نہیں؟'' اینی نے سوال کیا۔
ڈاکٹر ایک تندرست و توانا' چوڑے شانوں والا وجیہہ مرد تھا۔ اُس نے نیلے رنگ کا قیمتی سوٹ اور خوبصورت ٹائی زیب تن کر رکھی تھی۔ اگر وہ ہسپتال سے باہر کہیں نظر آتا تو اس کی شخصیت پر کسی کامیاب کاروباری ادارے کے سربراہ کا دھوکا ہوتا۔
''یہ ٹھیک ہے'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ویسے اسے اب تک موجودہ حالت سے نسبتاً بہتر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن پھر بھی پریشانی کی قطعی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ بہ حیثیت مجموعی یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ جاگ جائے۔ اسے اب جاگ جانا چاہیے''۔ ڈاکٹر نے لمحے بھر کو خاموش ہو کر بچے کی طرف دوبارہ دیکھا۔ ''چند گھنٹوں میں ہمیں باقی ٹیسٹوں کے نتائج بھی موصول ہو جائیں گے۔ پھر ہم حتمی طور پر کچھ کہنے کے قابل ہوں گے۔ لیکن بہر حال یہ بالکل ٹھیک ہے۔ سوائے سر کے پچھلے حصے پر لگنے والی چوٹ کے' کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں وہ چوٹ اُسے لگی ہے''۔
''خدایا' نہیں'' اینی کی آواز روہانسی ہو گئی۔
''......اور وہ اچانک صدمہ پہنچنے کا۔ یک لخت جھنجھوڑے جانے کا ردِ عمل بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بعض اوقات ایسی گہری نیند محض اس طرح کے خوفناک جھٹکے کا نتیجہ ہوتی ہے''۔
لیکن اسکوٹی بہر حال کسی مہلک حالت میں تو نہیں ہے نا؟ وائز بے اختیار بولنے لگا۔ ''اس طرح کے حادثے کبھی بھی جان لیوا تو ثابت نہیں ہوتے۔ آپ نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بے ہوشی نہیں ہے۔ آپ کا اب بھی یہی خیال ہے؟ یہ بے ہوشی تو بہر حال نہیں ہے''۔ وائز بات مکمل کر کے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھنے لگا۔
''نہیں۔ میں اسے بے ہوشی نہیں کہوں گا۔ ڈاکٹر نے کہا اور ایک مرتبہ پھر بے خبر بچے کی سمت نظر دوڑائی۔ ''بس یہ ایک بہت گہری نیند میں چلا گیا ہے۔ بہت گہری' بے خواب......اس طرح کی نیند سے بدن جلد از جلد اپنا اعصابی تناؤ کم کرتا ہے اور یہ توانائی کی فوری بحالی میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ بہر حال کسی حقیقی خطرے سے باہر ہے۔ اتنا تو میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں۔ باقی ...... حتمی بات تو جب یہ جاگ جائے گا اور بقایا ٹیسٹوں کے نتیجے ہاتھ میں ہوں گے تو تبھی کہی جا سکتی ہے۔

''یہ بے ہوشی ہے'' اینی بولی ''ایک طرح کی......ایک طرح کی بے ہوشی؟''

''نہیں کم از کم اس مرحلے پر یہ بے ہوشی نہیں ہے'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''اسے بہت شدید جسمانی صدمہ پہنچا ہے جھٹکا خون کا اُچھال۔ ایسے مواقع پر یہ ردِ عمل اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ جسم کا خودکار طریقۂ عمل ہے۔ یہ عارضی ہوتا ہے جبکہ...... جبکہ بے ہوشی ایک طرح سے شعور کے معطل ہو جانے کا نام ہے۔ بے ہوشی کئی دنوں پر محیط ہو سکتی ہے۔ کئی ہفتوں کئی...... اسکوٹی اس حال کو نہیں پہنچا ہے۔ کم از کم ابھی نہیں مجھے یقین ہے صبح تک اس کی حالت بہتر ہونے لگے گی۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔ اور جب یہ جاگ جائے گا تو سب کچھ واضح ہو جائے گا......سب کچھ اور ہاں آپ لوگ چاہیں تو اس وقت تک ہسپتال ہی میں رہیں یا گھر جا کر آرام کریں...... یہ آسان تو نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں مگر'' اُس نے گھوم کر پھر سوئے ہوئے اسکوٹی کو دیکھا۔ ''اور...... اور تم محبت بھری ماں'' ڈاکٹر اینی سے مخاطب ہوا ''زیادہ تشویش سے اپنی صحت خراب مت کرو۔ ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اور اب یہ صرف اور صرف وقت کی بات ہے۔ تھوڑا سا اور وقت۔ بس'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اُن سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اینی نے اسکوٹی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بولی ''خدا کا شکر ہے اسے بخار تو بالکل نہیں ہے'' پھر وہ چونک گئی۔ ''مگر یہ تو ضرورت سے زیادہ سرد ہے۔ ذرا اسے ہاتھ تو لگاؤ کیا عام طور پر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے''۔

وائز نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے اس وقت اسے ایسا ہی ہونا چاہیے'' اُس نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ''یہ کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو ڈاکٹر اس کا بھی ذکر کرتا۔ ڈاکٹر ابھی تو یہاں سے گیا ہے...... ابھی ابھی''

اینی کچھ دیر خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔ وہ بے دھیانی سے ہونٹوں کو اپنے دانت چبھو رہی تھی۔ پھر وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی شکن آلود پیشانی اور دیوار پر جمی نگاہوں سے عیاں تھا کہ وہ گہری سوچ میں ہے۔ وائز اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وائز نے کچھ کہنا چاہا، مگر خاموش رہا بالآخر اُس نے اینی کا ہاتھ اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اُسے جب بھی اینی کو دلاسہ دینے کی خواہش ہوتی وہ دھیرے دھیرے اُس کا ہاتھ دبانے لگتا۔ دونوں دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ اینی کی نگاہیں کبھی

کبھی دیوار سے ہٹتیں تو وہ اسکوٹی کے زرد چہرے کو دیکھتی اور پھر فوراً ہی دوبارہ دیوار کو گھورنے لگتی۔

''میں نے دُعا بھی مانگی یہ۔ بہت سی دعائیں۔ منتیں'' وہ زیرِلب بولی۔

وائز نے اثبات میں سرہلایا۔

''میں سمجھتی تھی کہ میں دعاؤں کے الفاظ بھول گئی ہوں۔ لیکن سب کچھ خود بخود یاد آ گیا۔ اصل میں دعا مانگنا مشکل نہیں ہے۔ یہ بہت فطری اور آسان ہے میں نے آنکھیں بند کیں اور کہا ''اے خدا میری مدد کر...... اسکوٹی کی مدد کر...... اور باقی تمام الفاظ یوں ادا ہونے لگے جیسے باقاعدہ زبانی یاد کیے ہوں۔ اگر تم بھی دعا مانگو تو...... تو ممکن ہے''۔

وائز نے اُس کا ہاتھ دبایا۔ ''میں نے بھی دعا مانگی ہے، آج دوپہر۔ میرا مطلب ہے کل دوپہر، جب تمہارا فون سن کر میں ہسپتال آ رہا تھا تو کار میں...... تمام وقت...... جب تک ہسپتال پہنچا میں دعا مانگ رہا تھا''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا'' ۔ اینی نے کہا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ تھامے اس مصیبت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اسے اپنے خاوند پر پیار آیا۔

وہی نرس کمرے میں آئی۔ اس نے دوبارہ اسکوٹی کی نبض محسوس کی، اور گلوکوز کی بوتل سے منسلک تمام چیزوں کو غور سے دیکھا وہ سیال مادے کے بہاؤ سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک نیا ڈاکٹر کمرے میں آیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریڈیالوجی'' کا ماہر ڈاکٹر پارسن ہے۔ وہ جینز اور کھلاڑیوں کی قمیص میں ملبوس تھا۔

''ہم اسے نیچے لے جا رہے ہیں'' اس نے کہا۔ ''ہمیں مزید تصویروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اس کے بغیر اسکیننگ نہیں کر سکیں گے''

''اسکیننگ؟'' اینی بستر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟ میں تو سمجھی تھی آپ نے سب کچھ کر لیا ہے میرا مطلب ہے تمام تصویریں وغیرہ اور ایکسرے اب یہ اسکیننگ؟؟''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ نیا ڈاکٹر مسکرایا۔ ''تھوڑی سی اور تصویریں چاہئیں...... اور دماغ کا اسکین تو اب کرنا ہی پڑے گا''۔

''میرے خدا'' اینی لڑکھڑا گئی۔

''یہ معمولی بات ہے'' ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی ''ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ

کا بیٹا اب تک جاگا کیوں نہیں جب نیند غیر معمولی طور پر لمبی ہو جائے تو اسکیننگ کرنی پڑتی ہے۔
یہ بالکل نارمل چیز ہے۔آپ مطمئن رہیں''

اچانک دروازہ کھلا اور دو باوردی اردلی ایک اسٹریچر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔اجنبی زبان میں گفتگو کرنے والے اردلیوں نے پہیوں والا اسٹریچر اسکوٹی کے بستر کے ساتھ کھڑا کیا۔ اس کے بازو سے گلوکوز کی نالی الگ کی اور اسے اتنے اطمینان سے اٹھا کر اسٹریچر پر رکھا جیسے وہ خشک پتے جتنا وزن رکھتا ہو۔پھر وہ اسٹریچر کو چلاتے ہوئے لفٹ میں لے گئے۔اینی اور وائز بھی اُسی لفٹ میں سوار ہوئے۔ جب لفٹ نے نیچے جانا شروع کیا تو اینی کا دل ڈوبنے لگا۔اس نے سہارے کے لیے وائز کا بازو تھام لیا۔

چند گھنٹوں بعد جب پہیوں والا اسٹریچر ایکسرے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلا تو میاں بیوی دروازے کے باہر ساکت وجامد کھڑے تھے۔انہیں دیکھ کر ایک اردلی نے اجنبی زبان میں کچھ کہا جس کے جواب میں دوسرے نے خاموشی سے سر ہلایا۔اسٹریچر ایک بار پھر لفٹ میں رکھا گیا۔اس مرتبہ لفٹ اوپر کسی سمت اُٹھی۔ کمرے میں پہنچ کر اینی اور وائز بستر کے ساتھ رکھی کرسیوں پر دوبارہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔

وہ تمام دن انتظار کرتے رہے۔مگر ان کے بیٹے نے آنکھیں نہیں کھولیں۔وقفے وقفے سے ان میں سے کوئی ایک اُٹھتا اور گراؤنڈ فلور پر واقع ہسپتال کے کیفے میں چائے یا کافی پینے چلا جاتا پھر اچانک کسی احساسِ جرم کے تحت بے چین ہو کر فوراً کمرے میں واپس آجاتا۔ڈاکٹر فرانسس دوپہر کے وقت ان کے کمرے میں دوبارہ آیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ بس اب بچہ بیدار ہونے ہی والا ہے''کسی بھی لمحے'' ڈاکٹر نے کہا''یہ اٹھے گا اور آپ دونوں کو دیکھ کر مسکرائے گا''۔

''کاش'' اینی نے زیرِ لب دہرایا''کاش''

مختلف نرسیں آتی رہیں اور پائنتی پر رکھے چارٹ کے مختلف خانوں کو بھرتی چلی گئیں سہ پہر کے وقت سفید بلاؤز پہنے ایک شخص آیا اور آتے ہی اسکوٹی کے بازو سے ایک سوئی کے ذریعے خون نکالنے لگا۔اس نے اینی یا وائز سے کوئی بات نہیں کی۔

''یہ کیا ہے؟'' اینی نے ناگوری سے کہا''تم کیا کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹروں کا حکم' میڈم'' اس نے کندھے اچکائے''وہ کہتے ہیں خون کا نمونہ چاہیے' میں خون کا نمونہ لے جاتا ہوں۔میرا بس اتنا کام ہے۔باقی وہ جانیں...... ویسے اس کو ہوا کیا ہے؟'' اُس

نے پہلی بار اسکوٹی کے چہرے پر نظر ڈالی ''کتنا پیارا بچہ ہے''۔
ایک کار سے ٹکرا گیا'' وائز نے کہا'' کار والا بھاگ گیا''
سفید بلاؤز والے نے افسوس سے سر ہلایا اور اپنی ٹرے اٹھا کر کمرے سے چلا گیا۔
''یہ جاگ کیوں نہیں رہا وائز؟'' ایبی کی آواز میں وحشت تھی۔ ''میں اب ان سب سے چیخ چیخ کر پوچھنے والی ہوں؟''

وائز نے تاسف سے سر ہلایا اور کوئی جواب دیے بغیر کرسی سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ ایبی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے کی کھڑکی تک گئی اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ رات کے اندھیرے میں سڑک سے گزرنے والی کاروں کی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ایبی کا دل بوجھل تھا۔ وہ شدید اداسی اور گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ ایک کار عین ہسپتال کے گیٹ پر آ کر رکی۔ اگلا دروازہ کھلا اور ایک تندرست عورت ہسپتال کے گیٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ایبی کو خیال آیا کہ وہ عورت کتنی خوش قسمت ہے۔ ''کاش میں وہ عورت ہوتی اور کوئی...... کوئی بھی شخص مجھے کسی گاڑی...... کسی بھی گاڑی میں یہاں سے کہیں لے جاتا۔ کہیں بھی لے جاتا کسی بھی ایسی جگہ جہاں گاڑی رکتی تو سامنے اسکوٹی کھیلتا نظر آتا۔ وہ مجھے دیکھ کر دوڑتا آتا اور امی کہہ کر مجھ سے لپٹ جاتا لیکن...... لیکن میں وہ عورت نہیں ہوں۔ وہ عورت خوش قسمت ہے۔

وائز نے آنکھیں کھول کر پہلے اسکوٹی کی جانب دیکھا اور پھر ایبی کے ساتھ جا کھڑا ہوا دونوں خاموشی سے کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے۔ انہیں کوئی بات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پریشانی کی انتہا نے انہیں اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ان کہے خیالات سے آگاہ ہونے لگے تھے۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر فرانسس کمرے میں داخل ہوا۔ اس بار وہ مختلف رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اُس کی ٹائی بھی بدل چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہا دھو کر اور شیو بنا کر آیا ہے وہ سیدھا بستر کی جانب گیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا ''اسے اب تک جاگ جانا چاہیے تھا۔ ہم سب کو یقین ہے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن اس کی نیند کی کوئی وجہ نہیں ہے تمام ٹیسٹ کے نتائج آ گئے ہیں کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ساری رپورٹیں ٹھیک ہیں۔ ہر چیز نارمل ہے...... اور یہ جاگ بھی جائے گا جب جاگے گا تو اس کا سر بہت بوجھل ہوگا۔ یہ طے ہے مگر اب تک سوئے رہنے

کی وجہ..... کوئی وجہ نہیں ہے"

"تو یہ بے ہوشی ثابت ہوئی؟ ایٹی نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا اور کہا" وقتی طور پر ہم اسے بے ہوشی کہہ لیتے ہیں، مگر جب یہ جاگے گا تو ہماری بات غلط ثابت ہو جائے گی......" پھر وہ موضوع بدلنے سے پہلے زبردستی مسکرایا۔" آپ لوگوں نے اب تک کھایا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں...... مجھے معلوم ہے ایسے موقعوں پر کھانا پینا آسان نہیں ہوتا۔ مگر بہر حال آدمی کو زندہ رہنا ہوتا ہے آپ جائیں کچھ کھائیں ذرا آرام کریں یہ آپ کے لیے ضروری ہے میں یہاں ایک نرس مقرر کر دوں گا وہ اس کی مستقل نگہداشت کرے گی اور کچھ ہوا تو آپ کو فوراً مطلع کر دے گی......"

"شکریہ ڈاکٹر" وائز نے کہا" بہت بہت شکریہ"

"یہ میرا فرض تھا" ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"میرے خیال میں ہم میں سے کسی ایک کو گھر ضرور جانا چاہیے۔ وائز نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ" سگ" بھوکا ہوگا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ ہمیں دن رات یہاں رکنا پڑے گا تو میں بہت سارا تب تیار کر کے چھوڑ آتا۔ اس وقت تک تو وہ بھوک سے نڈھال ہو چکا ہوگا"۔

"کسی پڑوسی کو فون کر دیتے ہیں" ایٹی نے جواب دیا" مورگن کو کہہ دو اسے تو ویسے بھی سگ بہت اچھا لگتا ہے"۔

"ٹھیک ہے" وائز نے کہا۔ پھر کچھ دیر بعد اسے کوئی اور خیال آیا" اگر تم گھر چلی جاؤ تو سگ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور تم کچھ دیر سو کر تازہ دم بھی ہو جاؤ گی۔ اصل میں دیکھو...... ایٹی پیاری، اب ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ اسکوٹی کی نیند کا مسئلہ اُلجھ گیا ہے ہم نہیں جانتے یہ سلسلہ کتنے دنوں پر محیط ہوگا۔ اور اب تو وہ جاگ بھی گیا تو اس کے بعد بھی اسے کئی دنوں ہسپتال ہی میں رہنا ہوگا۔ ہمیں اپنی ہمت اور توانائی قائم رکھنی ہے حالات کا مقابلہ کرنا ہے"۔

"تم چلے جاؤ" ایٹی نے کہا" سگ کو بھی کھانا ڈالو۔ خود بھی کچھ کھا لینا"۔

"میں تو ایک مرتبہ جا چکا ہوں" اُس نے دلیل دی" اور میں نے بہت بہتر محسوس کیا تھا تم جاؤ کچھ کھا بھی لینا۔ فکر مت کرو میں تو یہاں موجود ہوں...... کچھ ہوا تو فوراً اطلاع دے دوں گا"۔

"خیر کچھ کھانے کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا"۔ ایٹی نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جماہی لی" لیکن میں بہت تھک گئی ہوں۔ میں نے منہ بھی نہیں دھویا۔ دانت بھی صاف نہیں کیے

اور......اور نیند......اور یقین کرو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر میں یوں اسے مسلسل دیدے پھاڑ کر نہ تکتی رہوں تو یہ آنکھیں کھول دے گا......اُٹھ بیٹھے گا......ٹھیک ہے میں گھر جاتی ہوں' سنگ کو کھانا ڈال کر اور کپڑے بدل کر جلد از جلد واپس آتی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے"۔

اینی نے اپنا بٹوا اٹھایا' اور کوٹ پہنتے ہوئے کہا" میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی" جملہ مکمل کرتے ہی وہ اسکوٹی کی سمت دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

وائزلیک کر دروازے پر پہنچ گیا" سنو!" اُس نے بلند آواز سے کہا۔ وہ پیچھے گھومے بغیر رُک گئی۔
" کچھ دیر کے لیے سب بھول کر سو جانا اور نہانا۔ اور کچھ کھانا تمھیں یاد ہے ڈاکٹر فرانس نے کیا کہا تھا؟"

اس نے سرہلا دیا' مگر پلٹ کر وائز کی جانب نہیں دیکھا وہ جانتا تھا اس کی بیوی رو رہی ہے۔
اُس نے گھر کے دروازے پر کار روک کر آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر کے لیے جامد و ساکت گاڑی ہی میں بیٹھی رہی۔ چند لمحوں بعد انجن کے ٹھنڈے ہونے کے سبب ٹک ٹک کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ وہ گاڑی سے نکل آئی۔ گھر کے اندر سے کتے کی بھونکار سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد اُس نے سب سے پہلے چولھے پر چائے کا پانی رکھا۔ پھر اس نے کتے کو کھانا ڈالا۔ کتا بہت بھونکا تھا اُس کے جبڑوں سے مکروہ حد تک بلند آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ جب وہ گرم چائے کا کپ ہاتھ میں لیے صوفے پر بیٹھی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
اُس نے ہیلو کے جواب میں ہیلو کہا تو کسی نے سوالیہ انداز میں کہا" مسز وائز؟؟"
" ہاں ہاں" اس نے تیزی سے جواب دیا۔" میں مسز وائز ہوں۔ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ اسکوٹی ٹھیک ہے نا؟"
" اسکوٹی؟" دوسری طرف سے آنے والی آواز میں حیرت کی جھلک تھی پھر وہ لہجہ ہموار ہو گیا" ہاں یہ اسکوٹی ہی کے بارے میں ہے۔ یہ اُسی کا مسئلہ ہے لگتا ہے آپ اسکوٹی کو بھول گئی ہیں۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔
اُس نے فوراً ہسپتال کا نمبر ملایا اور نرس سے اتنے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسکوٹی کی خیریت دریافت کی کہ ابتدا میں نرس کو اس کی بات سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ نرس کے اطمینان دلانے پر بھی وہ مطمئن نہیں ہوئی" میرے خاوند کو بلاؤ فوراً پلیز" اس نے کہا۔

جب تک وائز' فون پر آتا وہ ایک ہاتھ سے اپنے پیٹ کو دباتی رہی جہاں بھوک کی شدت سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ باوجود کوشش کے کچھ کھا نہیں سکی تھی اس کا بیٹا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ کیسے سوتی؟ کیسے کھاتی؟

''ابھی ابھی کسی نے گھر فون کیا اور کہا کہ یہ اسکوٹی کے بارے میں ہے۔ اسکوٹی کے بارے میں سن رہے ہو؟'' جوں ہی وائز نے ہیلو کہا وہ پوری رفتار سے شروع ہوگئی'' کہہ رہا تھا تم اسکوٹی کو بھول گئی ہو' وہ چیخ پڑی۔

''اسکوٹی تو بالکل ٹھیک ہے'' وائز بولا'' میرا مطلب ہے وہ اب تک سو رہا ہے ایک ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ ہاں تمہاری غیر حاضری میں اس نے بھی کہا بس اس کے جاگنے کی دیر ہے سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''لیکن وہ آدمی......وہ کہہ رہا تھا کہ یہ اسکوٹی کے بارے میں ہے''۔ اس نے دہرایا

''میری جان' تم کچھ دیر کے لیے سو جاؤ'' وائز کو اپنی بیوی پر ترس آیا'' اس آدمی کو بھول جاؤ...... یہ وہی ہوگا جس نے مجھے بھی فون کیا تھا۔ تم آرام کرو۔ واپس آؤ گی تو ہم یہیں کہیں اکٹھے ناشتہ کریں گے''۔

''ناشتہ؟'' اینی کی آواز آئی۔ ''میں ناشتہ نہیں کروں گی میں کچھ نہیں کھا سکتی''

''میرا مطلب ہے جوس وغیرہ پی لیں گے۔ کوئی ہلکی سی غذا۔ میرا مطلب ہے......'' وائز کی آواز لڑکھڑا گئی۔ '' مجھے نہیں معلوم میں نہیں جانتا۔ میرا خود کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی......اچھا میں چلتا ہوں۔ ڈاکٹر فرانسس کے آنے کا وقت ہے تم واپس آؤ تو بات کریں گے۔ اور اسکوٹی بالکل ٹھیک ہے اور سویا ہوا ہے آرام سے......اور......''

''میں چائے پی رہی تھی...... جب فون کی گھنٹی بجی تو میرے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ اُس نے کہا یہ اسکوٹی کے بارے میں ہے۔ میرا سر چکرانے لگا میں فرش پر گرنے والی تھی''۔

''بھول جاؤ' میری جان اسے بھول جاؤ' یہ کوئی نفسیاتی مریض ہے جسے اسکوٹی کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے اور ہمارا ٹیلی فون نمبر......تم نیند پوری کرو اور یہاں آجاؤ۔ ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے یاد ہے نا؟''

''ہاں ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے''۔

''خدا حافظ''

''خدا حافظ''

وہ بستر پر جانے کے کچھ دیر بعد اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے گرم پانی سے ٹب بھرا اور چند منٹوں میں نہا دھو کر فارغ ہو گئی کپڑے بدلنے کے بعد اس نے سلگ کے لیے بہت سارا تب تیار کر کے برآمدے میں رکھ دیا۔ اور تیز رفتاری سے گاڑی چلاتی واپس ہسپتال پہنچ گئی۔

وائز سینے پر ہاتھ باندھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اینی کی آہٹ پر وہ گھوم گیا۔ اس کا شیو دوبارہ بڑھ چکا تھا اور اس کے چہرے پر کمزوری اور تھکن کے واضح آثار تھے۔ اینی نے بٹوا تپائی پر رکھا اور بستر پر جھک گئی ''سو رہا ہے'' اس نے اسکوٹی کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''اب تک سو رہا ہے وائز یہ تو......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ڈاکٹر فرانس تھوڑی دیر پہلے آیا تھا'' وائز نے اپنی بیوی کے کندھے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا ''اس کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر بھی تھا ماہر اعصاب......'' اینی نے دیکھا کہ اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

''ماہرِ اعصاب؟''

''ہاں'' وائز نے اس کے سوالیہ لہجے کے جواب میں سر ہلایا۔

''انہوں نے کیا کہا؟ وائزی خدا کے لیے......انہوں نے کیا کہا؟'' وہ چیخ پڑی

''انہوں نے کہا کہ یہ دماغ کی چوٹ کا اثر ہے اور کچھ نہیں ہے اندرونی چوٹ ہے کہیں کوئی رگ متاثر ہوئی ہے۔ اس طرح کے زخم کا ایکسرے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کسی ٹیسٹ میں پتہ نہیں چلتا۔ وہ اسے نیچے لے جائیں گے۔ آپریشن کریں گے۔ مگر سر کا آپریشن تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے یہ ان کی لاپروائی نہیں ہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتا تب بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا دماغ کی اندرونی چوٹ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا''۔

''وائز اوہ وائز'' اینی اچانک بکھر گئی ''وائز اسکوٹی' وائزی''

جب اسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے خاوند کے پہلو میں بیٹھی تھی اور میز کی دوسری طرف ڈاکٹر فرانس فرطِ جذبات سے بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ مار رہا تھا اور مسلسل بول رہا تھا'' میں اپنے احساسات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ آپ کے بیٹے کو پیش آیا اسے میڈیکل کی اصطلاح میں رگوں کا پوشیدہ الجھاؤ کہتے ہیں۔ یہ بہت کم...... بہت ہی کم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایکسرے میں دکھائی نہیں دیتا۔ سر پر چوٹ لگنے سے

زخمی ہونے والے ایک لاکھ افراد میں سے شاید ایک اس صورتِ حال کا شکار ہو۔لیکن جسے ایسا زخم آجائے وہ......وہ......" اینی کا دل پھر ڈوبنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وائز بلند آواز سے رونے لگا۔ڈاکٹر خاموش ہو گیا کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر باتھ روم میں گیا اُس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر چہرے کو تولیے سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کیا۔وہ جانتا تھا کہ اینی کے اعصاب شل ہو گئے ہیں اور اب اُسے تن تنہا کڑے حالات کا سامنا کرنا ہے۔

"میں آپ لوگوں کے لیے اور کیا کر سکتا ہوں؟" اینی کے حواس بحال ہوئے تو اسے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔اسے بھوک اور بے خوابی کے باعث شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

"ہم اسکوٹی کو......میرا مطلب ہے اسکوٹی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے؟" وائز نے پوچھا۔

"ہمیں ابھی کچھ اور چیزوں کی تفصیلات معلوم کرنی ہوں گی کچھ باتیں ابھی تک وضاحت طلب ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے'پوسٹ مارٹم؟"

"ہاں"

"نہیں،نہیں،نہیں" اینی کی چیخیں لرزہ خیز تھیں "میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔جب ضرورت تھی تو تمہارے منحوس اوزار بے کار پڑے رہے ہیں۔میں اب اس کی چیر پھاڑ کی اجازت نہیں دوں گی مجھے میرا اسکوٹی چاہیے ثابت و سالم......"

"آپ تو میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟" ڈاکٹر نے وائز کو مخاطب کیا۔

"ہاں!کیا؟اوہ نہیں۔نہیں ڈاکٹر میں کچھ نہیں سمجھ رہا" وہ ایک بار پھر ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

"یہ ایک حادثہ تھا غیر طبعی موت" اس مرتبہ ڈاکٹر کا لہجہ بہت مضبوط تھا "ہم پر کچھ قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔تابوت آپ کے گھر پہنچ جائے گا تجہیز و تکفین آپ ہی کریں گے"۔

گھر پہنچ کر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گئے وائز کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔جبکہ اینی کی آنکھوں میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔دن ڈھلنے لگا تو وائز چونک گیا۔اس نے اُٹھ کر اسکوٹی کے کمرے کا دروازہ بند کیا۔اس نے سوچا تھا کہ وہ تمام گھر میں بکھرے ہوئے اسکوٹی کے کھلونے جمع کر کے ایک بڑے بکس میں بند کر کے کسی یتیم خانے میں بھجوا دے گا۔مگر پھر اُس نے بغیر کسی خاص وجہ کے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔اسکوٹی کے کمرے کا

دروازہ بند کر کے وہ صوفے پر واپس آیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کر دوبارہ رونے لگا۔ اینی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ ''وہ چلا گیا ہے'' اُس نے پوری قوت سے اپنی آواز دباتے ہوئے کہا ''وہ چلا گیا ہے اور ہمیں اب تنہائی کا دکھ برداشت کرنا ہے۔ ہمیں زندہ رہنا ہے''۔

کچھ دیر بعد وائز اٹھ کھڑا ہوا اور پورے گھر میں ٹہل کر اسکوٹی کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔ اینی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ رشتے داروں اور شناساؤں کو فون کرنے میں مصروف ہوگئی۔ ہر مرتبہ جب دوسری جانب سے کوئی فون موصول کرتا تو وہ اسے اسکوٹی کی موت کی خبر سناتے ہوئے رو پڑتی چند لمحوں تک رونے کے بعد وہ نیا نمبر گھمانے لگتی۔ اس دوران وائز گیراج کی سمت نکل گیا۔ وہاں وہ اسکوٹی کی سائیکل دیکھ کر ایک بار پھر بے اختیار رو پڑا۔ اُس نے سائیکل کو ہوا میں بلند کیا اور اس کا پچھلا پہیہ زور سے گھمایا۔ پہیہ رکتا تو وہ اسے دوبارہ گھما کر نئے سرے سے آنسو بہانے لگتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بے پناہ غم پر کس طرح قابو پائے۔

اینی اپنی بہن سے بات کرنے کے بعد ڈائری میں ایک سہیلی کا نمبر تلاش کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' اُس نے کہا، مگر دوسری سمت خاموشی رہی۔ ''ہیلو!'' اُس نے دوبارہ کہا ''کون بول رہا ہے؟ کیا بات ہے؟''

''تمہارا اسکوٹی، میں نے تیار کر دیا ہے''۔ ایک مردانہ آواز گونجی ''تم بھول گئیں؟''

''حرام زادے، کتیا کے بچے!'' وہ دھاڑی۔ ''خبیث روح، تم کو یہ شیطان حرکت کرتے شرم نہیں آتی؟''

''کیا مصیبت ہے؟'' کوئی بڑبڑایا ''تم کو تو اسکوٹی بالکل یاد نہیں رہا''۔

وائز اس کی چیخیں سن کر کمرے میں دوڑا چلا آیا۔ وہ سر جھکائے رو رہی تھی۔ اُس نے ٹیلی فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے فون منقطع ہو چکا تھا۔

آدھی رات کے قریب جب وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''تم جواب دو۔ اینی نے اپنے خاوند کو اشارہ کیا ''یہ وہی ہوگا مجھے معلوم ہے''۔

''ہیلو!'' وائز نے کہا۔ ''کون بول رہا ہے؟ ہیلو؟ ہیلو! کسی نے جواب نہیں دیا۔ فون بند ہو گیا۔
وائز واپس آیا تو اینی کی نگاہوں میں دیوانگی کی جھلک تھی ''یہ وہی تھا حرام زادہ۔ مجھے مل جائے تو میں اُسے جان سے مار دوں۔ پورا پستول اس پر خالی کر دوں۔ کتیا کا بچہ''
''اینی' خدا کے لیے'' وائز نے کہا'' کیوں اپنی جان کھا رہی ہو۔ کوئی نفسیاتی مریض ہے''
اینی نے نفی میں سر ہلایا ''خدا کی قسم!'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جائیں......'' اچانک اُسے کوئی خیال آیا۔ وہ چونک گئی ''ٹھہرو'' اُس نے کہا ''وہ......وہ......اسکوٹی۔ سالگرہ۔ کیک۔ ٹیلی فون نمبر۔ اُس نے میز دھکیل دی ''وائز!'' اُس کی آواز پھر بلند ہو گئی۔ فوراً چلو یہ شاپنگ سنٹر کا بیکر ہے''۔
''کیا کہہ رہی ہو؟''
''ہاں! ہاں! مجھے یاد آ گیا ہے۔ یہ بیکر ہے۔ اسے میں نے اسکوٹی کی سالگرہ کا کیک بنانے کو کہا تھا۔ سولہ پاؤنڈ کا کیک۔ اُس کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ وہی فون کر رہا ہے''۔
جب میاں بیوی شاپنگ سنٹر کے سامنے کار سے اترے تو آسمان بالکل صاف تھا' ستارے چمک رہے تھے اور غضب کی سردی تھی انہوں نے گاڑی سے اُترنے کے بعد اپنے کوٹ کے کالر اُونچے کیے۔ تقریباً تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن بیکری کے عقب میں دبیز شیشوں والی کھڑکیوں سے ہلکی ہلکی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ انہوں نے شیشے سے منہ لگا کر جھانکا تو شوکیس کے اندر روشن بلب دکھائی دیے جو غالباً کھانے کی چیزوں کو گرم کرنے کے کام آ رہے تھے۔ شوکیس کے سامنے چند میزیں اور کرسیاں رکھی تھیں۔ انہوں نے پہلے آہستہ آہستہ اور بعد میں زور سے دستک دی۔ لیکن بیکری کے اندر مصروفِ عمل موٹی گردن والے شخص کے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوا۔ وہ غالباً موسیقی کی گونج میں کام کر رہا تھا۔ وائز سڑک پار کی جھاڑیوں سے ایک پتھر ڈھونڈ لایا اور اتنی زور سے دروازہ کوٹنے لگا کہ عام حالات میں پڑوسی گھروں سے نکل آتے۔ موٹے شخص نے منہ اٹھا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا۔ ریڈیو بند ہوتے ہی وہ بلند آواز دستک پر اُچھل پڑا۔ اور تیزی سے آ کر دروازے کی زنجیریں اور کنڈیاں کھولنے لگا۔
بیکر نے دروازہ کھولتے ہی انہیں گھور کر دیکھا ''......یہ کاروبار کا وقت نہیں ہے''۔ اس نے سختی سے کہا ''آدھی رات کو تم کیا منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ اور اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔ تم

دونوں نشے میں تو نہیں ہو؟''

''وہ دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ اینی نے اپنا چہرہ دروازے سے آنے والی روشنی کی سمت جھکایا۔ اس نے اینی کو پہچانتے ہی اپنی بوجھل پلکیں جھپکائیں! ''اوہ!'' اس نے کہا'' یہ تم ہو!''

''ہاں یہ میں ہوں'' اینی بولی'' اسکوٹی کی ماں اور یہ اسکوٹی کے ابا ہیں۔ ہم اندر آنا چاہتے ہیں''۔

اینی کے لہجے میں تلخی تھی۔ بیکر جھجک گیا۔'' میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ مجھے صبح تک بہت سے کام نمٹانے ہیں...... بیکرز رات کے وقت کام کرتے ہیں''۔

''میں جانتی ہوں بیکرز رات کے وقت کام کرتے ہیں اور وہ رات کے وقت ہی فون بھی کرتے ہیں''۔ اینی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں؟'' اپنا کیک؟ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔'' آپ نے سولہا پاؤنڈ کا ایک کیک بنانے کا آرڈر دیا تھا۔ نہیں دیا تھا؟ آج تین دن بعد آپ کو کیک یاد آیا۔ اور آپ مجھ پر طنز کر رہی ہیں۔ اب تو وہ کیک باسی ہو گیا۔ آپ کے کام کا نہیں رہا کسی کے بھی کام کا نہیں رہا۔ آدھی قیمت پر لے جائیں۔ مفت لے جائیں۔ لیکن میرا کیا قصور ہے۔ اسکوٹی کی سال گرہ گزر گئی تو گزر گئی......''

''اسکوٹی مر گیا ہے'' اینی کا لہجہ یک لخت ہموار ہو گیا تھا'' مگر تم...... مگر تم ہمیں فون کر کے پریشان کرتے رہے اس قدر پریشان اس قدر کہ میں...... میں......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بیکر لڑکھڑا گیا۔ اُس نے وائز کی طرف دیکھا۔'' تمھیں شرم آنی چاہیے'' وائز بولا'' وہ تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر بالآخر مر گیا۔ ہم اس دوران سو نہیں سکے۔ کھانے تک سے دور رہے لیکن تم مسلسل فون کر کے ہماری پریشانی میں اضافہ کرتے رہے۔ تمھیں شرم آنی چاہیے''۔

بیکر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے'' اندر آ جایئے'' اُس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا'' پلیز اندر آ جایئے'' جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے بیکر نے ایک میز کے گرد کرسیاں لگا دیں'' بیٹھ جایئے۔ پلیز' بیٹھ جایئے'' وہ اچانک بہت تیزی سے حرکت کرنے لگا تھا۔ اینی اور وائز بیٹھ گئے تو بیکر نے تیسری کرسی سنبھال لی اور میز پر کہنیاں ٹیک کر اُن کی جانب جھک گیا۔ چند لمحوں تک وہ خاموشی سے ایک کے بعد دوسرے کو دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ بالآخر اُس نے مصنوعی انداز میں کھنکھار کر گلا

صاف کیا اور بولا ''یہ بیکری ہے'' پھر اسے فوراً ہی اپنے جملے کی مضحکہ خیزی کا احساس ہوگیا۔ ''میرا مطلب ہے میں صرف ایک بیکر ہوں۔ اُس نے وضاحت کی ''میرا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں ہے میں ایک ان پڑھ' سیدھا سادا' اور بالکل عام سا آدمی ہوں۔ شاید عام آدمی سے بھی کم تر...... جو گناہ میں کر چکا ہوں' اس کی سنگینی اس بات سے کم نہیں ہو جاتی۔ میں جانتا ہوں کہ...... کہ یہ...... مجھ سے بہت ہی کمینی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ صرف میرا خدا جانتا ہے مجھے کتنا افسوس ہو رہا ہے یقین کرو میں بُرا آدمی نہیں ہوں...... میرا مطلب ہے جیسا کہ آپ نے مجھے فون پر کہا کہ ''خبیث روح'' اور شیطان کا بچہ' وغیرہ میں ایسا نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں بس احمق ہوں۔ انتہا کا بے وقوف آدمی...... میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ کوئی اپنا کیک لینے نہیں آیا تو ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ کوئی بڑی وجہ ہوتی ہے تو آدمی اپنے بچے کی سالگرہ منسوخ کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو آپ مجھے معاف کر دیں پلیز''

بیکری اندر سے گرم تھی۔ وہ دیر تک باہر شدید سردی میں کھڑے رہے تھے جس کے باعث اب انہیں بیکری کی اندرونی حرارت بہت پر لطف محسوس ہو رہی تھی۔ وائز نے کرسی سے کھڑے ہو کر کوٹ اتارا' اور اینی کو بھی اس کا کوٹ اتارنے میں مدد دی۔ بیکر انہیں آرام سے بیٹھتے دیکھ کر خوش ہوا اور جلدی سے تنور سے تازہ قیمہ بھرے رولز نکال لایا۔ رولز سے اشتہا انگیز دھواں نکل رہا تھا ''آپ کو کچھ کھانا چاہیے۔ ضرور کھانا چاہیے'' بیکر پیالیوں میں کوفی انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو بہر حال زندہ رہنا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے بدن میں طاقت چاہیے...... طاقت اور حرارت۔ میرا مطلب ہے غم کے موقع پر کچھ کھا لینا اچھی بات ہے۔ مطلب ہے ضروری چیز ہے کیونکہ یہ زندگی ہے اور زندگی......'' اس نے گرم رولز پر مکھن لگا کر ان کے سامنے رکھا'' زندگی تو بسر کرنی ہوتی ہے''۔

اینی اور وائز نے ایک ایک رول اٹھا کر کھانا شروع کیا تو اُس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا'' کھائیں۔ کھائیں کھانا اچھا ہوتا ہے اور یہ بیکری ہے۔ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں اور کھائیں۔ دنیا کی تمام لذیذ چیزیں یہاں موجود ہیں''۔

انہیں تازہ رولز اور گرم کوفی کا لطف آ گیا۔ دونوں کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ اینی نے یکے بعد دیگرے تین رولز کھائے جس سے بیکر کو بہت خوشی ہوئی۔ اُس نے انہیں اور بہت سی

مزیدار چیزیں چکھائیں' اور اس دوران وہ انہیں اپنی تنہائی' ادھیڑ عمری' غیر شادی شدہ زندگی اور بے اولاد ہونے کے قصے سناتا رہا'' کتنی دل چسپ بات ہے؟'' اس نے کہا'' میں نے کبھی شادی نہیں کی۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے مگر میں تمام عمر شادی کی سال گرہوں کے کیک بناتا رہا۔ پوری محنت اور توجہ اور محبت کے ساتھ...... اور اب تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں بچے میرے ہاتھ کے بنے کیکوں پر جلتی موم بتیوں کو پھونکیں مار کر بجھا چکے ہیں۔ اور تالیوں کی گونج میں میرے کیک کھائے گئے' جن میں میرا اخلوص شامل تھا۔ بیکر کا کام اچھا ہے۔ خلقِ خدا اُس کے ہاتھ کی بنی چیزیں کھاتی ہے اور......'' وہ بولتا رہا اور اینی اور اس کا خاوند خاموشی سے کوفی پیتے رہے' اور مختلف چیزیں چکھتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ ان کا وہاں سے اٹھنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

☆

دنیا کا ہر قابلِ ذکر دماغ بالآخر محبت' موت اور وقت کی تثلیث میں گم ہو جاتا ہے۔ اُونچی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وقت کی بساط پر ازل سے دو شاطر (محبت اور موت) برسرِ پیکار ہیں۔ محبت وجود میں لاتی ہے موت واپس عدم میں دھکیل دیتی ہے محبت کی تخلیقات ان گنت ہیں۔ موت کی بربادیاں بھی لامحدود ہیں۔ محبت ترتیب دیتی اور پروان چڑھاتی ہے موت بکھیر کر تہہ میں لے جاتی ہے ہر لاش موت کی فتح کی آئینہ دار ہے ہر نو مولود بچہ محبت کی مستقل مزاجی کا ثبوت ہے۔

محبت اور موت کے اس خون ریز مقابلے میں افراد کی کوئی حیثیت نہیں ہے محبت نسلوں کی بقا کے لیے جان پر کھیل جاتی ہے۔ یہی محبت کی جیت ہے۔ موت افراد پر غالب آجاتی ہے اور یوں وہ محبت کی جزوی جیت کو مکمل فتح میں تبدیل نہیں ہونے دیتی نظامِ شمسی کے اس نیم روشن' نیم تاریک سیارے پر ہست و بود کی ابدی زور آوری میں دونوں فریق یکساں کامیاب ہیں۔ اس تصادم میں افراد کا خون' نسلوں کی سرخ روئی کا سبب بنتا ہے۔ ایک چوہا' ایک بلی' ایک کتا' ایک آدمی مرتا ہے چوہے بلی کتے اور آدمی بدستور عالم رنگ و بو میں اپنی جبلتوں کی تسکین سے سرشار و بے خود ہوتے رہتے ہیں۔ نسلوں کو ختم کرنے سے موت عاجز ہے۔ افراد کو بچانے میں محبت ناکام ہے۔

دنیا کے نمایاں ترین دانش وروں میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ دونوں رجحان طبع

بلند منصبی کا سبب بن سکتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے سے کم تر نہیں ہے۔ چند دانشوروں کی طبیعت تشویش اور اضطراب کی جانب مائل ہوتی ہے چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو لاتعلقی کی راہ اپناتے ہیں۔ مغرب میں اضطراب کو بہت مقدس جذبہ قرار دیا گیا ہے۔

Discontent is divine

مشرق میں لاتعلقی کو خدائی صفت سمجھا جاتا ہے۔

اِنَّ اللہَ لَغَنِی عَنِ الْعٰلَمِیْنِ. بے شک اللہ پوری کائنات سے لاتعلق ہے۔

سقراط نے برضا و رغبت زہر کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔ جبکہ اس کے شاگرد اس کے فرار کے انتظامات مکمل کر چکے تھے۔ اُس نے جان بچانے سے انکار کر دیا اور اپنے شاگردوں سے زندگی کے بارے میں ایک ایسی بات کہی جو لاتعلقی کے معترف دانشوروں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

To Live means to be sick for a long time.

جب پوری زندگی ایک طویل بیماری کے سوا کچھ بھی نہیں تو موت کا والہانہ استقبال کرنے میں کیا قباحت ہے؟

مائیکل اینجلو جو لاتعلقی کی اگلی منزلوں تک پہنچ گیا تھا۔ موت سے پیار کرنے لگا تھا۔ "اگر تم زندگی کو اچھا کہتے ہو" اُس نے سمجھایا "تو اصولاً تمھیں موت بھی اچھی لگنی چاہئے اس لیے کہ موت بھی تو وہی دے گا جس نے زندگی دی تھی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا تحفہ دینے کے بعد کوئی دوسرا تحفہ بُرا دے؟"

پھر ایک مرتبہ اس نے دوسری منطق سے کام لیا "میں موت سے کیوں ڈروں؟ اس نے کہا" جب تک میں ہوں، موت نہیں ہوگی اور جب موت ہوگی تو میں نہیں ہوں گا"۔

جین پال سارتر نے لکھا: "میں موت سے بالکل لاتعلق ہو چکا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب موت آئے گی تو میں اپنے آخری مضمون کی آخری سطر کا آخری لفظ لکھ رہا ہوں گا۔ اس صورت میں وہ میرا کوئی نقصان کرنے سے قاصر ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ موت فقط اس فرد کو مار سکتی ہے جس کا نام سارتر ہے۔ لیکن میں تو پوری نسلِ انسانی کے اندر موجود ہوں۔ جب تک موت نسلِ انسانی کو تباہ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے بھی تباہ نہیں کر سکتی روئے زمین پر ایک بھی انسان کا موجود ہونا جین پال سارتر کا موجود ہونا ہے"۔

گوتم بدھ اتنی مکمل موت مرنا چاہتا تھا کہ آئندہ کسی بھی طرح سے دنیا میں واپس آنے کے تمام

امکانات مسدود ہو جائیں۔ تمام صوفیاء اور اولیاء مرنے سے پہلے ہی مر جانے (فنا قبل از فنا) کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے گروہِ مضطرباں میں کئی عہد ساز شخصیتیں ایسی ہیں جن کی تمام زندگی موت کے خوف تلے بسر ہوئی۔ بابائے نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کا کہنا تھا کہ ’’چالیس برس کی عمر کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میں موت کے تصور سے ہراساں نہیں ہوا۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے مریضوں سے صاف صاف کہنے کو جی چاہا کہ اس کی فکر کیوں کرتے ہو کہ تم پاگل ہو یا نہیں ہو؟ تم پر جنون طاری ہوتا ہے یا نہیں؟ تم واقعی بہت ذہین اور نابغۂ روزگار شخص ہو یا یہ فقط تمہارا وہم ہے؟ حقیقت فقط اتنی ہے کہ تم بالآخر مر جاؤ گے۔ اپنے تمام اندیشوں‘ وسوسوں اور یقین و گمان کے ساتھ معدوم ہو جاؤ گے۔ تم کیا اور تمہاری بیماریاں کیا! میں کیا اور میرا علم و فضل اور انسانی نفسیات پر دسترس کیا!‘‘

اس سلسلے میں ٹالسٹائی کا معاملہ بہت دل چسپ ہے وہ موت سے اتنا زیادہ ڈرتا تھا کہ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودکشی کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بندوق چھپادی تھی کہ کہیں خود کو گولی نہ مار لے۔ گھر کی تمام رسیاں نظروں سے اوجھل کر دی تھیں کہ مبادا پھانسی کا پھندا تیار ہو جائے۔ وہ انتہائی مضطرب شخص تھا اور موت کا ذکر سن کر لرزنے لگتا تھا۔ اس کے چھوٹے بیٹے کا انتقال ہوا تو وہ گھر سے بھاگ گیا۔ کوئی بلانے جاتا تو کہتا ’’کچھ دنوں بعد آؤں گا‘‘ ابھی گھر میں موت کی موجودگی کا امکان ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ موت مجھے بھی اپنی نظر میں رکھ لے‘‘۔

☆

اردو ادب میں علامہ اقبال اور میر تقی میر ایسے شاعر ہیں جنہیں ہم خوفِ مرگ کا اسیر کہہ سکتے ہیں ہر چند کہ علامہ اقبال عشق کی تعریف میں بھی وجدانی انداز اختیار کرتے ہیں مگر موت کے ذکر پر تو محسوس ہوتا ہے جیسے حرفِ آخر کا انکشاف کر رہے ہوں۔ ’’مسجدِ قرطبہ‘‘ دراصل ایک نوحہ ہے جس میں علامہ قاری کی اشک شوئی کے لیے اس طرح کی بات بھی کر دیتے ہیں۔

عشق ہے اصلِ حیات‘ موت ہے اس پر حرام

جین پال سارتر اپنے ناول ’’متلاہٹ‘‘ میں قاری کو حیات و کائنات کی ہر چیز سے مایوس کرنے کے بعد ’’تخلیق‘‘ کا دلاسہ دیتا ہے۔ علامہ کی طرح سارتر بھی پہلے زبان و بیان کی پوری قوت سے

ثابت کر دیتا ہے کہ موت کی موجودگی میں فرد کی اور انفرادی کارناموں کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن پھر مکمل مایوسی سے بچانے (یا بچنے) کے لیے کہتا ہے کہ کوئی ''دھن'' تخلیق کرو کہ موسیقی کی دھنوں اور نظموں اور مصوری کے شاہکاروں کو وقت' یا زوال' یا موت سے گزند نہیں پہنچ سکتی۔ ہوش مند قاری علامہ کی نظم اور سارتر کی ''متلاہٹ'' پڑھنے کے بعد اس طرح کی طِفل تسلیوں سے مزید اُداس ہو جاتا ہے۔

آہ یہ دنیا' یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں' بجلیاں ہیں' قحط ہیں' آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں!!
کلبۂ افلاس میں' دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں' شہر میں' گلشن میں' ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے' نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے' اِک طوقِ گلو افشار ہے
قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' علامہ اس کیفیت میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں ہر صاحبِ دل محسوس کرتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں میں خلا اتر آیا ہوگا لیکن بہت جلد شاعرِ مشرق کی وحشت اثری کو حکیم الامت کی یخ بستہ منطق اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ فرد کی فنا کے فطری غم کو کند کرنے کے لیے قاری پر نسلِ انسانی کی بقا کا خوش کن پہلو اُجاگر کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں قنوطیت اور ناامیدی سے بچنے اور بچانے کی یہ معصوم خواہش دنیا کے عظیم فلسفیوں اور دانش وروں کو مزید غم انگیز بنا دیتی ہے یاد رکھنے کی بات فقط یہ ہے کہ عالمی ادب

کی تمام سنجیدہ کتابیں انتہائی اداس' مایوس کن اور دل شکن تحریروں کی حامل ہیں۔ آسمانی صحیفوں کا بھی اصل موضوع محبت' موت اور وقت ہے۔ گوتم بدھ کا کہنا تھا کہ انسانی آنکھ' سات سمندروں کے پانی سے زیادہ آنسو بہا چکی ہے۔ فقط یہی ایک جملہ آدمی کو تمام عمر کے لیے اُداس کر سکتا ہے۔

اضطراب اور لاتعلقی سے قطعِ نظر موت کا موضوع فی نفسہٖ بہت سنجیدہ ہے اس موضوع پر افسانہ لکھنا شاید ادب کی دُشوار ترین وادی میں سفر کرنا ہے۔ سارتر کا افسانہ ''دیوار'' موت کی نزدیکی سے شعور پر مرتب ہونے والے اثرات کی بہترین عکاسی ہے لیکن سارتر بنیادی طور پر فلسفی ہونے کے باعث اس موضوع کے مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کی گہرائی میں اترا ہے۔ موت سے گھبرا کر اس کا کردار جب آزادی اور وطن اور دوستی اور محبت کے معنی پوچھنے لگتا ہے تو دراصل سارتر واضح کرتا ہے کہ کائنات کے تناظر میں خود ساختہ انسانی جذبات بہت غیر اہم اور بے معنی ہیں۔ سارتر کے دیوار کو زندگی نامی ان دو افسانوں کے ساتھ منسلک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زندگی (اول اور دوم) میں روزمرہ حالات میں موت کا ذکر ہے۔ اور عام صورتِ حال یہی ہوتی ہے۔ (ایک شخص کی موت اور دوسروں کی بحیثیت سوگوار یا تماشائی اس میں شرکت) دیوار میں غیر فطری حالات میں مرنے والوں کا ردعمل دکھایا گیا ہے سارتر کے افسانے کا یہ پہلو اس کو پہلے ہی قدم میں فکشن سے زیادہ فلسفے کے قریب کر دیتا ہے۔ جبکہ ''زندگی'' (اول اور دوم) مرگِ عمومی کی کہانیاں ہیں۔ ان میں اُردو محاورے: ''آج مرے' کل دوسرا دن' اور انگریزی کے اظہار ''.The show goes on' والی کیفیت کا بیان ہے ان افسانوں کی تاثیر میر تقی میر کی ''آہ'' سے بہت مختلف ہے۔

جائے عبرت ہے خاک دانِ جہاں
تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ہے؟
اب جان' جسمِ خاک سے تنگ آگئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

یہ افسانے منکشف کرتے ہیں کہ زندگی' بہر طور و بہر حال جاری رہتی ہے' اور یہ احساس خوشی کے ساتھ ایک عجیب سی اداسی کو جنم دیتا ہے۔

علم تصوف میں بتایا جاتا ہے کہ زمانے میں ہمہ وقت ''حشر و نشر'' کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک

سمت سے ہر لحظہ مخلوقات کو دنیا میں نشر کیا (پھیلایا) جا رہا ہے اور دوسری جانب انہیں مسلسل حشر (جمع ہونے/سمیٹے جانے) کا سامنا ہے۔ یوں زمانے کی گود میں ازل سے ترتیب و ابتری حرکت میں ہیں، اور روئے زمین پر اسی طور ابد تک محبت اور موت کی نبرد آزمائی جاری رہے گی۔

سُنَّۃَ اللہِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبل و لَنْ تَجِدَ السُنَّۃِ اللہِ تَبْدِیلاً

(یہی ہے ازل سے تیرے رب کا طریقہ اور تو ابد تک اس میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا)

جوزف ہیلر

آشوبِ شہر

بالآخر تیسرے دن روزگار دفتر والوں نے سڈنی کو بھی کام پر لگا دیا۔ فی الوقت یہ محض ایک دن کی مزدوری کا بلاوا تھا مگر سڈنی کو پہلی بار اپنا جیب خرچ کمانے کا موقع ملا تھا اور فرطِ مسرت سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے دو ہفتے قبل جب وہ سرسبز میدان میں آباد کاشت کاروں کی ایک چھوٹی سی بستی سے بڑے شہر کے لیے روانہ ہوا تھا تو اس کی ماں اس کی کم عمری کے باعث پریشان ہوئی تھی۔ لیکن سڈنی ہر حال میں دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ شہر پہنچ کر وہ کچھ دن بے فکری سے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اور جمع پونجی ختم ہونے پر اس نے روزگار دفتر میں اپنا نام درج کروا دیا تھا۔ آج صبح دفتر کے منیجر نے اسے بتایا کہ اپارٹمنٹ ہاؤس کی چھٹی منزل پر گھریلو کام کے لیے کسی شخص کو ایک لڑکے کی خدمات درکار ہیں۔ سڈنی کو مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔ چھٹی منزل پر پہنچ کر اس نے دروازے پر درج نمبر پڑھا۔ اور گھنٹی بجا دی چند لمحوں بعد بھورے بالوں والی ایک عورت نے دروازہ کھولا اور سڈنی کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اندر بلا لیا۔ سڈنی نے زندگی میں اتنی خوبصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔

''تم نے اپنی سائیکل کہاں کھڑی کی؟'' عورت نے پوچھا۔

''میرے پاس سائیکل نہیں ہے'' سڈنی نے ادب سے جواب دیا۔ ''میں پیدل آیا ہوں''۔

''اسی لیے اتنی دیر لگائی؟''

''میں فوراً چل پڑا تھا'' سڈنی گھبرا گیا۔ ''لیکن راستے میں پتہ بھی پوچھنا پڑا۔

''میں مذاق کر رہی تھی'' عورت نے مسکرا کر کہا۔ ''تم ہماری توقع سے پہلے پہنچ گئے ہو۔ اسی لیے تمھیں چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ میرا خاوند مصروف ہے۔

''اچھا'' سڈنی نے آہستہ سے جواب دیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ۔ ڈرائنگ روم میں آ جاؤ'' عورت نے اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

جوں ہی وہ اندر داخل ہوا اُسے کمرے میں سجی ہوئی قیمتی اشیاء نے مسحور کر دیا۔ اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں۔ اس قدر آسائش کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''کمرہ پسند آیا؟'' عورت کے لہجے میں طنز تھا۔

''کیا؟ ہاں! بس ایسے ہی دیکھ رہا تھا''

''کوئی بات نہیں۔ عورت نے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔'' ہمارے گھر آنے والے غریبوں کو ہمارے اندازِ رہائش سے لُطف اٹھانے کی اجازت ہے''۔

عورت نے دو تین گہرے کش لینے کے بعد سگریٹ کو ایک جگمگ کرتی ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا پھر اس نے اچانک گھوم کر سڈنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''یہ بالکل تمہارے گھر کی طرح ہے؟'' عورت نے کہا

سڈنی خاموش رہا۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔

''تمہارا گھر بھی ایسا ہی ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟'' عورت نے اصرار کیا۔

''نہیں'' سڈنی نے دھیرے سے کہا۔

''اس لیے وہ اس سے اچھا ہے تمہارا گھر ہمارے گھر سے اچھا ہے نہیں؟''

سڈنی نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں''۔

''میرا گھر ایسا نہیں ہے...... یہ امیروں کا گھر ہے'' سڈنی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

عورت کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے ہاتھی دانت کے ایک ڈبے سے سگریٹ نکالی۔ میز پر شراب کی ایک بوتل اور انتہائی قیمتی گلاس قرینے سے سجے ہوئے تھے۔

''یہ بہت خوبصورت اور آرام دہ جگہ ہے کیا خیال ہے؟'' اب عورت کا لہجہ دھیما ہو گیا تھا۔

''ہاں'' سڈنی نے جواب دیا۔ ''بہت خوبصورت''

''یہاں رہنے والا تو ہمیشہ خوش رہتا ہوگا'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اسے کیا غم ہو سکتا ہے؟''

''پتہ نہیں'' سڈنی نے دوبارہ فرش پر نظریں گاڑ دیں۔

''تمہیں پتہ ہے! تم جانتے ہو دولت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ پتہ ہے نا؟ بتاؤ''

''پتہ ہے مگر...... مگر میں کیا بتاؤں''۔ سڈنی روہانسا ہو گیا۔

عورت نے کچھ سوچتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اپنا گال سہلایا جہاں جہاں انگلیاں لگیں۔ وہاں گال ایک لمحے کے لیے زرد ہونے کے بعد دوبارہ گلابی ہوگیا۔ ''چلو چھوڑو۔ میں تمھیں تنگ نہیں کرنا چاہتی۔ اصل میں جب تک میرا خاوند نہیں آتا مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سے کیا بات کروں''۔

سڈنی زور لگا کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھینچ لایا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ عورت کسی شدید دباؤ کے تحت ایسی باتیں کر رہی ہے۔ وہ بے پناہ خوبصورت تھی اور سڈنی اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

''سڈنی''

''کس سے باتیں کر رہی ہو؟'' دوسرے کمرے سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''لڑکا آگیا ہے''

''کیسا ہے؟''

عورت نے ایک مرتبہ پھر سڈنی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے کھڑا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ اس سے کیا کام کروانا چاہتے ہیں؟

''شکل تو پیاری ہے'' عورت نے بلند آواز سے جواب دیا۔ ''مگر چھوٹا ہے''

قدموں کی آہٹ ہوئی اور درمیانی عمر کا ایک آدمی گردن پر تولیہ رکھے کمرے میں آگیا۔ اس کے گالوں پر سفید جھاگ کے نشان تھے غالباً وہ شیو کرنے کے بعد نہانے جا رہا تھا اس نے کمرے میں داخل ہو کر سڈنی کو غور سے دیکھا کچھ دیر تک وہ پلکیں جھپکاتا رہا اور پھر عورت سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے تو یہ لڑکیوں جیسا دکھائی دیتا ہے''۔

''لڑکیوں جیسے لڑکے......'' عورت کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ''یہ تو میرا مقدر ہے''

''میں اسے واپس بھیج دیتا ہوں'' مرد نے کہا۔ اور دوبارہ سڈنی کی جانب رُخ کرلیا۔

''دیکھو تم واپس جاؤ اور انہیں کہو کوئی بڑا لڑکا بھیجیں۔ تم ہمارے کام کے لیے بہت چھوٹے ہو سمجھے؟''

سڈنی نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف قدم اٹھایا۔

''اسے روک لو'' عورت بولی۔ ''میرا خیال ہے اس کے ساتھ مناسب رہے گا''

''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے''

''ہاں۔ کیونکہ......''

''سنو تم ٹھہرو'' مرد نے عورت کی بات پوری ہونے سے پہلے سڈنی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

سڈنی رُک گیا۔

''میں نہا کر آتا ہوں......اسے کچھ پینے کو دو'' اس نے جانے سے پہلے عورت سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ سڈنی'' اچانک عورت کی آواز میں ہمدردی اور اپنائیت آگئی۔ ''آرام سے بیٹھو۔ ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے''۔

سڈنی کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے کوٹ کے بٹن کھولنے بند کرنے لگا۔ سامنے ایک نوجوان لڑکے کی تصویر رکھی تھی۔ لڑکے نے فٹ بال کے کھلاڑیوں والا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اسے خیال آیا کہ شاید یہ اس عورت کا بیٹا ہو۔

''کیا بات ہے تم اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟'' عورت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ یوں ہی''

''مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہاری دوست ہوں۔ کچھ پیو گے؟''

سڈنی نے نفی میں سر ہلایا۔

''ظاہر ہے تم کیسے پی سکتے ہو۔ تم بہت چھوٹے ہو''۔

''پیتا تو ہوں'' سڈنی فوراً بولا۔

''وِسکی؟''

''کبھی کبھی وِسکی بھی'' اس نے روانی سے جھوٹ بولا۔ ''ویسے بیئر مجھے زیادہ پسند ہے''۔

''بیئر بھی ہے۔ لا دوں؟''

''نہیں۔ ہمیں روزگار دفتر والوں نے کام کے دوران پینے سے منع کیا ہے''۔

''سگریٹ پیو گے؟''

''ہمیں سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں ہے''۔

''یہاں تمہارا جو دل چاہے پیو۔ انہیں کوئی نہیں بتائے گا'' عوت نے بے تکلفی سے کہا۔ ''ویسے تم ایک ہفتے میں کتنا کما لیتے ہو؟''

''میں نے ابھی تو کام شروع کیا ہے'' سڈنی نے بتایا۔ ''یوں بھی میں زیادہ نہیں کما سکوں گا۔ مجھے اسکول میں داخلہ لینا ہے صرف چھٹی والے دن کام کرنے سے زیادہ نہیں بنتا جو لڑکے پورا ہفتہ کام کرتے ہیں وہ بہت کماتے ہیں''۔

''آج تم ان سب سے زیادہ کماؤ گے'' عورت اپنا سگریٹ مسل کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ برف کے ٹکڑے ڈال کر وہ کچھ دیر گلاس کو دائرہ دار گھماتی رہی۔ پھر اس نے گلاس منھ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔

''سڈنی'' اس نے منہ پونچھ کر ایک نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو۔ مجھے یقین ہے اسکول کی لڑکیاں تم پر مرنے لگیں گی''۔

سڈنی جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''تم اپنے محلے کی لڑکیوں کے ساتھ تو کھیلتے رہے ہو گے؟''

سڈنی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ''

''جہاں میں رہتا تھا وہاں اتنی لڑکیاں تو نہیں تھیں مگر پھر بھی''

''......مگر پھر بھی''۔ عورت نے دہرایا۔ ''تم کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیتے ہو گے!''

سڈنی کو محسوس ہوا جیسے اس نے غلط سنا ہو۔ وہ عورت کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''میرا مطلب ہے تم لڑکیوں کے ساتھ کچھ تو کرنے کے قابل ہو گے!'' اس مرتبہ عورت کا لہجہ بالکل واضح تھا۔

سڈنی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔ اس نے سر جھکا کر کھڑکی کے پاس رکھے میز کے پایوں پر نظریں گاڑ دیں۔

''تم جواب نہیں دینا چاہتے تو تمہاری مرضی'' عورت نے کندھے اچکا کر کہا۔

''!''

''کوئی بات نہیں جواب مت دو'' چند لمحوں بعد عورت دوبارہ بولی۔ ''اگر تم اب تک کنوارے ہو تو تمہارا اپنا قصور ہے ویسے لڑکیاں تو تمھیں نوچتی ہوں گی''۔

''نہیں کوئی نہیں نوچتا'' سڈنی نے زور لگا کر جواب دیا۔ اور دوبارہ سرخ ہوگیا

''ضرور نوچتی ہوں گی۔ جھوٹ مت بولو۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ سردیوں میں تو تمہارا چہرہ گلابی

ہو جاتا ہوگا۔کاش میں تمھیں برف باری کے دوران دیکھ سکتی۔ایسے موسم میں تمہارے ہونٹ اور گال......"

سڈنی کو عورت کے تجربے نے حیران کردیا۔ یہ حقیقت تھی کہ سردیوں میں سڈنی کی رنگت گلابی ہوجاتی تھی اور کاشت کاروں کی بستی میں اسے اپنے ہم عمروں میں سب سے زیادہ خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔جب تک اس کا باپ زندہ رہا۔وہ اس محدود آبادی ہی کو کائنات کا مرکز سمجھتا رہا۔مگر بالآخر اسے بہتر مواقع کی تلاش شہر میں کھینچ لائی تھی۔اور بڑے شہر نے اسے حیران کردیا تھا۔اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کسی جگہ انسانوں کی اتنی زیادہ تعداد بھی ہوسکتی ہے۔

اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔"آپ کا بیٹا ہے؟"

"نہیں۔یہ مسٹر اینگل کا بیٹا ہے"۔عورت نے جواب دیا۔"میں ان کی دوسری بیوی ہوں"۔

"اوہ"

"جب تک مسٹر اینگل نے مجھ سے شادی نہیں کی تھی۔یہ یہیں رہتا تھا مگر اب اس نے کالج کے ہوسٹل میں کمرہ لے لیا ہے"۔یہ کہہ کر اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔دوتین گہرے کش لے کر سڈنی کو دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔"تم واقعی خوبصورت ہو۔سڈنی،لڑکیاں تمہارے خواب دیکھیں گی۔مجھے معلوم ہے میں بھی اسکول میں رہ چکی ہوں......جتنی لڑکیاں تمہارے راستے میں آئیں سب سے پیار کرنا۔لڑکیوں کی تخلیق کا مقصد بھی یہی ہے......جتنی بھی لڑکیاں......سب سے تمھیں مزہ آئے گا۔انہیں بھی مزہ آئے گا"۔

سڈنی نے گھبرا کر دوبارہ فرش پر نظریں گاڑ دیں۔

"کیا بات ہے تم پریشان کیوں ہوجاتے ہو؟" اُس نے الجھ کر کہا۔

"پتہ نہیں۔"سڈنی بمشکل بول پایا۔"میں نے آج تک کسی سے ایسی باتیں نہیں سنیں"۔

"کسی سے نہیں؟"

"مطلب ہے جیسی آپ ہیں۔اس طرح کی کسی سے"

"جیسی میں ہوں"۔وہ مسکرانے لگی۔"میں کیسی ہوں۔سڈنی۔میں بہت خوبصورت ہوں نا؟"

"بہت" سڈنی نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔

"شکر ہے۔میں تمھیں پسند تو آئی"۔

سڈنی ایک بار پھر سرخ ہوگیا۔

''میری کیا چیز تمھیں زیادہ پسند ہے؟''
''ہر چیز'' سڈنی نے فیصلہ کیا کہ اب وہ نہیں شرمائے گا۔
''کوئی چیز تو زیادہ پسند ہو گی۔ چہرہ...... یا چھاتیاں...... یا جیسا کہ تمہارے خیال میں میرے کولھوں کا ابھار ہو گا''
سڈنی کو پسینہ آ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ پگھل کر قالین میں جذب ہو جائے گا۔
''بتاؤ...... کیا چیز تمھیں زیادہ اچھی لگی؟''
''اصل میں...... آپ خوبصورت تو ہیں...... لیکن آپ ایسی باتیں نہ کریں''۔
''چلو میں ایسی باتیں نہیں کرتی'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بس اتنا بتا دو کہ تم بستر پر میرا ساتھ دو گے؟''
سڈنی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ''میں...... میں چلتا ہوں۔ مجھے دفتر واپس پہنچنا ہے''
''بیٹھ جاؤ' سڈنی''۔ یکلخت عورت کا لہجہ بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ''اگر میں تمھیں سڑک پر چلتی نظر آتی تو تم دور تک مجھے دیکھتے رہتے اور میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچتے۔ نہیں؟''
سڈنی نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے زندگی میں اتنی خوبصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اگر وہ سڑک پر نظر آ جاتی تو پورا دن اس کے حواس پر چھائی رہتی۔
''اصل میں بات یہ ہے سڈنی' کہ میں تمھیں پسند ہی نہیں آئی' اس نے اُداسی سے کہا۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سڈنی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اسے پسند نہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کا بدن اتنا دل کش تھا کہ دنیا کا ہر مرد اس پر فدا ہو جاتا۔ مگر یہ معاملہ مختلف تھا۔
اسی لمحے اس کا خاوند کمرے میں داخل ہوا ''کیا طے ہوا؟'' اس نے عجیب انداز میں مسکرا کر پوچھا۔
''سڈنی کو میں پسند نہیں آئی'' عورت نے کہا۔
''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم جیسی لذیذ چیز کو کون پسند نہیں کرے گا۔ جاؤ اندر جا کر تیار ہو جاؤ۔ اور ذرا جلدی کرو۔ ہم اسے سارا دن نہیں روک سکتے''۔ مرد بولتا چلا گیا۔
عورت نے خاوند کو اپنا سلگتا ہوا سگریٹ تھمایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ مرد سڈنی کی جانب رخ کر کے مسکرایا۔ اس کی عمر پچاس برس کے قریب تھی اس کا لہجہ جذبات سے عاری اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عورت کے جانے کے بعد وہ چند لمحوں تک خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر

سڈنی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اگر تمھیں کام میں کچھ دیر ہو جائے تو دفتر والے اعتراض تو نہیں کرتے؟''

''ہمیں شام سے پہلے واپس پہنچنا ہوتا ہے''۔

''یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم جا کر پھر واپس آجاؤ...... یا اس طرح کی کوئی اور ترکیب؟''

''پتہ نہیں'' سڈنی نے پھر کوٹ کے بٹن کھولنے بند کرنے شروع کر دیے۔ ''مگر کام کیا ہے؟''

مرد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس ڈالر کے دو نوٹ نکالے۔ ایک نوٹ اس نے سڈنی کی جانب بڑھایا۔ ''یہ لو۔ تم نے اتنا انتظار کیا۔ انتظار کرنا بھی ایک کام ہے''۔ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''دوسرا نوٹ بھی تمھارا ہے۔ بس ہمارا کام کر دو''۔

''کام کیا ہے؟'' سڈنی نے اپنا سوال دہرایا۔

''میری بیوی نے تمھیں نہیں بتایا؟''

''نہیں''

''کام تو آسان ہی ہے''۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے کہا۔

''پیو گے؟''

''نہیں''

''ہاں تو'' اس نے گھونٹ بھر کر ہونٹ پونچھے۔ ''کام مشکل نہیں ہے۔ وہ آئے گی تو بتا دے گی۔ ویسے ہے کیسی؟''

''کون؟''

''وہ۔ میری بیوی''

''!''

''پیاری ہے نا؟''

''ہاں'' سڈنی نے سر ہلایا۔

''بہت پیاری ہے۔ بے پناہ خوبصورت۔ تمھیں اچھی نہیں لگی؟''

''اچھی ہے''۔ سڈنی نے قالین پر بنے ایک نقش پر نظریں جما دیں۔

''وہ بہت خوبصورت ہے۔ میں جانتا ہوں'' اس نے زیر لب کہا اور صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اچانک سڈنی کو محسوس ہوا کہ وہ انتہائی دل شکستہ اور اداس شخص ہے۔

''شاید تمھیں معلوم نہ ہو'' اس نے آنکھیں کھولیں اور گلاس میں مزید شراب انڈیلتے ہوئے بولا۔
''میری بیوی مشہور اداکارہ ہے''۔
''کیا؟ اچھا!'' یکلخت سڈنی کو پورا معاملہ دل چسپ معلوم ہوا جس بستی میں اس کا بچپن گزرا تھا وہاں فلمی اداکاروں کو آسمانی مخلوق سمجھا جاتا تھا اور آج وہ اداکاروں کے گھر بیٹھا ان سے گفتگو کر رہا تھا۔
''آپ بھی ہیرو ہیں؟'' سڈنی نے پوچھا۔
''ہاں۔ لیکن میں ٹیلی ویژن پر کام کرتا ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور گہری سوچ میں چلا گیا۔
''لیکن وہ...... میری بیوی بالکل خوش نہیں''۔ چند لمحوں بعد مرد درد میں ڈوبی آواز میں بولا۔ ''میں خوش نہیں ہوں۔ ہم دونوں...... ہم بالکل خوش نہیں ہیں''
''کیوں؟'' سڈنی نے حیرت سے پوچھا۔
''بس۔ معلوم نہیں کیوں۔ اسی لیے تو ہم نے تمھیں بلوایا ہے۔ ہماری مدد کرو گے؟''
''میں کام کرنے ہی تو آیا ہوں''۔
''تمہاری عمر کیا ہے؟''
''پچھلے مہینے میری سولہویں سالگرہ تھی''۔
''خدایا! تم بہت چھوٹے ہو۔ بے خبر اور غافل۔ اسی لیے خوش ہو''
ویسے تمہاری شکل پیاری ہے لڑکیوں کے ساتھ تو کامیاب رہتے ہو گے؟''
سڈنی ایک بار پھر شرما گیا۔
''دیکھو میں عورت نہیں ہوں۔ مجھ سے مت شرماؤ۔ تمھیں لڑکیاں کیسی لگتی ہیں؟''
''کچھ تو اچھی ہوتی ہیں''
''......اور کچھ؟''
''کچھ اچھی نہیں ہوتیں''۔
''کس لحاظ سے؟''
سڈنی کو خود کو دوبارہ موم کی طرح پگھلتے محسوس کیا۔
''کبھی کوئی زبردست لڑکی بھی ملی؟''

''ہاں۔کبھی کبھی۔کوئی تو ہوتی ہے''

''کوئی بھی اس جتنی خوبصورت تھی؟''اس نے اندر کی سمت اشارہ کر کے پوچھا۔''اس طرح کی۔ اتنا قد......ایسا بدن؟''

سڈنی نے کمرے کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھ کر فوراً سر جھکا لیا۔''نہیں۔اتنی خوبصورت تو کوئی نہیں تھی۔''اس نے آہستہ سے کہا۔

مرد نے سڈنی کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔''ایسی عورت لاکھوں میں ایک ہوتی ہے......اس کے ساتھ......ہم بستری کرو گے؟؟''

اچانک سڈنی کو مرد پر رحم آنے لگا۔وہ عجیب کرب میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں چمک اب وحشت میں تبدیل ہو گئی تھی اور آواز میں التجا تھی۔

''اتنی خوبصورت لڑکی کے ساتھ کون بستر پر نہیں جانا چاہے گا''۔بالآخر سڈنی بالغوں کا لہجہ اپنانے میں کامیاب ہو گیا۔''لیکن میں آپ لوگوں کا کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے آیا ہوں۔یہ میری نوکری کا وقت ہے''۔

مرد نے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔کچھ دیر تک وہ صوفے پر پشت لگا کر گہرے سانس لیتا رہا۔ پھر خوابیدہ لہجے میں بولا۔''کبھی تم شہر کی گلیوں میں رستا بھولے ہو؟''

''ہاں نیا نیا آیا تھا تو اکثر بھول جاتا تھا''سڈنی موضوع تبدیل ہونے پر خوش ہوا۔

''اب بھی اندرون شہر جانا پڑے تو بھٹک جاتا ہوں۔یہ بہت بڑا شہر ہے''

''بھٹک جانے کا احساس بھی عجیب احساس ہے''

''کیوں؟ مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ہاں شروع میں ڈر سا لگتا تھا مگر اب کسی سے پتا پوچھ لیتا ہوں اور بس......''

''بڑے شہر میں راستہ گم کر دینا بہت اذیت ناک ہوتا ہے''مرد مدہم اور دکھ بھری آواز میں بولتا رہا'' ......اور دنیا بڑے شہروں سے بھری ہوئی ہے۔اتنے بڑے شہر ہیں......اور آدمی کا دماغ بھی ایک بہت بڑا شہر ہے۔بہت بڑا شہر۔جہاں آدمی بھٹکتا پھرتا ہے......ساری زندگی......راستہ ڈھونڈتا ہے۔ٹھوکریں کھاتا ہے مگر راستہ نہیں ملتا......ملتا ہی نہیں...... ہیں؟''اس نے تیزی سے پلکیں جھپکا کر سنبھلنے کی کوشش کی۔مگر جلد ہی اس کی آنکھیں دوبارہ ویران ہو گئیں۔سڈنی خاموش رہا۔وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود متاثر ہو رہا تھا۔

''دنیا ایک بہت بڑا شہر ہے اور ہم سب اس شہر میں اجنبی ہیں بھٹک رہے ہیں'' وہ دوبارہ سحر زدہ انداز میں بولنے لگا۔ سڈنی کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کی موجودگی کو فراموش کر چکا ہے۔

''ایک ہاتھ ہے...... جو دماغ کے گنجان آباد شہر میں چیزوں کو ٹٹول کر راستہ تلاش کر رہا ہے'' اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر انگلیوں سے کنپٹی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''......اس قدر شدید درد ہوتا ہے' وہی ہاتھ ہے۔ نوچتا ہے۔ اندر ہی اندر خراشیں ڈال دیتا ہے'' اچانک وہ خاموش ہو کر سڈنی کو غور سے دیکھنے لگا۔ ''تم سمجھ رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں۔ شاید یہی کہ......''

''تم کچھ نہیں سمجھ رہے'' اس نے تند لہجے میں کہا۔ ''تم بہت چھوٹے ہو......اور یہ ہیلن کہاں رہ گئی ہیلن!'' وہ ساتھ والے کمرے کی سمت گھوم کر چیخا۔ ''اب آ بھی جاؤ ہم اسے سارا دن تو نہیں بٹھائے رکھیں گے''

یہ کہہ کر وہ وہسکی کا ایک اور گلاس بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اب اس نے شوخ نیلی رنگ کا ریشمی گاؤن پہنا ہوا تھا۔ جب وہ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چلتی تو ریشمی کپڑے کے اندر اس کے کولہوں کی حرکت صاف نظر آتی تھی۔

''کہاں تک پہنچے؟'' اس نے اپنے خاوند سے دریافت کیا'' اسے بتا دیا؟''

''میرا خیال تھا تم بتاؤ گی'' خاوند نے جواب دیا اور ایک سانس میں وہسکی کا گلاس خالی کر دیا۔

''ٹھیک ہے'' عورت نے کندھے اچکائے اور سڈنی کی جانب گھوم گئی۔

''تم نے کبھی ننگی عورت دیکھی ہے؟''

سڈنی نے دوبارہ قالین پر بنے ایک نقش پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

''خدا کے لیے اب شرمانا چھوڑ دو اور جواب دو''۔ عورت اب مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی''۔ تم نے کسی جوان عورت کو برہنہ دیکھا ہے یا نہیں؟ بولو!''

''نہیں'' سڈنی نے خوف زدہ آواز میں جواب دیا۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ اگر وہ منہ نہ بھینچ لیتا تو اس کے دانت بجنے لگتے۔

کچھ دیر کے لیے سنگین خاموشی چھا گئی۔

''ٹھہرو۔ ہیلن'' مرد نے دخل دیا۔ ''تمھیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے'' یہ کہہ کر وہ سڈنی کے

نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ سنو سڈنی بات یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہیلن کو اپنی گرل فرینڈ تصور کرو۔ اسے چومو۔ خوب چومو۔ جیسے وہ تمہاری محبوبہ ہے اور......

''کیا مطلب ہے؟'' سڈنی روہانسا ہو گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''مطلب یہی ہے کہ تم اسے اپنی محبوبہ سمجھو اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرو۔ جو تم لڑکیوں کے ساتھ کرتے ہو۔ اور کیا مطلب ہے'' مرد چڑ گیا تھا۔

سڈنی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں پسینے سے بھیگ گئے تھے۔

''نہیں'' اس نے پورا زور لگا کر کہا۔ ''یہ...... یہ......'' وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ''آپ کا نوٹ...... آپ واپس لے لیں''

''نوٹ کو آگ لگاؤ'' مرد چیخ پڑا۔ نوٹ تمہارا ہو گیا ہے۔ تم ہماری بات کیوں نہیں مان رہے۔ بتاؤ؟''

''کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بہت بری بات ہے''

مرد کا قہقہہ بہت تلخ تھا۔ ''تم سمجھ نہیں رہے۔ یہ بالکل بری بات نہیں ہے'' اس نے سامنے رکھی لڑکے کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے اس لڑکے کو دیکھا'' یہ ہمارا بیٹا ہے میرا اور ہیلن کا...... ہمارا یہ بیٹا مر گیا ہے۔ ہیلن کو بہت یاد آتا ہے تمہیں معلوم ہے مائیں کیسی ہوتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں تم اس لڑکے کی جگہ لے لو۔ اور ہیلن سے ہمدردی کرو۔ اسے پیار کرو...... پیار کرو سمجھے؟''

سڈنی کو معلوم تھا کہ مرد جھوٹ بول رہا ہے۔ تصویر والا لڑکا ہیلن کا بیٹا نہیں ہے مگر پھر اسے یاد آیا کہ شہر میں بھٹک جانے کی بات کرتے ہوئے اس نے کس قدر دردناک انداز میں اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کنپٹی دبائی تھی۔ سڈنی کو مرد پر ترس آنے لگا۔

''اچھا تو میں اسے اپنی ماں کی طرح پیار کروں؟'' سڈنی نے پوچھا۔

''نہیں'' مرد پریشان ہو گیا۔ ''جیسے...... جیسے یہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''

سڈنی نے عورت کی طرف دیکھا وہ اسے ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سڈنی کو اس پر رحم آنے لگا۔

''ٹھیک ہے'' سڈنی نے کہا۔ ''اگر ہیلن خود مجھ سے کہے تو میں اسے پیار کر لوں گا''

عورت کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ ''سڈنی مجھے پیار کرو'' اس نے دھیرے سے کہا۔

مرد فوراً وہسکی کا نیا گلاس تیار کرنے لگا۔ سڈنی آہستہ آہستہ عورت کے پاس گیا۔ اسے اپنے پیچھے گلاس میں برف گرنے کی آواز سنائی دی۔ عورت کے پاس پہنچ کر سڈنی رک گیا۔ وہ اس سے زیادہ دراز قامت تھی۔ ''ڈرومت'' اس نے سڈنی پر جھکتے ہوئے کہا ''میں تمہاری محبوبہ ہوں''۔ سڈنی نے مرد کی سمت دیکھا۔ وہ اب وہسکی کا گلاس تھامے ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' مرد نے تائید میں سر ہلایا ''اسے اپنی محبوبہ سمجھو'' اور تمہیں معلوم ہے جس سے محبت ہو اس سے کس طرح پیار کیا جاتا ہے''۔

سڈنی کا منہ خشک ہو گیا تھا اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ عورت کے کندھوں پر رکھ کر اس کے ہونٹوں کو چوما۔ عورت نے اس کی کمر کو بازوؤں میں لے کر اپنی سمت کھینچا۔ عورت کی چھاتیوں کا لمس محسوس ہوتے ہی سڈنی تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' مرد نے پوچھا۔

''یہ ڈرتا ہے'' عورت نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''ڈرے گا کیسے نہیں'' مرد کا لہجہ کرخت ہو گیا۔ ''تم بھی تو ایک دم اس کی پسلیاں توڑنے لگیں تھیں۔ آہستہ آہستہ کرو...... مسکراؤ مسکرانا بھول گئی ہو کیا؟''

عورت عجیب اداس انداز میں مسکرائی۔

سڈنی نے آج تک کسی چہرے کو اتنی تیزی سے ماند پڑتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند لمحے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر اس نے سڈنی کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا۔ اور جھک کر اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ سڈنی منجمد ہو گیا۔ وہ دیر تک اس کے ہونٹوں کو اپنی زبان سے کھولنے کی کوشش کرتی رہی پھر یکلخت اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ تو کچھ نہیں کر رہا۔ کچھ بھی نہیں۔'' اس نے چیخ کر کہا ''میں اکیلی کیا کروں؟''

عورت کچھ دیر تک سڈنی کو نم آنکھوں سے دیکھتی رہی

پھر اس نے قدم بڑھا کر سڈنی کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی اس کے آنسوؤں سے سڈنی کی پشت بھیگنے لگی۔

مرد چھلانگ لگا کر سڈنی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا ''اسے پیار کرو۔ ناکارہ آدمی۔ اسے پیار کرو۔ احمق''

اس نے سڈنی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ عورت سمیت صوفے پر گر گیا۔ عورت اب بلند آواز سے رو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش دکھ کی شدت سے مسخ ہو گئے تھے اچانک وہ سڈنی کو

فرش پر دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''کوئی فائدہ نہیں'' وہ مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیخی ''یہ بہت چھوٹا ہے'' انہیں کہو کوئی بڑا لڑکا بھیجیں۔ بڑا لڑکا۔ سمجھے۔ ہمیں بڑا لڑکا چاہیے''

سڈنی نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے کنکھیوں سے عورت کی سمت دیکھا وہ اپنے بازوؤں میں چہرہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ ہر سسکی پر اس کا پورا بدن لرز جاتا تھا۔ اچانک مرد نے سڈنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''سنو!'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا ''کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھے؟ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ سمجھے؟''

''ضرور بتانا' سڈنی'' دفعتہً عورت اٹھ کر چیخنے لگی۔ ''سب کو بتانا۔ سب کو''
''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ ہیلن!'' مرد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
''تمہاری آواز گھر سے باہر جا رہی ہے''۔
''نہیں'' عورت نے اپنا چہرہ مرد کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ ''ضرور بتانا میں کہتی ہوں سڈنی۔ پوری دنیا کو بتانا۔ بھولنا مت''۔
''بھونک مت کتیا'' مرد کی آواز سے کمرہ گونج گیا۔
''سڈنی' یاد رکھنا.....''

''مرد نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر چانٹا مارا۔ وہ کسی بے جان چیز کی طرح فرش پر گر گئی۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مرد کچھ دیر تک اسے اداسی سے دیکھتا رہا پھر وہ سڈنی کی جانب پلٹا۔
''سنو'' اب مرد کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔ ''کسی سے ذکر مت کرنا'' اس نے پچاس ڈالر کا دوسرا نوٹ بھی سڈنی کی جیب میں ڈال دیا۔ ''بھول جاؤ۔ کچھ بھی نہیں ہوا سمجھے؟''
سڈنی نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔
''کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے'' مرد نے دہرایا۔
سڈنی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا اسے عورت کی دھیمی دھیمی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔
مرد نے دروازہ کھول دیا۔ ''تم سب کچھ بھول جاؤ گے نا؟''
''ہاں'' سڈنی نے دھیرے سے کہا اور کمرے سے باہر قدم رکھ دیا۔
اُس کی پشت پر دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔

☆

ممکن ہے بعض لوگ جوزف ہیلر کی اس شاہکار کہانی کو فحش قرار دیں مگر اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آج تک دنیا میں کہیں بھی فحاشی کی واضح تعریف نہیں ہو سکی ہے۔ یہ اتنی تہہ در تہہ اور الجھی ہوئی بحث ہے کہ کچھ ہی دیر میں فریقین کا سر چکرا جاتا ہے۔ قدیم یونانی شاعری میں ایسے الفاظ بغیر کسی جھجک کے استعمال ہوتے تھے۔ جو آج قابلِ قبول نہیں ہیں۔ شہر کے عین وسط میں ایسے ناٹک رچائے جاتے تھے۔ جن کے موضوعات خالص جنسی اور مکالمے انتہائی بے باک ہوتے تھے۔ افلاطون کو ایسی شاعری اور ناٹک پر کوئی اعتراض نہیں تھا البتہ وہ نوجوان لڑکوں کو اس طرح کی تفریح میں حصہ لینے سے روکتا تھا کیوں کہ اس کے کہنے کے مطابق ایسی سرگرمیوں میں شامل ہونا کاہلی اور بسیار خوری جیسی برائیوں کو جنم دیتا تھا۔ اور بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ بعد میں آنے والی رومن تہذیب نے بھی یونانیوں کا یہ رویہ اپنایا اور یونان کے شرابی دیوتا ڈایونیس کو اپنی تہذیب کا لبادہ پہنا کر محوِ رقص رہنے دیا۔ رومن تہذیب کے عظیم شاعروں نے ایسی نظمیں لکھیں جنھیں اپنے زمانے میں قبولیتِ عام حاصل ہوئی مگر ان کے تراجم پڑھتے ہوئے نشاۃِ ثانیہ کے معزز افراد کے چہرے سرخ ہونے لگے۔ بالآخر انہیں قانونی طور پر غیر اخلاقی قرار دیا گیا جس کے نتیجے میں وہ زیرِ زمین زیادہ تعداد میں فروخت ہونے لگے۔

خلافِ تہذیب تحریروں کے باب میں صدیوں کی بحث و تمحیص کے بعد دو نظریات سامنے آئے۔ ایک کے مطابق' ادب افراد کے کرداروں پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے فقط ایسا ادب قابلِ قبول ہوسکتا ہے جو اخلاق سنوارنے والا (EDIFICATION) ہو۔ دوسرے مکتبہٗ فکر سے وابستہ افراد دانشوروں کا مؤقف یہ ہے کہ ادب صرف اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے جو معاشرے میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ادب سے اخلاق سنوارنے (EDIFYING) کا مطالبہ بے معنی ہے۔ ان دو مدرسۂ ہائے فکر کے درمیان فحاشی کی تعریف پر بھی اتفاق رائے نہ ہوسکا ایک نے کہا کہ جو تحریر خیالِ بد کو انگیخت کرتی ہے فحش ہے۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ جب انسانوں کے ایسے گروہ کا سراغ بھی لگایا جاچکا ہے جس کے لیے دنیا کی ہر مدّ ور اور مخروطی چیز جنسی خیالات اُبھارنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ تو بات کہاں ٹھہرے گی؟ ایک نے دعویٰ کیا کہ کچھ تحریریں کم از کم نابالغوں کے لیے مضر ہوتی ہیں اور ان کا مطالعہ ناپختہ ذہنوں کو ایسے خیالات کی آماجگاہ بنا دیتا ہے۔ جو قبل از وقت ہونے کے باعث پراگندگی کا

موجب ہوتے ہیں۔ دوسرے نے دلیل دی کہ کچی عمروں والوں کے لیے تو لغت میں درج ممنوعہ الفاظ و محاورات اور طبی کتابوں کے مصور صفحات بھی تلذذ یا الجھن کا سبب بن سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ مختلف جغرافیائی ماحول میں مختلف اخلاقی اقدار پرورش پاتے ہیں۔ اگر بدن کپڑوں سے ڈھکا رہے تو جاپانیوں کے نزدیک بوس و کنار (PETTING) فحاشی کے زمرے میں نہیں آتی۔ افریقہ کے بیگانڈا قبائل میں عورتیں مکمل برہنہ گھومتی ہیں جبکہ مردوں کو گردن سے گھٹنوں تک کا حصہ ڈھانپنا پڑتا ہے۔ اسکیمو عورتیں اپنے گھروں میں چاہیں تو ایک برائے نام چادر اوڑھے رہیں اور چاہیں تو اس سے بھی بے نیاز ہو جائیں۔ لیکن انہیں اجنبیوں کے سامنے جوتے اتارنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک ہی علاقے میں مختلف زمانے مختلف تہذیبی معیارات کو فروغ دیتے ہیں۔ بابائے انگریزی شاعری چوسر نے چودھویں صدی عیسوی میں اپنی منظوم کہانیوں میں ایسا فطری طرزِ اظہار اپنایا جو انیسویں صدی کے وکٹورین معاشرے میں گردن زدنی تھا۔ چوسر نے بلا تکلف اپنی نظموں میں ایسے قوافی باندھے جو آنے والے عہد میں سو فیصد سوقیانہ قرار دیے گئے۔ ہر چند کہ یہ بات دراز کار معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت ہے کہ انیسویں صدی میں شیکسپیئر کے ڈرامے بھی قابلِ اعتراض الفاظ حذف کرنے (PURGATION) کے بعد اسٹیج پر پیش کیے گئے۔ انیسویں صدی میں شکسپیئر کے کلیات سے تمام غیر شائستہ الفاظ نکال دیے گئے۔ اور باقی ماندہ کتاب کو فیملی شکسپیئر (The Family Shakespeare) کے نام سے منظرِ عام پر لایا گیا۔ اور اس کے سرورق پر یہ سرخی بھی سجائی گئی ''آپ شکسپیئر کے ڈرامے اب اپنے خاندان والوں کے سامنے با آواز بلند پڑھ سکتے ہیں''۔

امریکہ میں گزشتہ صدی کے خاتمے کے قریب ٹالسٹائی جیسی عظیم الشان ادبی شخصیت کی ایک تحریر کو بنیاد بنا کر اسے ''غلیظ لکھاری'' کے خطاب سے نوازا گیا (ٹالسٹائی کے خلاف فیصلہ دینے والوں میں مسٹر روز ویلٹ بھی شامل تھے جو بعد میں امریکہ کے چھبیسویں صدر منتخب ہوئے) ایسا بھی ہوا کہ ایک کتاب امریکہ میں عریاں قرار پائی جبکہ انگلینڈ میں اسے ادب کے روشن چراغ کی حیثیت حاصل ہوئی اور دوسری کتاب کو انگلینڈ میں غیر اخلاقی کہہ کر ضبط کر لیا گیا۔ جبکہ امریکہ والوں کو اس میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ یہ مضحک صورتِ حال فقط انگریزی بولنے والے ملکوں تک محدود نہیں تھی۔ فرانس کے تقریباً تمام مشہور

ادیبوں کو وقتاً فوقتاً اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ فلابیئر کو مادام بواری لکھنے کے گناہ پر سرزنش کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ مگر ملک الشعرا بوڈیلیئر کو اپنے عہد ساز مجموعۂ شاعری پر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

ادب میں شائستگی اور غیر شائستگی کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور موضوعی ہے کہ اس پر کوئی حتمی رائے دینا ناممکن ہے۔ صدیوں کی سر پھٹول اور ان گنت تشریحات کے باوجود ہم ادب میں عریانیت کے بارے میں اب تک کوئی واضح مؤقف اختیار نہیں کر سکے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ نہایت دل چسپ ہے کہ ڈی ایچ لارنس (جو خود تمام عمر فحاشی کے الزامات کا شکار رہا اور اپنی تحریروں کے دفاع میں دنیا بھر کی تاویلات سے کام لیتا رہا۔) جیمز جوائس کے تاریخ ساز ناول یولیسس ULYSSES کو فحش قرار دیتا تھا۔ اور اسے قابلِ ضبطی سمجھتا تھا لارنس کی دلیل یہ تھی کہ اس کی اپنی تحریروں میں نارمل جنسی عمل کا بیان ہے جبکہ جوائس نے کجروی (PERVERSION) کو عظمت کی مسند پر بٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح کی تحریر معاشرے پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

آئر لینڈ ایک ایسا ملک ہے جسے اپنی آبادی اور رقبے کے تناسب سے عظیم لکھاری پیدا کرنے پر بجا طور پر فخر کرنا چاہیے آسکر وائلڈ، جارج برنارڈ شا، جیمز جوائس، سیموئل بیکٹ اور ڈبلیو بی ییٹس جیسے صفِ اول کے ادیب و شاعر بنیادی طور پر آئر لینڈ سے تعلق رکھتے تھے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ پورے یورپ میں خلاف تہذیب تحریروں کے سلسلے میں اسی ملک کا قانون سب سے سخت ہے۔ پانچ اراکین پر مشتمل ایک سنسر شپ بورڈ میں جس کتاب کو چاہے غیر اخلاقی قرار دے کر اس پر پابندی عائد کر سکتا ہے۔ اس بورڈ کے فیصلے کے خلاف عدالت سے رجوع کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ یہ بورڈ اپنے ملک کے تقریباً تمام نمایاں ادیبوں کو فحش نگار قرار دے چکا ہے۔ ان فحش نگاروں میں چار ایسے ادیب بھی تھے جنھیں بعد میں ادب کا نوبل انعام کا حقدار سمجھا گیا۔

جارج برنارڈ شا کو بھی موجودہ صدی کی ابتدا میں امریکہ میں عریانیت کے پرچار پر ٹوکا گیا تھا۔ برنارڈ شا ایک سنجیدہ ذہن کا ادیب تھا اور وہ اپنی تحریروں کے دفاع میں طویل تقریریں کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے امریکہ کے بارے میں یوں رائے زنی کی اور خاموش ہو گیا" یہ دوسرے درجے کی نیم شہری نیم دیہی تہذیب ابھی ادب سمجھنے کے قابل

ہی نہیں ہے''۔

ہنری ملر، جس کی تحریروں کی تندہی نے اس صدی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا ایک عرصے تک فرانس میں اپنی اصل زبان (انگریزی) میں قابلِ قبول رہا مگر اس کی کتابوں کے فرانسیسی ترجمے پر پابندی عائد تھی۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت مضحکہ خیز صورتِ حال تھی۔ اردو کا دامن ایسے تضادات سے بھرا ہوا ہے قدماً کی شاعری میں وہ الفاظ جن کی جگہ آج تین نقطے لگا دیے جاتے ہیں کسی زمانے میں استادوں نے بھرے مجمع میں ادا کیے ہوں گے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ انہیں دوبارہ ادب کا حصہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ وارث شاہ نے اپنی ''اصلی اور بڑی'' ہیر میں متعدد جگہ پنجابی کے ایسے الفاظ قلم بند کیے ہیں جو آج کے معزز شہریوں کا دل دہلا سکتے ہیں۔ بالخصوص عورتوں کی قسمیں بیان کرتے ہوئے وارث شاہ موجودہ معیار کے مطابق ناقابلِ بیان گہرائی میں اترتے چلے گئے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں اور عصمت چغتائی کے ''لحاف'' کا قصہ تو ابھی تازہ ہے 1963ء میں جب اردو کے عظیم ترین ناول ''اداس نسلیں'' کو آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا تو دوسرے دن صدرِ مملکت کے سیکریٹری قدرت اللہ شہاب کو پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان نے فون پر کہا ''یہ جو ''اداس نسلیں'' نام کی لچر بکواس ہے۔ اسے فحاشی کے الزام پر ضبط کر کے مقدمہ دائر کرنے کی مکمل تیاری تھی۔ اب ہم کیا کریں؟''

ان تمام مثالوں سے صرف ایک بات ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی تحریر کو فقط اس کے موضوع اور لفظیات کی بنا پر خلافِ تہذیب یا غیر شائستہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور یوں بھی زندگی میں جنس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت تمام جانداروں کو فقط اس لیے پروان چڑھاتی ہے کہ وہ بالغ ہو کر جنسی عمل میں شرکت کریں، اور اپنے جیسے دوسرے وجود پیدا کرنے کے بعد سوئے عدم روانہ ہوں گوتم بدھ نے ایک مرتبہ اپنے بھکشوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''......نروان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ شہوانی خیالات تھے۔ میری آدھی سے زیادہ قوت ان خیالات سے مقابلہ کرنے میں ختم ہو گئی تھی۔ اگر جنس جتنا طاقت ور ایک بھی اور جذبہ ہوتا تو میں نروان حاصل نہیں کر سکتا تھا''

ادب زندگی کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب کو جنسی موضوعات پر قلم اٹھانے سے روکنا ایسا ہی ہے

جیسے ''چڑیا'' پر مضمون لکھنے والے بچے پر پابندی لگادی جائے کہ وہ ''پرواز'' یا ''اڑنے'' کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی تحریر واقعۃً فحش بھی ہوتی ہے؟ دیگر اعمال کی طرح اس کا انحصار بھی نیت پر ہے۔ اگر لکھاری صرف نفسانی جذبات اُبھارنا چاہتا ہے تو وہ ادبی خصوصیات سے تہی کسی سفلی موضوع پر یک سطحی کہانی لکھے گا۔ لیکن اس طرح کی تحریر کا مقصد بہت جلد واضح ہو جائے گا۔ اور باذوق قاری اسے درخوراعتنا نہیں سمجھے گا۔ نابالغ ذہن وقتی طور پر ضرور اس سے متاثر ہوگا۔ مگر جس معاشرے میں کتابیں نہیں ہوتیں' وہاں ناپختہ طبیعتوں کے لیے دیگر اقسام کی ممنوعہ ''لذتیں'' راہ پالیتی ہیں اور آخری تجزیے میں یہ سب بلوغت کی راہ میں آنے والی فطری اور ناگزیر نشیب وفراز ثابت ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اور عنصر شاملِ حال نہ ہو تو اس طرح کے ''انحرافات'' اور ''تجاوزات'' کا فرد کی عمودی نشوونما پر کوئی منفی اور مستقل اثر نہیں ہوتا۔

1923ء میں جب امریکہ کی اسٹیٹ اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد وہ تاریخی قرارداد سینیٹ میں پہنچی جس کے مطابق کوئی کتاب اپنے ایک بھی غیر اخلاقی یا عریاں جملے کی بنیاد پر قابلِ ضبطی قرار دی جاسکتی ہے تو مشہور سینٹر جیمز واکر نے اہلِ مجلس سے ایک تاریخی سوال کیا۔

''حضرات!'' واکر نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کو کبھی کوئی ایسی گمراہ عورت ملی ہے جو کسی فحش کتاب کے مطالعے سے غلط راستے پر چل نکلی ہو؟'' کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ اور یوں اس قرارداد کو حتمی قانون بننے سے قبل سینٹ میں روک لیا گیا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ امریکہ کے جوزف ہیلر کی یہ کہانی ایسے شادہ شدہ جوڑوں کا المیہ ہے جنہیں مادی آسودگی کی بہتات' شب وروز کی یکسانیت کے عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

محرومی بھی ضروری ہے
کچھ چیزوں کی حسرت رکھ

شہرت ودولت کے حصول کے بعد پیدا ہونے والی لاحاصلی کی کیفیت انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے۔ ایسے جوڑے اپنی زرق برق زندگی کی عمومیت اور اندرونی کھوکھلے پن کو

''انحراف'' کے ہیجان سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر شراب اور دیگر منشیات کی طرح جنسی مہم جوئی کا وقتی تحرک بھی بالآخر افسردگی کو جنم دیتا ہے۔ اس موضوع کو ہیلر نے اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ کہانی کے کرداروں کا روحانی کرب اور آزردگی قاری کے دل پر برف کی تہہ سی جما دیتی ہے۔

بورخیس

تھکے ہوئے آدمی کی منزل

وہ اُسے یٹوپیا (مثالی دنیا) کہتا تھا۔ یٹوپیا ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''ایسی جگہ جس کا کہیں وجود نہ ہو'' (کوئی وی ڈو)

دنیا کا ہر پہاڑ دوسرے پہاڑ سے مختلف ہے۔ مگر روئے زمین پر تمام میدان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک ایسے ہی میدان سے گزر رہا تھا جو بقیہ تمام میدانوں جیسا تھا مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ کون سا ملک یا علاقہ ہے۔

راستہ ناہموار تھا اور چند لمحے قبل بارش شروع ہوگئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو درختوں کے جھنڈ میں ایک چوکور مکان نظر آیا جس کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ دروازہ کھولنے والا شخص اس قدر دراز قد تھا کہ اُسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔ وہ گردن سے پاؤں تک ایک ہی رنگ کے لبادے میں ملبوس تھا۔ میری دستک پر اُس نے یوں بلا تاخیر دروازہ کھولا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ دروازے پر قفل کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

ہم لکڑی کی دیواروں والے ایک طویل کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک میز کے گرد چند کرسیاں رکھی تھیں۔ معلوم نہیں کیوں مجھے وہ میز عام میزوں سے مختلف نظر آیا۔ میز پر وقت کی پیمائش کا ایک قدیم آلہ رکھا تھا۔ پورا کمرہ چھت سے لٹکی ایک لالٹین کی زرد روشنی سے لبریز تھا۔ اجنبی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے متعدد زبانوں میں بات کرنی چاہی مگر ناکام رہا۔ بالآخر اجنبی نے لاطینی میں گفتگو کا آغاز کیا۔ مدتوں پہلے اسکول میں سیکھی جتنی لاطینی مجھے یاد رہ گئی تھی اُسے بروئے کار لاتے ہوئے میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''تمہارے لباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا تعلق ماضی کی کسی صدی سے ہے۔'' اجنبی نے کہا ''اسی لیے تم اتنی زبانیں بولتے ہو۔ ایک سے زیادہ زبانوں کے باعث ایک سے زیادہ گروہ بن جاتے ہیں اور گروہ ایک نہ رہے تو جنگ چھڑ جاتی ہے اس لیے دنیا واپس لاطینی کی جانب لوٹ گئی۔

ممکن ہے انسان دوبارہ زوال پذیر ہو جائے اور زمین پر ایک بار پھر طرح طرح کی بولیاں بولی جائیں، مگر مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے...... اور یوں بھی گزشتہ اور آیندہ کے بارے میں سوچنا بے معنی اور لاحاصل ہے"۔

میں خاموش رہا۔

"اگر تم کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر کراہت محسوس نہیں کرتے تو میں تمھیں کھانے کی دعوت دیتا ہوں۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔

ہم لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر باورچی خانے میں گئے جہاں ہر چیز دھات کی بنی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانے کی چیزیں ایک تھال میں رکھیں اور میز کی سمت لوٹ آئے۔ تھال میں پانی کا بڑا پیالہ، دلیہ، انگور اور انجیر جیسے ذائقے والے چند پھل شامل تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کھانے میں روٹی نہیں تھی۔ میرے میزبان کے چہرے کی رنگت ہلکی زرد اور نقوش تیکھے تھے، لیکن جو چیز اُس کے چہرے کو ناقابلِ فراموش بنا رہی تھی وہ اُس کی آنکھیں تھیں۔ اُن میں غیر معمولی چمک تھی۔ مجھے لاطینی زبان میں اظہارِ خیال کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مگر کچھ دیر تک مناسب الفاظ سوچنے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا "میری اچانک آمد نے تمھیں حیران نہیں کیا؟"

"نہیں" اُس نے کہا "ہر صدی میں کوئی نہ کوئی آہی جاتا ہے۔ اور یوں بھی کوئی زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا۔ کل تک تم بھی گھر واپس چلے جاؤ گے"

اُس کے جواب نے میری ہمت بڑھائی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔

"میرا نام ایڈرو ہے میں 1897ء میں پیدا ہوا تھا میں بیونس آئرس کا رہنے والا ہوں۔ میری عمر ستر سال ہے۔ میں انگریزی ادب کا استاد ہوں۔ اور اپنی مادری زبان میں افسانے لکھتا ہوں"

"عرصہ ہوا میں نے دو افسانوی کتابیں پڑھی تھیں۔ جو خاصی پُرلطف تھیں" اجنبی بولا۔ "کچھ لوگ اس طرح کی کہانیوں کو حقیقت قرار دیتے ہیں۔ مگر ہم حقیقت کے بارے میں بات نہیں کریں گے۔ اب حقیقت سے کسی کو دل چسپی نہیں ہے۔ دلیل اور ایجاد کا عمل حقیقت سے زیادہ اہم ہے ہمارے مدرسوں میں اب بچوں کو شک اور فراموشی کا فن سکھایا جاتا ہے۔ تشکیک اور نسیان کو طویل غور و خوض کے بعد شامل نصاب کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ذاتی اور علاقائی چیزوں کو بھولنے کی تعلیم دی جاتی ہے ہم رواں وقت میں زندہ رہتے ہیں۔ ماضی سے ہمارے پاس کچھ نام پہنچے ہیں۔ مگر

انہیں زبانِ واحدہ بہت جلد گم کردے گی۔ ہم لاحاصل تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ دنوں کے نام اور تاریخوں اور اعداء کو بے معنی پا کر ترک کیا جا چکا ہے تم نے اپنا نام ایڈرو بتایا ہے۔ مگر میں تمھیں اپنا نام نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے فقط ''ایک شخص'' کہہ کر بلایا جاتا ہے۔''

''تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟''

''اُس کا کوئی نام نہیں تھا''

میں نے کمرے میں رکھی چند کتابوں میں سے ایک کتاب اُٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ ہاتھ سے لکھی تحریر صاف، مگر نا قابلِ فہم تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا اشاروں کی زبان، بجائے قلم کے کسی اوزار سے کاغذ پر ثبت کی گئی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ مستقبل کے یہ لوگ زیادہ دراز قد ہی نہیں بلکہ متعدد باریک فنون میں مہارت رکھتے ہیں۔ میری نظریں خود بخود اجنبی کی لمبی اور خوشنما انگلیوں کی طرف اٹھ گئیں۔

''میں تمھیں ایک ایسی چیز دکھاتا ہوں جو شاید تم نے کبھی نہ دیکھی ہو'' اجنبی نے کہا' اور ایک طباعت شدہ کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ چھاپے خانے میں تیار کردہ ایک عام سی کتاب ہے'' میں نے کتاب کی عمومیت کے پیشِ نظر لاپروائی سے کہا۔ ''میرے پاس گھر میں اس طرح کی دو ہزار سے زائد کتابیں ہیں''۔

اجنبی میری بات پر ہنس دیا۔ ''کوئی بھی شخص اتنی کتابیں نہیں پڑھ سکتا'' وہ بولا ''میں نے اپنی عمر کے چار سو سال میں چھ سے زیادہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ اور پھر اہم بات پڑھنا نہیں بلکہ دوبارہ پڑھنا ہے۔ زمانہ ہوا ہم نے کتابیں چھاپنی بند کر دیں۔ اس سے غیر ضروری مواد کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ اور یہ انسان کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے''

''لیکن جو زندگی میں نے گزاری ہے۔ اس میں تو ضروری ہے کہ ہم صبح سے شام تک رونما ہونے والے واقعات سے باخبر رہیں''۔ میں نے اجنبی کو بتایا ''کم و بیش ہر شخص جانتا ہے کہ قومی رہنماؤں کے اجلاس میں کیا طے پایا۔ کن دو ملکوں کے سفارتی تعلقات ٹوٹ گئے۔ پہلے کے صدر نے کیا کہا۔ دوسرے کے وزیر اعظم نے کیا جواب دیا۔ اس طرح کی تمام چیزیں چند گھنٹوں تک گفتگو کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ کیونکہ کچھ دیر بعد دوسری باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں جو پہلی تمام اطلاعات کو پرانا بنا دیتی ہیں۔ سب سے زیادہ سیاستدانوں کے بیانات چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں۔ وزیروں اور سفیروں کو نہ جانے کیا معذوری لاحق ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ہر وقت ان کی

حفاظت کرنے والے موجود رہتے ہیں۔ مگر لوگ پھر بھی ان کی تصویریں کھینچنے کے لیے قطاریں توڑ کر نکل جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات قدموں تلے روندے جاتے ہیں۔ ریاستوں کے حکمران ہمہ وقت ہجوم میں گھرے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی کوئی بات اور کوئی چیز ان کی اپنی نہیں ہے۔ اخباروں میں چھپنے والی تصویروں اور خبریں حقیقت سے زیادہ حقیقی سمجھی جاتی ہیں۔ شور وغل کو بامعنی آوازوں کی حیثیت حاصل ہے۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ اسے وہی چیز خریدنی چاہیے جس کے بارے میں اس کے تیار کنندگان خود چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ وہ معیاری ہے' اور اچھی ہے' اور سستی ہے۔ لوگ ڈاکے بھی ڈالتے ہیں حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ دولت سے نہ خوشی ملتی ہے۔ نہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے''۔

''دولت'' اجنبی کی گونج سنائی دی۔ ''اب دولت کسی کے پاس نہیں ہے' کیوں کہ اس سے بے آرامی اور بازاری پن پیدا ہوتا ہے اسی لیے اب کوئی غریب بھی نہیں ہے کہ غیر ضروری پریشانی سے دوچار ہو۔ سب کا اپنا مقدس کام ہے''۔

''مقدس کام سے کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

شاید وہ میری بات نہیں سن سکا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''نہ ہی اب شہر تعمیر کیے جاتے ہیں ذاتی ملکیت اور وراثت کا تصور بھی ختم ہو گیا۔ سو سال کی عمر میں جب آدمی بالغ ہو جاتا ہے تو وہ اپنا اور اپنی تنہائی کا سامنا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت تک وہ ایک بچہ بھی پیدا کر چکا ہوتا ہے''

''صرف ایک بچہ؟''

''ہاں۔ صرف ایک۔ انسانوں کی تعداد بڑھانے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا مؤقف تھا کہ خدا اپنی مخلوق کے ذریعے خود کو دیکھتا ہے اپنی ذات کا عرفان حاصل کرتا ہے لیکن کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خدا وجود رکھتا ہے اس کے علاوہ زمین پر موجود تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی خودکشی بھی موضوع بحث بن چکی ہے...... مگر میرے خیال میں ہمیں اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹنا چاہیے؟''

میں نے تائید میں سر ہلایا۔

''...... تو سو سال کے بعد آدمی اکیلا رہ سکتا ہے۔ اُسے محبت یا دوستی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے گناہ اور موت کا مسئلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ فلسفہ کی تہہ داریوں یا ریاضی کے فن سے دل بہلا سکتا

ہے اس کے بعد وہ جب چاہے خود کو ہلاک کر سکتا ہے آدمی اپنی زندگی کا مالک ہے۔ آدمی اپنی موت کا بھی مالک ہے۔"

"کیا یہ کوئی مقولہ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ ہماری زبان اب فقط اقوال پر مشتمل ہے"

"لیکن......" میں کچھ جھجکا مگر پھر وہ بات پوچھ ہی لی جو میرے نزدیک بہت اہم تھی"۔ زمین والوں نے خلائی سفر کی ابتدا کر دی تھی۔ اس کا کیا بنا؟"

"قدیم زمانے کے لوگ اسے بہت اہم پیش رفت سمجھتے تھے۔" اجنبی نے اطمینان سے کہا "مگر ہمیں ان کوششوں کی لایعنیت کا احساس ہو گیا تھا۔ آدمی جہاں بھی چلا جائے اپنے ساتھ ہی رہتا ہے اور پھر......" اجنبی عجیب انداز میں مسکرا کر بولا۔ "ہر سفر خلائی سفر ہوتا ہے۔ ایک سیارے سے دوسرے سیارے پر جانا' ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جانے سے مختلف نہیں ہے......تم خلا میں سفر کرتے ہوئے ہی اس کمرے میں آئے ہو"۔

"یہ تو درست ہے' مگر کیمیائی عناصر اور جانداروں کے ارتقاء پر بھی بہت گفتگو ہوا کرتی تھی"۔

اجنبی اس بات کا کوئی جواب دیے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ برف سے ڈھکے میدان پر چاندنی پھیلی تھی۔ ماحول پریشان کن حد تک خاموش تھا۔

"عجائب گھر اور کتب خانے وغیرہ ہیں؟" میں نے سناٹے سے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"نہیں ہم ماضی کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی مر جائے تو اس کے لیے نوحہ لکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن یادگاریں قائم کرنا یا برسیاں منانا یا پتلے وغیرہ بنا کر رکھنے کا رواج ختم ہو گیا ہے...... ہر شخص اپنی پسند کے علوم و فنون خود تخلیق کرتا ہے۔"

اس کا مطلب ہے ہر آدمی خود اپنا برنارڈ شا ہے۔ اپنا عیسیٰ ہے اپنا آرشمیدس ہے۔"

اجنبی نے کوئی لفظ کہے بغیر تائید میں سر ہلایا۔

"حکومتیں قائم ہیں؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "رفتہ رفتہ حکومتوں کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ جب ہر شخص اپنی تنہائی کے ساتھ زندہ رہنے لگا تو جنگیں اور انتخابات اور گرفتاریاں اور رہائیاں اور لگان اور حقوق و فرائض بے معنی ہو گئے۔ سیاستدانوں کی خبریں اور تصویریں چھپنی بند ہو گئیں۔ تو انہوں نے روزمرہ کے عام پیشے اپنا لیے اور ایمانداری سے روزی کمانے لگے۔ ان میں چند اچھے مزاحیہ اداکار ثابت

ہوئے اور کچھ محض اپنی گفتگو سے لوگوں کا دل بہلا کر گزر اوقات کرنے لگے'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ نسبتاً تند لہجے میں بولا۔ ''یہ گھر میں نے خود تعمیر کیا ہے۔ اور یہ دنیا کے بقیہ تمام گھروں جیسا ہے۔ کرسیاں، میز اور برتن بھی میرے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کھیت میری محنت سے قابلِ کاشت ہوئے ہیں۔ میں ان لوگوں کو نہیں جانتا میرے بعد آئیں گے اور انہیں بہتر بنائیں گے...... آؤ میں تمھیں کچھ چیزیں دکھاؤں''

ہم ساتھ والے کمرے میں گئے۔ اُس نے چھت سے لٹکی لالٹین روشن کی۔ کمرے کے کونے میں تاروں والا ایک ساز رکھا تھا۔ دیواروں پر لکڑی کی چوکور تختیاں ٹنگی تھیں جن پر مختلف طرح کی تصویریں بنی تھیں تمام تصاویر میں زرد رنگ نمایاں تھا۔

''یہ میرا فن ہے'' اجنبی نے کہا۔

میں نے تصویروں کو غور سے دیکھا۔ سب سے چھوٹی تصویر میں غروبِ آفتاب کے منظر سے لا انتہا کا تاثر اُبھارا گیا تھا۔

''اگر تمھیں یہ تصویر پسند ہے تو اسے میری جانب سے تحفہ سمجھو''۔ اجنبی نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ ''یہ تمھیں مری یاد دلاتی رہے گی...... مستقبل کے آدمی کی یاد''۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن اُس وقت تک مجھے دیواروں پر ٹنگی چند تختیاں ناقابلِ فہم انداز میں متاثر کرنے لگی تھیں۔ میری نظر بار بار ان کی جانب اُٹھ رہی تھی۔ یہ کہنا تو شاید غلط ہو کہ وہ تختیاں خالی تھیں۔ مگر بہر حال ان پر کوئی چیز واضح نہیں تھی۔

''ان تصویروں میں وہ رنگ استعمال کیے گئے ہیں جو تمہاری ماضی کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں''۔ اجنبی نے میری بے چینی دور کرنے کے لیے کہا۔

اور کچھ دیر بعد جب اُس نے اپنی لمبی ناک اور نازک اُنگلیوں سے ساز کی تاریں چھیڑیں تو مجھے کچھ سنائی بھی نہیں دیا۔

......دروازے پر دستک ہوئی اور ایک لمبی عورت اور تین یا چار مرد اندر آئے۔ وہ سب بہن بھائی لگ رہے تھے۔ یا شاید صدیوں کے ساتھ نے ان کے نقوش ایک جیسے کر دیے تھے۔

''مجھے معلوم تھا تم آج رات ضرور آؤ گے''۔ میرے میزبان نے کہا اور اپنے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ برتن، کرسیاں، میز، تصویریں اور ساز میں سامان اٹھانے میں ان صحت مند اور دراز قامت لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر ہم سامان سمیت گھر سے باہر نکل آئے۔ اس وقت

میں نے دیکھا کہ گھر کی چھت چمڑے کی تھی اور اُس کی ساخت گھوڑے کی زین جیسی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم ایک مینار کے سامنے آ کھڑے ہوئے جس کے اوپر ایک چھوٹا سا گنبد بنا تھا۔
''یہ موت کا مینار ہے'' کسی نے کہا۔ ''اس کے اندر جل کر راکھ ہونے کا انتظام ہے۔ یہ ایجاد ماضی کے ایک محسنِ انسانیت سے منسوب کی جاتی ہے...... غالباً اس کا نام ایڈولف ہٹلر تھا''۔
مینار کا پھاٹک کھولنے والا شخص بھی طویل القامت تھا۔ مگر اب مجھے ان کی درازقدی پر حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ میرے میزبان نے مینار کے دربان سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا اور مینار میں داخل ہوگیا۔ اندر جانے سے قبل اُس نے گھوم کر ہماری جانب دیکھا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔
''لگتا ہے مزید برف باری ہوگی'' عورت نے واپسی پر کہا۔
میکسیکو اسٹریٹ پر واقع میرے گھر میں لکڑی کی ایک تختی رکھی ہے جس پر ہزاروں برس بعد کوئی شخص اُن رنگوں کی مدد سے ایک تصویر بنائے گا جو اِس وقت پورے کرۂ ارض پر بکھرے ہوئے ہیں۔

بورخیس

کتابِ مقدس

اِسپی نوزا اس دشوار گزار وادی میں اپنی کوتاہی سے داخل ہوا تھا۔ چند ماہ قبل جب اُس کے چچازاد بھائی نے اُس سے پوچھا تھا کہ وہ مہم جوئی کے لیے تیار ہے تو اُس نے صرف اس لیے "ہاں" کہہ دیا تھا کہ "نہیں" کہنے پر اُسے انکار کی وجہ بھی بتانی پڑتی' اور اس لمحے وہ گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس کی موجودہ صورتِ حال اُس کی کاہلی کا نتیجہ تھی۔ جب وہ اور ڈینیئل اس دور دراز مقام پر پہنچے تھے تو انہیں وادی کے قدیم باشندوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ مختصر سی آبادی جدید دُنیا سے بالکل الگ اپنے آپ میں مگن تھی۔ تمام لوگ اب تک ابتدائی طرزِ زندگی پر قائم تھے اور مطمئن تھے۔ چند دنوں بعد ڈینیئل کسی کام سے شہر واپس چلا گیا تھا۔ مگر وہ مزید کچھ عرصہ آرام کرنے کے لیے وادی میں رُک گیا تھا۔ اور جب اسپی نوزا نے واپسی کی ٹھانی تو بارشوں کا موسم' خوفناک گرج' چمک اور گھرے سایہ بادلوں کے ساتھ تمام پہاڑی سلسلے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ دو ہی دن کی موسلا دھار بارش میں وادی کا دریا' سیلاب کی طغیانی کے باعث ناقابلِ عبور ہو گیا۔ اب وہ صرف موسم کھلنے کا انتظار کر سکتا تھا۔ اُس کا میزبان خاندان تین افراد' باپ' بیٹا اور ایک لڑکی پر مشتمل تھا۔ باپ بیٹا' طویل القامت اور مضبوط جسموں کے مالک تھے۔ یہ واضح نہیں تھا کہ گھر کی واحد لڑکی ان سے کس حیثیت سے وابستہ ہے۔

مسلسل بارشوں نے بہت جلد وادی میں تباہی مچادی۔ میزبان گھرانے کے زیادہ تر مویشی ڈوب گئے اور مرغیاں کسی پراسرار بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئیں۔ دالانوں میں پانی اور کیچڑ بھر جانے کے باعث گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ اور جب گھر کی مرکزی چھت سے گارا اکھڑنے لگا تو وہ اپنے باقی ماندہ مال مویشیوں سمیت گھر کے قریب ذرا بلندی پر عارضی رہائش کے لیے تعمیر کردہ کمروں میں منتقل ہو گئے۔ خوش گوار دنوں میں اسپی نوزا صبح سے شام تک وادی کی سیر کرتا تھا۔ چٹانوں کے رنگ اور پرندوں کی بولیوں سے اُن کی نسلوں کا اندازہ کرتا تھا۔ وادی کے چند پرندوں کی خوبصورتی اور سُریلی آوازوں نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ مگر اب...... بارشوں کے موسم میں دن رات مقامی

باشندوں کے ساتھ بند رہنے سے وہ بہت جلد عاجز آ گیا تھا۔ ان سے کسی موضوع پر گفتگو نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ آپس میں بھی بہت کم بات کرتے تھے۔ اپسی نوزا اس سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دنیا میں اب تک اس قدر پس ماندہ لوگ موجود ہیں۔ انہیں اپنی تاریخ پیدائش تک کا علم نہیں تھا۔ اُسے کئی بار اپنے باپ کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ دور دراز علاقوں میں طویل العمری کے مشہور واقعات محض کمزور یادداشت یا تاریخوں کے مبہم تصور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے کاری کے ان دنوں میں اپسی نوزا نے داڑھی بڑھالی تھی اور اب آئینے کے سامنے اکثر یہ سوچ کر مسکراتا تھا کہ شہر واپس جا کر وہ اپنے دوستوں کو اس انجانے علاقے اور یہاں کے لوگوں کی کم علمی کے واقعات بڑھا چڑھا کر سنائے گا۔ اُس کے والدین اور بھائیوں کو تو ڈینیئل کے ذریعے اب تک اطلاع مل چکی ہوگی کہ وہ سیلاب کے باعث کسی دور افتادہ وادی میں وقتی طور پر محصور ہو چکا ہے۔

ایک دن اُسے کمرے کے بوسیدہ صندوق میں انجیلِ مقدس رکھی نظر آئی جو غالباً ان مبلغوں کی نشانی تھی جو کسی زمانے میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں ان وادیوں میں داخل ہوئے تھے۔ اُس نے باپ بیٹے کو کتاب کی دریافت کے بارے میں بتایا۔ مگر انہیں اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ شاید وقت گزرانے کے لیے یا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ اب تک مقامی بولی پر کتنا عبور حاصل کر چکا ہے۔ اُس نے میزبان گھرانے کو کتابِ مقدس میں درج واقعات پڑھ کر سنانے شروع کر دیے۔ اور یہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی کہ مقامی خاندان مکمل توجہ سے کہانی سننے لگا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ صرف کتاب سننے کے لیے رات کے کھانے سے جلد فارغ ہو جاتے تھے۔

ان ہی دنوں اپسی نوزا نے لڑکی کو اپنی ایک زخمی بکری کا خون بند کرنے کے لیے مکڑی کے جالے کا لیپ تیار کرتے دیکھا تو اُس نے اپنی سفری تھیلے سے دوائیں نکال کر بکری کی مرہم پٹی کر دی۔ بکری کا خون فوراً بند ہو گیا' اور میزبان گھرانا احسان مندی کے بوجھ سے اُس کے سامنے جھک گیا۔

ان کی دل چسپی سے متاثر ہو کر اب اپسی نوزا جوش و خروش سے کمرے میں ٹہل کر اُن کے لیے کتابِ مقدس پڑھتا اور ترجمہ کرتا جاتا۔ اس دوران وہ عقیدت مندی سے سر جھکائے اُس کے پیچھے چلتے تھے۔ اب وہ اس کی معمولی سے معمولی ضروریات کا خیال رکھتے اور اس کی روزمرہ کی تمام خواہشیں فوراً پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک موقعے پر اپسی نوزا نے انہیں میز سے گرے اپنی روٹی کے ٹکڑے چن کر کھاتے دیکھا۔ اور ایک مرتبہ اُس نے انہیں اپنے بارے میں سرگوشیاں

کرتے سنا۔

جب اِلپسی نوزا نے کتاب مقدس کا ایک باب ختم کر لیا اور حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کا دوسرا بیان شروع کرنے لگا تو خاندان کے سربراہ نے اس سے وہی واقعہ دوبارہ سنانے کی فرمائش کی، تاکہ وہ سب اُسے اچھی طرح ذہن نشین کرسکیں۔

"ان کی ذہنیت بچوں جیسی ہے۔" اِلپسی نوزا کو خیال آیا۔ "بچوں کو بھی پرانی کہانی کا دہرایا جانا نئی کہانی سے بہتر لگتا ہے۔"

اس رات اِلپسی نوزا کو طوفانِ نوح کا خواب دکھائی دیا اور جب وہ نوح کی کشتی کے ہچکولوں سے بیدار ہوا تو اسے بادلوں کی گرج سنائی دی۔ اُس علاقے میں آنے سے قبل وہ اتنی شدید اور مسلسل بارشوں کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رات کے کھانے پر اُسے بتایا گیا کہ طوفانی ہواؤں اور پانی کے بوجھ سے برآمدے کی چھت کو بھی نقصان پہنچا ہے اور انہیں چھت کی مرمت کے لیے نئے شہتیر تیار کرنے ہوں گے۔ افرادِ خانہ اب اُس سے اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اب تو وہ اُس کا اتنا زیادہ ادب کرنے لگے تھے کہ اُسے اُن پر رحم آتا تھا۔

اس رات طوفان کی شدت نے اِلپسی نوزا کو بہت دیر تک بیدار رکھا اور دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد ابھی اُس نے بہ مشکل آنکھیں موندی تھیں کہ تاریکی میں کسی کو اپنے بستر پر آتے محسوس کیا۔ اُس نے ہاتھوں سے ٹٹولا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ لڑکی مکمل برہنہ تھی۔ جلد ہی اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لڑکی کو اس سے قبل کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا ہے صبح کے وقت اُسے پہلا خیال یہی آیا کہ جب شہر واپس جا کر وہ اپنے دوستوں کو اس علاقے کے واقعات سنائے گا تو گزشتہ رات کا ذکر نہیں کرے گا۔

دوسرے دن کی ابتدا میں بھی حسبِ معمول گھنے بادلوں کے باعث نیم تاریکی سے ہوئی۔ "کیا عیسیٰ نے پوری دنیا کے انسانوں کو نجات دلانے کے لیے خود مرنا قبول کر لیا تھا؟" خاندان کے سربراہ نے احترام سے دہرے ہو کر اُس سے سوال کیا۔

"ہاں" اُس نے جواب دیا اور یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ وہ خود مذہب کے بارے میں کبھی بھی سنجیدہ نہیں رہا تھا مگر اب اُسے اپنی سنائی ہوئی کہانی کی تصدیق کرنی پڑ رہی ہے۔

"اور سلطنت کے سپاہیوں کو بھی...... جنھوں نے خدا کے بیٹے کی ہتھیلیوں میں کیلیں گاڑ کر اُسے مصلوب کیا...... انہیں بھی اس کی موت نے بچا لیا؟"

"ہاں" اپی نوزا نے دوبارہ کہا اور دل میں مقامی باشندوں کی سادہ لوحی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔
اُسے بار بار یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ لڑکی کنواری تھی اور اس سے کسی وقت بھی رات کے واقعے کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔
دن کے کھانے کے بعد انہوں نے اس سے کہانی کا آخری حصہ پھر سنانے کی فرمائش کی اپی نوزا نے ان کی فرمائش پوری کر دی' اور پھر دوپہر کو سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔ کچی نیند کے دوران اس کی آنکھوں میں تمام وقت عجیب منظر مچلتے رہے۔ شام کے وقت وہ بستر سے اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے یوں بولا جیسے خود کو سنانا چاہتا ہو۔ "پانی کی سطح گر رہی ہے۔ اب زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔
"اب زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔ اُسے بیک وقت تین آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ یوں گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے جیسے اُس کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ پھر ایک دم لپک کر انہوں نے اپی نوزا کو قابو کر لیا۔ اُسے حقارت آمیز لہجے سے مخاطب کیا۔ اُس کے چہرے پر تھوکا۔ اور اسے مکان کی پچھلی سمت دھکیلنے لگے۔ اُس کے سامنے بجلی سی کوندی۔ دروازہ کھلا تو بادلوں سے ڈھکا آسمان نظر آیا۔ ایک پرندہ چہچہاتا ہوا دائرہ وار اُڑنے لگا۔ "غالباً بلبل ہے" اسے خیال آیا۔
برآمدے کی چھت نہیں تھی۔ چھت کے شہتیروں ہی سے صلیب تیار کی گئی تھی۔

بورخیس

شہزادہ

میں جانتا ہوں کہ شہر والے مجھ پر تکبر کا الزام لگاتے ہیں اور انسانوں سے نفرت کرنے کا الزام لگاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ دراصل میں پاگل ہوں۔ یہ میری توہین ہے اور مناسب وقت پر میں انہیں اس کی کڑی سزا دوں گا۔ یہ درست ہے کہ میں اپنے گھر سے کبھی نہیں نکلتا' مگر انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میرے گھر کے بے شمار دروازے ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ انسان یا حیوان' جو چاہے ان دروازوں سے میرے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں اُسے کسی طرح کے درباری تکلفات یا نسوانی نزاکت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں مکمل تنہائی اور سکوت ہے۔ روئے زمین پر اس جیسا اور کوئی مکان نہیں ہے۔ (چند لوگ کہتے ہیں کہ مصر میں ایسا ہی ایک مکان ہے' مگر وہ جھوٹ بولتے ہیں) مجھے برا کہنے والے بھی مانتے ہیں کہ میرے مکان میں کوئی آرائشی چیز نہیں ہے۔ کچھ لوگ مجھ شہزادے کو اس مکان کا قیدی قرار دیتے ہیں...... یہاں مجھے یہ بات دہرانی پڑے گی کہ میرے گھر میں کوئی مقفل دروازہ نہیں ہے۔ بلکہ میرے گھر میں تو کوئی قفل ہی نہیں ہے۔ ایک شام میں گھر سے نکلا بھی تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی جس طرح مجبور و بے کس شہریوں نے منتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ اور اپنی حاجتیں بیان کی تھیں' میں اسی سے سمجھ گیا تھا کہ مجھے پہچان لیا گیا ہے کچھ لوگ سجدے میں گر گئے تھے کچھ دعائیں مانگنے لگے تھے کچھ بھاگ گئے تھے......اور کچھ نے پتھر اُٹھا لیے تھے۔ مجھے بہر حال ایک ملکہ نے جنم دیا ہے اس لیے میں چاہے جتنی بھی انکساری برتوں میری شخصیت میں کوئی چیز عام آدمیوں سے مختلف نظر آتی ہے۔

دراصل میں اپنی طرز کا واحد آدمی ہوں۔ روزمرہ کی معمولی اور بے وقعت باتوں کے لیے میرے ذہن میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے فقط سنجیدہ اور عظیم موضوعات پر غور کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ میں اپنی پیدائشی بے صبری کے سبب پڑھنا لکھنا نہیں سیکھ سکا۔ اور کبھی کبھی مجھے اس بات کی کمی محسوس ہوتی ہے...... کیونکہ میری راتیں اور دن بہت طویل ہیں۔

میری زندگی میں یکسانیت ہے، مگر بعض اوقات اس میں اچانک تبدیلی بھی رونما ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر میں سینگوں سے لڑنے والے مویشی کی طرح نادیدہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے دوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ پتھر کی کئی دیواروں سے ٹکرانے کے بعد میں چکراتے سر کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ پھر چیزوں کے انبار میں یا کسی تاریک کونے میں یوں سمٹ جاتا ہوں جیسے میرا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ گھر میں ایسے چھجے بھی ہیں جن سے کود کر میں خود کو لہولہان کر لیتا ہوں۔ میں جب چاہوں آنکھیں موند کر ایسے بھاری سانس لیتا ہوں جیسے گہری نیند میں ہوں۔ (کبھی کبھی میں واقعی سو جاتا ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو دن کا رنگ بدل چکا ہوتا ہے) لیکن وقت گزارنے کے ان تمام مشغلوں سے زیادہ مجھے اپنا وہ کھیل پسند ہے جس میں ایک اور شہزادہ میرے گھر مہمان آتا ہے۔ میں اُسے اپنا گھر دکھانے کی اداکاری کرتا ہوں۔ انکساری سے دُہرا ہو کر اُس سے نہایت مؤدبانہ لہجے میں کہتا ہوں۔ "چلیے جہاں دونوں راہداریاں ملتی ہیں وہاں دوبارہ چلتے ہیں"۔ یا "دیکھیے یہاں سے ہم دوسرے احاطے میں داخل ہوتے ہیں" یا "مجھے معلوم تھا کہ آپ کو نکاسی کا راستہ پسند آئے گا" یا "جی ہاں، یہ وہ تالاب ہے جو ریت سے بھر گیا ہے" یا "محتاط رہیے اس مقام سے آگے تہہ خانہ مختلف شاخوں میں بٹ جائے گا" گھر کی سیر کراتے ہوئے کبھی مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ہم دونوں دل کھول کر ہنستے ہیں۔

یہ فقط کھیل ہی نہیں ہے۔ میں نے درحقیقت اپنے گھر پر بہت غور کیا ہے میرے گھر کی ہر چیز اَن گنت ہے۔ بے شمار کمرے، بے شمار زینے، بے شمار راہداریاں اور دالان...... گھر تقریباً دنیا جتنا بڑا ہے یا شاید یہ خود دنیا ہے۔ بہر حال ایک مرتبہ میں ان گنت آنگن اور چار دیواریاں عبور کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں سے سمندر اور عبادت گاہ نظر آتی ہے۔ اُس دن مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ عبادت گاہیں اور سمندر بھی تعداد میں بے شمار ہیں۔ دنیا کی ہر چیز بے حد و حساب ہے۔ فقط دو چیزیں کائنات میں اکیلی ہیں۔ آسمان پر ناقابلِ فہم سورج اور زمین پر میں شہزادہ...... کبھی دھیان پڑتا ہے کہ میں نے ہی سورج اور ستارے تخلیق کیے تھے۔ اور شاید یہ وسیع و عریض گھر بھی میں نے تعمیر کیا تھا۔ مگر اب مجھے کچھ بھی واضح طور پر یاد نہیں رہا ہے۔

ایک معینہ مدت کے بعد ہمیشہ میرے گھر میں نو شخص داخل ہوتے ہیں فرش کو خون سے آلودہ کیے بغیر میں انہیں ان کے عذابوں سے نجات دلاتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہیں اور کہاں سے آتے ہیں مگر ان میں سے ایک نے مرنے سے قبل مجھے بتایا تھا کہ ایک دن میرا نجات دہندہ بھی

آئے گا۔اس دن کے بعد سے میرے لیے تنہائی برداشت کرنا آسان ہوگیا ہے۔میں جانتا ہوں کہ میرا نجات دہندہ کہیں موجود ہے اور ایک دن وہ خاک سے بلند ہوگا۔اگر دنیا کی تمام آوازیں بیک وقت میری سماعت سے ٹکرائیں' تو بھی میں اپنے نجات دہندہ کے قدموں کی آہٹ پہچان لوں گا مجھے یقین ہے کہ وہ آئے گا اور مجھے وہاں لے جائے گا جہاں کم کھڑکیاں اور کم دروازے ہوں گے...... ''میرا نجات دہندہ دیکھنے میں کیسا ہوگا؟'' میں خود سے پوچھتا ہوں۔''جانور یا انسان؟''

''ایسا جانور جس کا چہرہ انسانوں جیسا ہوتا ہے؟ یا شاید وہ بالکل میری شکل کا ہو''۔

صبح کا سورج' تلوار کی شفاف دھار سے منعکس ہو رہا تھا۔زمین میں سے خون کا آخری نشان تک مٹ چکا تھا...... ''یقین کرو'' پہلے شخص نے دوسرے سے کہا۔''شہزادہ اپنے دفاع میں کچھ نہیں بولا تھا''۔

بورخیس

چشمِ دید

عبادت گاہ کے پھیلتے سائے کی حد پر واقع اصطبل میں بھوری آنکھوں اور بھوری داڑھی والا ایک شخص انکساری سے موت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اصطبل تقریباً عبادت گاہ کے سائے میں آ چکا ہے۔ جانوروں کی مہک کے درمیان وہ شخص ایسی عاجزی سے موت تلاش کر رہا ہے جیسے دن بھر کا تھکا آدمی سر جھکا کر نیند طلب کرتا ہے۔ ابدی قوانین پر عمل پیرا دن' زوال آمادہ ہے۔ سائے طویل ہو کر اصطبل کے اندر کی چیزوں کے الجھاؤ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اصطبل کے باہر شاداب کھیت ہیں اور زرد پتوں سے اٹا ہوا گڑھا ہے۔ ایک دلدل ہے جس پر بھیڑیے کے پنجوں کے نشان ہیں۔ جہاں پنجوں کے نشان ختم ہوتے ہیں وہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے۔ بالآخر فراموش ہو کر وہ شخص سو جاتا ہے اور خواب دیکھتا ہے عبادت گاہ کی گھنٹیوں کی آواز سے اُس کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ سلطنتِ برطانیہ کی عملداری میں اب شام کی گھنٹیاں محض رسماً بجائی جاتی ہیں' لیکن اس شخص نے اپنے بچپن میں عبادت اور ریاضت کے عملی مظاہرے دیکھے ہیں۔ قربان گاہوں کا نظارہ کیا ہے جانوروں اور قیدیوں کو بھینٹ چڑھتے دیکھا ہے فجر سے پہلے یہ شخص مر جائے گا اور اس کے ساتھ اس کی یادیں بھی مر جائیں گی اس شخص کی موت سے ایک باب بند ہو جائے گا دنیا میں ایک اور چیز کم ہو جائے گی۔

کائنات کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اعمال کسی کی موت کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ کر ہمیں حیران کر دیتے ہیں۔ بہر حال اگر لوحِ محفوظ وجود نہیں رکھتی تو ہر آخری ہچکی کے ساتھ ایک چیز...... یا اَن گنت چیزیں اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ زمانے کی گردش میں ایک وہ دن بھی آیا تھا جب حضرت عیسیٰ کو دیکھنے والی آخری آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ جنگ جنین کی یاد اور ہیلن کا حُسن بھی کسی ایک فرد کی موت کے ساتھ ختم ہوا ہوگا۔

میری موت کے ساتھ کیا اختتام کو پہنچے گا؟ مجھ ناچیز کے نہ ہونے سے دنیا میں کیا کمی واقع ہوگی؟ فرڈیننڈ کی آواز معدوم ہو جائے گی؟ خالی میدان میں کھڑے سرخ گھوڑے کی یاد مٹ جائے گی؟ الماری کے نچلے دراز میں رکھا گندھک کا ٹکڑا تحلیل ہو جائے گا...... بکھر جائے گا؟

بورخیس

معدوم

اس کے پیکر میں کوئی وجود نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے چہرے کے پیچھے' مبالغہ آمیز باتوں اور گرم جوش الفاظ کی گھما گھی میں ایک سرد لہر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس خواب کے مانند تھا جسے کوئی نہیں دیکھتا۔

ابتدا میں وہ تمام لوگوں کو اپنے جیسا سمجھ کر اطمینان سے زندہ رہا۔ ایک دن اُس نے کسی آشنا سے یوں ہی اندر کے خالی پن کا ذکر کیا مگر جلد ہی وہ اپنے مخاطب کے ردِعمل پر چونک کر خاموش ہو گیا۔ اُسے احساس ہوا کہ سب انسان ایک جیسے نہیں ہیں تاہم انہیں بظاہر ایک جیسا لگنا چاہیے۔ ایک مرتبہ اُسے خیال آیا کہ ممکن ہے کتابوں میں اُس کے مرض کا علاج درج ہو۔ مطالعے کے لیے اس نے لاطینی اور یونانی زبانوں پر توجہ دی اور ایک حد تک اُن پر عبور حاصل کر لیا۔ کچھ عرصے بعد اُس کے دھیان میں آئی کہ شاید اُس کا مطلوب' روحانیت کی راہ سے حاصل ہو...... اس مقصد کے لیے اس نے جون کی طویل دوپہر ایک ہاتھ پر بیعت کر لی اور حقیقت تلاش کرنے والوں کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ بیس برس کی عمر میں اُس نے شہر کا رخ کیا۔ اب تک اُس کی فطرت بن چکی تھی کہ وہ جس سے ملتا اس پر ظاہر کرتا کہ وہ کچھ ہے تا کہ اُس کے مقابل سے پوشیدہ رہے کہ دراصل وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شہر میں اُس نے اپنی فطرت کے عین مطابق اداکاری کا پیشہ اپنا لیا۔ ناٹک میں اداکار ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایسا ہے جیسا کہ وہ نہیں ہوتا' اور تماشائی ظاہر کرتے ہیں کہ اُسے ایسا ہی سمجھا جا رہا ہے جیسا کہ وہ نہیں ہے...... ناٹک کے دوران وہ یکسوئی حاصل کر لیتا' مگر جوں ہی آخری مکالمہ ادا کر دیا جاتا اور پردہ گر جاتا' اور اسٹیج پر پڑے مردے اُٹھ بیٹھتے' اس کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر عدم وجود کا ہولناک تصور اُبھرتا۔ ایک مرتبہ پھر وہ تیمور لنگ یا کسی اور فاتح عالم کے مرتبے سے واپس اپنی حقیقت میں لوٹتا۔ اُسے علم تھا کہ وہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے اس درد ناک صورتِ حال سے بچنے کے لیے وہ ایک کے بعد دوسری عظیم شخصیت کا روپ دھارتا چلا گیا۔
یوں وہ اپنے بدن کو شہر کے مے خانوں اور چکلوں میں گھسیٹتا پھرا جبکہ اس کی روح کبھی سیزر' کبھی

میکبتھ اور کبھی جیولیٹ کا انداز اپناتی رہی۔ دنیا میں آج تک ایک فرد نے کبھی اتنے افراد کا کردار ادا نہیں کیا۔ وہ نہایت آسانی سے اپنے خول سے نکل کر نمایاں شخصیتوں اور مشہور زمانہ لوگوں میں منتقل ہو جاتا۔

''میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔'' بعض اوقات وہ اس قدر معنی خیز مکالمہ ادا کرتا مگر اسی طرح کی بات کرتے ہوئے اُسے یقین ہوتا کہ تماشائی اس جملے کے اصل مفہوم سے بے خبر رہیں گے۔

کئی برس تک وہ اسی باضابطہ طریقے سے خود کو دھوکا دیتا رہا۔ لیکن ایک صبح اُسے اچانک خیال آیا کہ وہ کتنے بادشاہوں کا روپ دھار چکا ہے۔ جن کے سر تلوار سے قلم کر دیے گئے۔ کتنے عاشقوں کے کردار ادا کر چکا ہے جو اپنی زندگیوں کے اختتام تک گریہ وزاری کرتے' ملتے بچھڑتے رہے۔ اُسی دن وہ ناٹک کی فروخت کا انتظام کر کے اپنے آبائی گاؤں واپس چلا گیا بچپن کی یادوں سے لبریز جھیلوں اور درختوں اور سرسبز راستوں پر اُسے اپنا فطری رُوپ اپنا کر بہت خوشی ہوئی۔ ''یہاں میں وہی ہوں جو میں ہوں''۔ اُسے خیال آیا۔ اب میرا تعارف کروایا جا سکتا ہے۔ ''ناٹک کا سابقہ مالک جس نے اپنے ابتدائی دور میں بے شمار دولت اور شہرت کمائی اور کاروباری زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں پر اپنی کامیاب حکمتِ عملی سے قابو پایا''۔

اُس نے آہنی ارادے کے ساتھ بسترِ مرگ پر اُسی سنجیدگی کے ساتھ وصیت لکھوائی' جس سنجیدگی اور متانت سے اُس نے زندگی گزاری تھی۔ وصیت' تصنع اور لفاظی سے پاک تھی۔ اُس میں محرومی و محتاجی کا شائبہ تک نہ تھا۔ آخری عمر میں وہ فقط شہر سے آنے والے شناساؤں سے شاعری کی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔

کتابوں میں درج ہے کہ موت سے پہلے یا بعد میں اُسے خدا سے گفتگو کا موقع ملا تو اُس نے اپنا مُدعا بیان کیا'' ...... میں جو زندگی بھر خود کو بلا وجہ اتنے کرداروں میں ڈھالتا رہا۔ اب اپنی شخصیت اور ذاتی حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہوں''۔ زمین سے ایک بگولا بلند ہوا اور خدا کی آواز آئی۔ '' ...... میری بھی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ جس طرح تمہاری نظمیں' تمہارے خوابوں سے جنم لیتی تھیں۔ اسی طرح دنیا نے میرے سپنے سے تشکیل پائی ہے اور تم میرے اس خواب کے کرداروں میں سے ایک ہو۔ میرا ایک کردار جو میری ہی طرح ہر ایک ہے اور کوئی بھی نہیں ہے''۔

بورخیس

بورخیس اور میں

تمام واقعات اُس شخص کو پیش آتے ہیں جس کا نام بورخیس ہے۔ میں بورخیس کے نام کی ڈاک وصول کرتا ہوں۔ پروفیسروں کی فہرست میں یا ادیبوں کی ڈائریکٹری میں اُس کے کوائف پر میری نظر پڑتی ہے۔ پرانی گھڑیاں' اٹھارویں صدی کی طباعت' کافی کا ذائقہ' اور اسٹیونسن' کی سلیس تحریر' میری پسندیدہ چیزیں ہیں۔ بورخیس بھی یہی چیزیں پسند کرتا ہے۔ مگر اس کی پسندیدگی میں اداکاری بھی شامل ہے۔ میرا اور بورخیس کا رشتہ تلخی یا عداوت پر مبنی نہیں ہے۔ میں زندہ ہوں اور خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ بورخیس ادب تخلیق کر سکے۔ بورخیس کی تخلیقات ہی میرے وجود کا جواز ہیں۔ بلاشبہ بورخیس چند شاہکار تحریروں کا خالق ہے۔ مگر یہ شاہکار میری نجات کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تحریریں کس کی نہیں ہوتیں۔ ان کا بورخیس سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ تحریر کی عظمت فقط زبان اور روایت کے کام آتی ہے۔ ہر چند کہ فنا میرا مقدر ہے مگر ممکن ہے کہ میرا کوئی لمحہ بورخیس میں دوام حاصل کر لے۔ میں جانتا ہوں کہ بورخیس حقیقت کو بدلتا ہے اور بیان میں مُبالغہ کرتا ہے۔ اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ ہر چیز اس کے سپرد کر رہا ہوں۔ فلسفی اسپنوزا جانتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اُسی حالت میں قائم رہنا چاہتی ہے جس حالت میں وہ قائم ہوگئی ہے۔ چٹان ابد تک چٹان' اور شیر ہمیشہ شیر رہنا چاہتا ہے۔ میں خود نہیں بلکہ بورخیس میں قائم رہوں گا (اگر یہ درست ہے کہ میں کوئی ہوں) لیکن مجھے بورخیس کی کتابوں میں خود کو پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے۔ بورخیس کی تحریروں کے مقابلے میں' وہ آواز جو کسی ساز کے تاروں کو اچانک چھیڑنے سے پیدا ہوتی ہے مجھے اپنے وجود کا زیادہ احساس دلاتی ہے۔ کئی برس قبل میں نے بورخیس سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود کو مضافات کے قصوں سے نکال کر ابدیت اور زمان و مکان کے کھیل میں اُلجھا دیا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ کھیل بھی بورخیس سے وابستہ ہوگیا ہے اور اب میں اپنے لیے نئے مشاغل تلاش کر رہا ہوں۔ میری پوری زندگی ایک مسلسل فرار بن گئی ہے۔ اور میری تمام ذاتی چیزوں پر فراموشی نے یا بورخیس نے قبضہ کر لیا ہے۔

میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس صفحے پر بورخیس نے کچھ تحریر کیا ہے یا یہ میری تخلیق ہے؟
''گو مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں سیدھی سادی کہانیاں کہنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اپنی بات قاری تک ہمیشہ سلیس انداز میں پہنچانی چاہی ہے۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میری کہانیاں یک سطحی ہیں۔روئے زمین پر کوئی صفحہ یا کوئی لفظ ایسا نہیں پایا جاتا جو تہہ در تہہ نہ ہو۔دنیا کی معمولی سے معمولی چیز کائنات کا حصہ ہے اور کائنات کی پہلی خصوصیت ''پیچیدگی'' ہے ...... میرے لیے کہانی کی تخلیق ایجاد سے زیادہ دریافت کا عمل ہے۔رستہ چلتے ہوئے لائبریری کے زینوں پر میں اچانک خود کو کسی چیز کی گرفت میں آتے محسوس کرتا ہوں۔یہ ''چیز'' کوئی نظم یا کہانی ہوتی ہے۔میں خود کو اُس کے سپرد کر کے فاصلے پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔خاموشی سے اُسے اپنا کام کرتے دیکھتا ہوں۔جلد ہی وہ ابتدا اور انتہا کی سمت سے واضح ہونے لگتی ہے۔ بیچ کا حصہ کچھ دیر تک موہوم رہتا ہے۔ میں انتظار کرتا ہوں۔آہستہ آہستہ درمیان کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے۔اگر کبھی یوں ہو کہ نادیدہ طاقتیں کہانی کی دریافت کو اس مقام پر روک لیں تو میں شعوری کوشش پر مجبور ہو جاتا ہوں یہ ''باہوش مداخلت'' میری کمزور ترین تخلیقات کو جنم دیتی ہے''
یہ کسی معمولی ادیب کا باطنی احوال نہیں ہو سکتا۔اسی سطح سے کوئی بورخیس کوئی سارتر کوئی کافکا ہی کلام کر سکتا ہے۔ مقام کی بلندی اور بیان کی گہرائی کا نایاب امتزاج حاصل کر لینے والا بورخیس عالمی ادب کا تازہ ترین معمہ ہے کافکا کے بعد بورخیس واحد ادیب ہے جس کی نثری تخلیقات کا ترجمہ کرتے ہوئے شاعری کے ترجمے جیسی دشواریاں پیش آتی ہیں کوئی ایک لفظ بھی اپنے مکمل مفہوم کے ساتھ اُجاگر ہونے سے رہ جائے تو سابقہ ولاحقہ لذت بھی بے کار ہو جاتی ہے۔فلسفیوں کے کہنے کے مطابق تمام فنون اپنی انتہا پر پہنچ کر موسیقی کے مانند سو فی صد تاثراتی ہو جاتے ہیں۔اگر یہ درست ہے تو بورخیس کی تحریر انتہا کی تحریر تھی۔اُس کی کہانیاں راگوں کی طرح لفظوں کے الاپ سے شروع ہوتی ہیں۔اور ایک مخصوص فضا تخلیق کرنے کے بعد اسی فضا میں ڈوب کر روشنیوں اور تاریکی کی آمیزش و آویزش سے ان گنت جہانوں کو ترتیب دیتی اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہیں۔سفر کے اختتام پر راستے میں آنے والے مقامات کی معنی خیزی کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔یہ تخلیق کا آخری درجہ ہے۔یہاں تک فقط الہام کے سہارے پہنچا جا سکتا ہے۔

بورخیس کا مطالعہ سمندر کی طرح وسیع تھا۔ وہ دنیا بھر کی مذہبی تعلیمات اور شاعری اور افسانوں اور فلسفوں کو ذہن میں سمیٹے اپنے شہر (بیونس آئرس) کی گلیوں میں فقیرانہ گھومتا تھا اور قدم قدم پر حیات وکائنات کی تہہ داریوں سے اُلجھتا جاتا تھا۔

عثمان الجہیز کا کہنا تھا کہ معدنیات نباتات' اور نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے اشرف المخلوقات تک مسلسل ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ مولانا رومی' عثمان الجہیز سے اتفاق کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ دوسرے مرحلے میں انسان ایک قدم بڑھا کر فرشتہ اور مزید ایک قدم میں خدا ہو جائے گا۔ معلوم نہیں پیرِ رومی کی بات کہاں تک درست ہے مگر بورخیس کی آفاقیت اور ماورائیت بعض اوقات عالمِ ملکوت ہی کا عطیہ محسوس ہوتی ہیں ۔ کہیں کہیں تو اس کی نہایت سادہ سی کوئی بات' زندگی کا ایک مکمل نیا پہلو اجاگر کر دیتی ہے۔

"جو شکسپیئر کا جملہ دہرا رہا ہے' ولیم شیکسپیئر ہے"

اور کہیں اُس کے بیان کا شعری انداز و ایجاز اُسے ترجمے سے ماورا کر دیتا ہے۔

Friendship is no less a mystery than love of any other aspect of this confusion we call life.

بورخیس کو ہسپانوی زبان سے انگریزی میں منتقل کرنے والوں نے بھی دشوار گزار وادی کا سفر کیا ہے۔ مگر فرنگی زبانوں کی مماثلت اُن کا کام کسی حد تک آسان بنا دیتی ہے۔ جبکہ اردو' فارسی اور عربی کا لبادہ قطعی مختلف ہے۔ اس راستے میں وہی متلاطم دریا آتا ہے جو اردو/ فارسی کی کسی شاہکار غزل کے انگریزی ترجمے میں حائل ہوتا ہے۔

بورخیس کو انگریزی' ہسپانوی' فرنچ اور جرمن زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اُس نے پر آشوب حالات میں زندگی گزاری تھی۔ اور فانی دنیا کے تماشوں کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ طویل اور شدید بیماریوں نے اُس پر موت اور زیست کے وہ اسرار منکشف کر دیے تھے جن کے بغیر ادیب کے جملوں میں نور نہیں اُترتا۔ بورخیس اُس انکشاف سے مالا مال تھا جس سے محرومی "اوسط ادیبوں" کی کوتاہی اور مردہ ذوقی کا سبب بنتی ہے۔

بورخیس کی ابتدائی زندگی میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ شہر کے مضافات میں چہل قدمی کے دوران مختصر نظموں کی تخلیق میں مصروف یہ گمنام شاعر ایک دن دنیا بھر کے ادیبوں پر اثر انداز ہوگا۔ آج روئے

زمین پر کہیں کوئی قابلِ ذکر افسانہ نگار ایسا نہیں ہے۔ جس کی تحریروں میں کافکا اور بورخیس کی اسلوبی ادائیں، کبھی نیم لباسی اور کبھی عریاں حالت میں ظاہر نہ ہوں۔ کافکا کی طرح بورخیس کا مطالعہ بھی آبشار تلے نہانے جیسا ہے۔ کہ بعد میں بھی دیر تک بدن میں کہیں بوندوں کی جھنکار محسوس ہوتی رہتی ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ طویل عمر (۸۷ سال) کو پہنچنے والے بورخیس کی تخلیقات میں قریباً چالیس برس کی عمر تک عہد سازی کی جھلک تک نہیں تھی۔ وہ اُن بے شمار ادیبوں جیسا ایک ادیب تھا جو دنیا کے ہر شہر میں کسی مخصوص ریستوران میں جمع ہوتے ہیں اور زندگی بھر کی ادبی بادیہ پیمائی کے بعد اپنے ملک کے حلقۂ دانشوراں میں معروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ادھیڑ عمری میں بورخیس کے سر پر لگنے والی چوٹ بہت شدید تھی۔ یہ نیم روحانی آزار نہ تھا جسے نابالغ شاعر سر کا تاج بنا لیتے ہیں۔ روحانی اذیت سے بہت مختلف ہونے کے باوجود جسمانی درد کی انتہا بھی بالآخر باطنی دنیا کے دروازے کھولتی ہے۔ سر کی ضرب نے بورخیس کی قوتِ گویائی کو سلب اور خون کو زہر آلود کر دیا۔ اور جب سخت جدوجہد کے بعد وہ موت کی گرفت سے نکلا تو دنیا نے اسے ایک مختلف بورخیس پایا۔ وہ اپنے وجود و عدم کے حوالے سے کائنات کی موجودگی اور لاشیت تک پہنچ گیا تھا۔ نرم رو اور شاعرانہ مزاج میں فلسفے اور دیوانگی کے سائے پھیل چکے تھے۔ یہاں سے وہ زمان و مکان کے لاینحل مسائل کو ساتھ لیے ذات کے سفر پر روانہ ہوا۔ یہ کسی بھی تخلیق کار کی اعلیٰ ترین صورت حال ہے۔ بورخیس کے اس دور کی تحریروں میں وہی خاصیت ہے جو دنیا کی تمام عظیم کتابوں سے منسوب ہے۔ (سیدھے سادے قصے میں اچانک اتنی گہرائی کہ چند لمحوں کے لیے پوری دنیا نگاہوں سے اُوجھل ہو جائے)

بورخیس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا قاری دنیا بھر کے دیگر سنجیدہ ادب کا مطالعہ کر چکا ہو اور اُسے اتفاقاتِ زمانہ اور زندگی کے تاریک رُخ سے بھی وافر حصہ مل چکا ہو۔ پختہ خیال اور تجربہ کار شخص کو اُس کے افسانوں کے کئی مناظر بہت دور لے جاتے ہیں۔

آسودہ حال ممالک کے نقاد ہوں یا ہماری طرف کی روحانی بالغ نظری سے بھری ہستیاں، ادب کی نئی جہت سب سے پہلے فقط ادیب ہی پہچان پاتے ہیں اور یہ بات ہے کہ بعد میں نقاد بھی اُسے عہد ساز قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں نئے مقامات دریافت کرتے ہیں۔ مستقبل میں بھی بورخیس کے اصل قاری ادیب ہی ہوں گے...... بورخیس کو ادب کے نوبل

انعام کا مستحق نہیں جانا گیا۔ یہ تعجب خیز بات نہیں کیونکہ اس کی کتابیں' ان کی کتابوں جیسی کبھی نہ ہو سکیں جو بہت تیز روشنیوں والی جگہوں پر بین الاقوامی ہنگامہ خیزی کے درمیان بجی ہوتی ہیں۔

لاطینی امریکن ادب کی نمایاں ترین شخصیت' علم و دانش سے چھلکتا وجود' بے حد سادہ دل' ملنسار اور قناعت پسند بورخیس آیندہ بھی فقط ادب کی گہرائی میں اُترنے والوں کو دکھائی دے گا...... مگر ہمیشہ دکھائی دے گا۔

جیمز جوائس

آئلین

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی شام کی تاریکی کو شہر کی گلیوں میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔اس کا سر کھڑکی کے گرد آلود پردے سے لگا تھا اور اس کی ناک، دھول کا بوجھل پن محسوس کر رہی تھی۔وہ تھک چکی تھی۔

وہ گلیاں سنسان تھیں کچھ دیر پہلے سامنے سے ایک اجنبی گزرا تھا۔جب وہ سڑک پر چلتا تو اس کے جوتے آہٹ پیدا کرتے اور جب وہ کچے راستے پر اترتا تو یکلخت خاموشی چھا جاتی۔جہاں اب سڑک اور مکانات تھے وہاں پہلے ایک میدان تھا۔شام کے وقت اس میدان میں محلے کے بچے کھیلتے تھے۔دن ڈھلے تمام گھروں کے بچے وہاں جمع ہو جاتے ہیں جارج اور اس کی چھوٹی بہنیں، استانی جی کے بچے لوسی اور اس کا معذور بھائی جسے دوسرے بچے اپنی چیزوں کی نگرانی سونپ دیتے تھے، گلابی رنگت والا سوئی جو مذاق میں ''مس سوئٹی'' کہلاتا تھا اور توتلی کیتھرین جو بولتے میں منہ سے جھاگ اُڑاتی تھی۔کسی دن کھیلنے میں دیر ہو جاتی تو پاپا ان کا پیچھا کرتے میدان تک آجاتے۔اندھیرا چھانے کے باوجود گھر نہ لوٹنے پر ان کو ڈانٹتے۔پاپا کو آتے دیکھ کر وہ سر جھکائے گھروں کی جانب بھاگنا شروع کر دیتے۔بعد میں اس میدان میں سرخ اینٹوں اور چمکدار چھتوں والے مکانات تعمیر ہو گئے۔

اس زمانے میں سب خوش رہا کرتے تھے۔پاپا اس وقت اتنے سخت مزاج نہیں تھے اور پھر امی بھی زندہ تھیں۔اب ان باتوں کو زمانہ گزر چکا تھا۔وہ بڑی ہو چکی تھی۔اس کے بھائی بڑے ہو چکے تھے امی کو فوت ہوئے کئی برس گزر گئے تھے۔اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہو چکے تھے۔ہر چیز بدل جاتی ہے اب وہ بھی جا رہی تھی۔گھر چھوڑ رہی تھی۔

گھر! اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں اور کمرے کی چیزوں کو حسرت سے دیکھا وہ ان چیزوں کو جھاڑتے پونچھتے جوان ہوئی تھی۔صفائی کرتے ہوئے وہ اکثر سوچتی تھی کہ روزانہ اتنی دھول کہاں سے آتی ہے؟ شاید اب وہ ان چیزوں کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائے۔میز، کرسیاں، تپائیاں

اور نوا ہوا ساز جس کے عین اوپر اس عالم دین کی تصویر ٹنگی تھی جس کا نام اسے آج تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

''آج کل ان کا قیام فارلینڈ میں ہے''۔ اس کا باپ مہمانوں کو یہ تصویر دکھاتے ہوئے ہمیشہ یہی الفاظ دہراتا تھا۔

اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں سے دور چلے جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔ ہر چند کہ گھر میں اسے کئی سہولتیں حاصل تھیں لیکن اس کے باوجود...... وہ چلی جائے گی۔ وہ کیوں نہ جائے یوں ہی کڑھتے رہنا کیا اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے کام کرو اور زندہ رہو۔ زندہ رہو اور کام کرو۔ کیوں؟ خاندان کو سنبھالنا صرف ایک فرد کی ذمہ داری تو نہیں ہوتی۔ کوئی کچھ بھی کہے وہ چلی جائے گی۔

مسز وائٹ کہیں گی ''دیکھا؟ چلی گئی نا! میں جانتی تھی۔ وہ ٹکنے والی نہیں ہے'' لیکن مسز وائٹ کے کچھ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کسی کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس کے نئے گھر میں حالات بہت مختلف ہوں گے۔ وہ ملک اپنی روشن راتوں اور بارونق شاہراہوں کے لیے مشہور ہے۔ وہاں وہ شادی شدہ زندگی گزارے گی...... وہ آئیلین' ایک معزز خاتون...... لوگ اس کی عزت کریں گے۔ کوئی خود کو محض خاندان کی خدمت کے لیے کیسے وقف کر دے؟ اس کی ماں کو عمر بھر کی قربانی کا کیا صلہ ملا تھا؟ اب وہ خود چھپیس سال کی ہو چکی تھی۔ مگر اب بھی اس کا باپ جب چاہے اُسے ڈانٹ دیتا تھا۔ مہمانوں کے سامنے شور کرتا تھا۔ اُسے اُجڈ اور پھوہڑ کہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا دل اچانک زور زور سے کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں پسینے سے کیوں بھیگ جاتے ہیں۔ اسے اس کے باپ نے اس حال تک پہنچایا تھا۔ اس کی ماں نے بھی انتہائی ابتری کے عالم میں زندگی گزاری تھی اور اب وہ بھی...... وہ آئیلین۔ پاپا کو وہ بچپن ہی سے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کے دونوں بھائیوں سے انہیں کسی حد تک لگاؤ تھا مگر اس کی تو وہ صورت سے چڑتے تھے۔ اب بھی وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انہیں اس کی مرحومہ ماں کا خیال نہ ہو تو وہ اس کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھنا بھی گوارا نہ کریں۔ اس کے دونوں بھائی بھی گھر چھوڑ چکے تھے۔ بڑا تو دل کے پیدائشی نقص کے باعث دنیا ہی چھوڑ گیا تھا اور چھوٹا کسی غیر ملک میں عمارتوں کی اندرونی آرائش کا کام کر رہا تھا۔

مالی مسائل ان تمام پریشانیوں سے بڑھ کر تھے۔ اس کا بھائی ہر ماہ ایک معقول رقم بھجواتا تھا مگر منی

آرڈر پاپا وصول کرتے تھے اور پاپا سے کوئی پیسے طلب کرتا تو وہ بدکلامی پر اُتر آتے۔ خاص طور پر اسے گھر کا خرچ دینے سے وہ قطعی منکر ہو جاتے۔

''تمہاری کھوپڑی میں تو دماغ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں'' وہ کہتے ''ذہین لوگ پیسہ کماتے ہیں اور ذہین لوگ ہی اسے خرچ کرنا بھی جانتے ہیں۔ احمقوں کو خون پسینے کی کمائی سے دور رکھنا چاہیے''۔

تھوڑا بہت وہ خود بھی کماتی تھی۔ امیر گھرانے کے دو بچے اس کی نگہداشت میں تھے۔ بہلانے اور سلانے سے لے کر اسکول بھیجنے تک وہ ان کے ہر کام کی ذمہ دار تھی۔ مگر اس کام سے جو آمدنی ہوتی وہ گھر کا خرچ چلانے میں صرف ہو جاتی۔ کھانے میں اگر گوشت یا سبزی کی کمی رہ جاتی تو پاپا آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے وہ گھر کو قائم رکھے ہوئے تھی اور گھر قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ اب جبکہ وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی اسے گھر سے اپنائیت بھی محسوس ہو رہی تھی...... لیکن بہر حال وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

اسے فرینک کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ فرینک 'فراخ دل اور ہنس مکھ لڑکا۔ اسے دیکھ کر زندگی کے مثبت پہلوؤں کا خیال آتا تھا روشنی' محبت' قہقہے اور خوش دلی کی محفلیں۔ فرینک بحری جہاز پر کام کرتا تھا اور دور دراز شہروں کے قصے اس کی نوکِ زبان پر رہتے تھے۔ وہ دنیا بھر کے ملکوں اور شہروں کی سیر کر چکا تھا۔ اب اس کا سمندر پار گھر بسانے کا ارادہ تھا۔ گزشتہ چند برسوں سے جب بھی فرینک کا جہاز بندرگاہ پر لگتا تو وہ ضرور اس سے ملاقات کرنے شہر آتا۔ پہلی مرتبہ اس نے فرینک کو ان بچوں کے گھر دیکھا تھا جن کی نگہداشت پر وہ مامور تھی۔ فرینک تمام گھر والوں کو اس جزیرے کے قصے سنا رہا تھا جہاں آدم خور بستے تھے۔ اُس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کے باوجود سب حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اس دن کے بعد وہ ایک دوسرے کو گھر سے باہر ملنے لگے تھے۔ لیکن ایک دن پاپا نے انہیں تفریح گاہ میں گھومتے دیکھ لیا۔

''میں ان جہاز رانوں کی عادتوں سے خوف واقف ہوں'' پاپا نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آئندہ میں تمہیں اس کے ساتھ نہ دیکھوں''۔

بعد میں ان دونوں نے اس بدلی ہوئی صورتِ حال کا تجزیہ کیا تھا اور نہایت دانشمندی سے یہ پس ماندہ شہر اور اس کا گھٹا ہوا ماحول چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ اس کی گود میں پڑے دونوں لفافے دھندلا گئے تھے۔ ایک خط اس کے بھائی کے نام تھا۔ دوسرے خط میں اس نے پاپا کو سب کچھ صاف صاف بتانے کی کوشش کی تھی۔ پاپا کچھ

عرصے سے تیزی سے بوڑھے ہو رہے تھے۔ ممکن ہے وہ اُسے یاد کریں جب سے ان کا سر جھکنے لگا تھا۔ ان کے لہجے کی سختی میں بھی کچھ کمی آ گئی تھی۔ گزشتہ دنوں وہ بیمار ہوئی تھی تو اپنی عادت کے برعکس انہوں نے ایک حد تک اس کی تیمارداری بھی کی تھی۔ انہیں اظہارِ ہمدردی کرتے دیکھ کر اسے بچپن کا وہ دن یاد آ گیا تھا جب وہ سب چھٹی کا دن گزارنے دریا کے کنارے گئے تھے۔ اس دن پاپا نے بچوں کو ہنسانے کے لیے آوازیں بدل بدل کر لطیفے سنائے تھے اور مزاحیہ انداز میں رقص بھی کیا تھا۔

اس کی روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا لیکن وہ اسی طرح گرد آلود پردے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ تاریکی چھانے کے باعث اب اسے دھول کے ذرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ دور کوئی بانسری پر لوک دھن بجا رہا تھا۔ جس روز اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا اس روز بھی کوئی بانسری پر لوک دھن بجاتا ان کے دروازے پر آیا تھا۔ گرد و نواح کے دیہات سے اکثر ایسے فن کار آتے تھے جو عوامی سازوں کی سنگت میں بھیک مانگتے تھے۔ اس دن وہ سب ماں کی بیماری کے سبب بانسری کی آواز سے پریشان ہو گئے تھے۔ پاپا نے دروازہ کھول کر موسیقار کو ڈانٹا تھا۔

"گنوار دیہاتیو بھاگ جاؤ ورنہ تمہارے ساز توڑ دوں گا"

مگر آج بانسری کی آواز اسے بہت اُداس کر رہی تھی۔ اسے ماں سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ وہ ہر حالت میں گھر کو بکھرنے سے بچائے گی...... وہ آئیلین...... اُسے ماں کی بے لوث زندگی اور اس کے انجام کا بھی خیال آیا۔ گھر والوں کے لیے اس کا ایثار اور ذاتی خوشیوں کی قربانی جو بالآخر پاگل پن پر ختم ہوئی۔ مرتے وقت ماں ایسے بے ربط جملے بولنے لگی تھی جو ایک مدت تک انہیں یاد آتے اور اداس کرتے رہے تھے۔

آئیلین گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نجات...... اسے ہر حالت میں اس ماحول سے نجات حاصل کرنی ہے۔ فرینک اسے بچا لے گا۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ خوش رہنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ سب خوش رہتے ہیں۔ وہ کیوں خوش نہ رہے؟؟ فرینک اسے خوشی دے گا۔

(۲)

ہنگامہ خیز ہجوم کے وسط میں اس کا وجود قطعی غیر نمایاں تھا۔ فرینک نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے بحری سفر میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مسلسل کچھ بتا رہا تھا۔ بندرگاہ پر خاکی رنگ کے بکسوں اور بستروں والے فوجی سپاہیوں کا جمگھٹا تھا۔ وقفے وقفے سے اسے ہجوم کے

درمیان پہاڑ جیسے جہاز کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرینک کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اسے اپنے اندر کوئی قدیم اور مضبوط چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خدا سے دعا کی وہ اسے ہمت دے اور سیدھا راستہ دکھائے۔ دعا مانگنے کے بعد بھی اس کے ہونٹ بہت دیر تک لرزتے رہے۔ اچانک فضا جہاز کی سیٹی سے گونج اٹھی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''آؤ'' فرینک نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

اس کے ہاتھ پاؤں سرد پسینے سے بھیگ گئے۔ سامنے سمندر تھا۔ فرینک اسے گہرے پانیوں میں لے جا رہا تھا۔ وہ اسے ڈبو دے گا۔

''آؤ!'' اس بار فرینک چیخ پڑا۔

''نہیں'' اس نے دوسرے ہاتھ سے لوہے کا جنگلا تھام لیا ''یہ ناممکن ہے''۔

''آئلین! آئلین''

''نہیں!'' سلاخ پر گرفت کی سختی سے اس کی انگلیوں کے جوڑ زرد پڑنے لگے تھے۔ فرینک اس کا ہاتھ چھوڑ کر جہاز کی سمت بھاگا مگر آخری کوشش کے طور پر دوبارہ اس کے نزدیک آ گیا۔ کسی نے جہاز پر سے فرینک کو ڈانٹا مگر وہ بچوں کی طرح اس کی منتیں کرنے لگا۔ آئلین خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ یکلخت فرینک چونک گیا۔ آئلین کا چہرہ کسی مویشی کی طرح جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ کوئی الوداعی کیفیت تھی۔ نہ کوئی وابستگی تھی۔ نہ ہی کوئی پہچان تھی۔

ادیب کی عظمت کا محل اُس کی زبان کی طاقت اور بیان کی صلاحیت سے تعمیر ہوتا ہے اور اس کے خیالات کی گہرائی محل کی اندرونی آرائش کے کام آتی ہے ادب کے شہر میں جیمز جوائس کا محل بہت دور سے نظر آتا ہے' مگر باریک بین سیاح محل کی سیر کے بعد اس کے اندرون سے غیر مطمئن نکلتے ہیں۔ انگریزی زبان کی حدود میں جیمز جوائس اپنے شرعی معجزوں سے خدائے سخن کے درجے کو پہنچا۔ لیکن میر تقی میر اور حافظ شیرازی کی طرح جوائس بھی اپنی زبان کے دائرے سے باہر آتے ہی کسی جلاوطن حکمران کی طرح بالکل بے طاقت ہو جاتا ہے میر کے بسیار بلند شعر کا اصل سامع فقط وہ خوش نصیب ہو سکتا ہے جو اردو زبان کا تقریباً پیدائشی ذائقہ رکھتا ہو اسی طرح جوائس کی تحریریں انگریزی کی تہ داریوں سے بوجھل ہیں۔ میر تقی میر کی طرح جیمز جوائس بھی ترجمے میں دم توڑ دیتا ہے۔ یہ کمزوری ہے۔ اپنا نظریہ حیات نہ رکھنے کی کمزوری۔ فارسی کے نکتہ داں صدیوں تک حافظ کے بعد کسی دوسرے شاعر کا نام لینا بھی بدذوقی کی علامت سمجھتے رہے۔ مگر دنیا بھر میں شاعری کے مداح اب ایران کو محض عمر خیام کے حوالے سے جانتے ہیں۔ عمر خیام:

''قنوطیت کا شکار تھا''

''فرار کا درس دیتا تھا''

''منفی خیالات کا حامل تھا''

لیکن اس نے بہر حال زندگی کا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا اور آخری تجزیے میں ثابت ہونے والے اپنے مفروضے کو وہ زندگی بھر بار بار نئے طریقے سے بیان کرتا رہا۔ یوں وہ شاعری کی خالص جمالیاتی لذت میں زیست کرنے کا ایک ذاتی رنگ شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جیمز جوائس حیات و کائنات کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟

وہ ستارے کی سی لاتعلق آنکھ سے دنیا کو محض دیکھنا اور دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی کوئی رائے نہیں ہے جوائس کی طرز کے ادیب مربوط بات نہیں کرتے' البتہ کلام پر مضبوط گرفت کے سبب زبان و بیان کے شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ شکسپیئر کے بعد جیمز جوائس انگریزی کا سب سے بڑا استاد ہے۔

ہر چند کہ جوائس کے ناول ''ULYSSES'' کا آخری حصہ شعور کی رو کی ٹیکنیک کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ تاہم اس کے افسانوں کی واحد کتاب بحیثیتِ مجموعی اس کے تمام ناولوں سے زیادہ پُر مغز ہے۔ ''ایولین'' گھریلو لڑکی کے احساسات کا ایسا مشاہدہ اور مطالعہ ہے کہ کبھی کبھی یہ افسانہ جیمس جوائس کے فلک بوس' مگر ویران ادبی محل کا تنہا فانوس دکھائی دیتا ہے۔

سلویا پلاتھ

خوابوں کی انجیل

روزانہ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک میں اپنی نشست پر بیٹھی دوسروں کے خواب ٹائپ کرتی رہتی ہوں۔ مجھے اسی لیے ملازم رکھا گیا ہے۔ میرے افسروں کا حکم ہے کہ میں تمام چیزیں ٹائپ کروں۔ خواب' شکایات ماں سے اختلاف' بوتل اور بستر کے مسائل' باپ سے جھگڑا' سردرد' جو اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ ہمارے دفتر میں صرف وہی لوگ آتے ہیں۔ جن کے گھروں میں عذاب بھر چکے ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کہ چوہا اپنے جسمانی زاویہ نگاہ کے سبب بہت جلد سمجھ جاتا ہو کہ دور سے آتے دکھائی دینے والے دو بڑے پاؤں کائنات کا نظام کس طرح چلاتے ہیں۔ لیکن جہاں سے میں دنیا کو دیکھتی ہوں۔ وہاں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے نگہبان کا نام "سراسمیہ" ہے۔

سراسمیہ کی بھی شکل ہو سکتی ہے۔ کتا' طوائف' چڑیل' شیطان...... سوجائے یا جاگتا رہے۔ وہ سراسمیہ ہی رہتا ہے۔

جب لوگ سوال کرتے ہیں کہ میں کہاں کام کرتی ہوں تو میں انہیں بتاتی ہوں کہ میرا کام شہر کے اسپتال کے ایک شعبے کا ریکارڈ درست رکھنا ہے عام طور پر یہ جواب کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اس طرح کی بات نہیں پوچھتا جس کے جواب میں مجھے بتانا پڑے کہ میں پہلے سے موجود ریکارڈ کی نگہداشت کے علاوہ نیا ریکارڈ ٹائپ بھی کرتی ہوں دراصل نیا ریکارڈ ٹائپ کرنا ہی میرا پیشہ ہے اور میں اپنے پیشے سے مقدس انداز میں وابستہ ہوں اس لیے کہ میری تحویل میں خوابوں کے ڈھیر ہیں اور میں کسی کو یہ نہیں بتا سکتی۔ نہیں بتا سکتی کہ میں اپنے گھر کے کمرے میں ہسپتال کے قوانین کی پابند نہیں ہوں۔ یہاں میں فقط سراسمیہ کے احکام پر عمل کرتی ہوں جو مجھے خواب جمع کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

خواب در خواب میں بالغ ہو رہی ہوں اور اسی رفتار سے خوابوں سے میری شناسائی میں

اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک دن میں دنیا کی سب سے بڑی خواب آشنا بن جاؤں گی لیکن خواب شناسی کی انتہا پر پہنچ کر بھی میں لوگوں کے خواب روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ خوابوں کا ناجائز استعمال نہیں کروں گی۔ یہاں تک کہ میں خوابوں کی تعبیر بتانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں تو صرف خواب جمع کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں پہچاننا چاہتی ہوں۔ ان سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔ میں سراسمیہ کی کارکن ہوں' اور خواب جمع کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ٹائپ شدہ خواب اتنی مرتبہ پڑھتی ہوں کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ پھر میں گھر جا کر اُنھیں سراسمیہ کی مقدس کتاب میں درج کر دیتی ہوں۔

کبھی کبھی میں رات کے وقت اپنے گھر کی چھت پر چلی جاتی ہوں۔ وہاں سے نیند بھرے شہر کو دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ چھت پر ٹہلتے ہوئے میں وائلن کے تار کی طرح ہمہ وقت لرزنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ صبح کے آثار نمودار ہونے پر تھکن سے چور اپنے بستر پر آتی ہوں اور کسی بخار زدہ شخص کی طرح سو جاتی ہوں۔ شہر میں موجود انسانی سروں کا شمار' اور پھر ان سروں میں آنے والے مجموعی خوابوں کا حساب مجھے بے انتہا تھکا دیتا ہے۔

دوسرے دن مجھے وہی خواب ٹائپ کرنے ہوتے ہیں جنہیں میں رات اپنی چھت سے محسوس کر چکی ہوں۔ یقیناً شہر بھر کے خواب لامحدود ہیں' اور میں شام تک فقط اُن کا ایک معمولی حصہ ٹائپ کر سکتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میرے دفتر میں فائلوں کا انبار بڑھتا جا رہا ہے۔ اور بہت جلد وہ دن آنے والا ہے' جب دفتر میں سوائے خوابوں کی فائلوں کے کوئی دوسری چیز رکھنے کی جگہ نہیں بچے گی۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ میں لوگوں کو اُن کے خوابوں کے حوالے سے پہچاننے لگتی ہوں۔ بہت سے مریض ایسے ہوتے ہیں کہ میں اُن کے نام بھول جاتی ہوں۔ لیکن اُن کے خواب یاد رہتے ہیں۔ مثلاً یہ آدمی جو ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے خواب میں خود کو کسی مشین کے گھومتے پہیوں میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ اس خواب میں اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی کچھ دیر تک چیختا رہتا ہے۔ اس طرح کے اور لوگ بھی ہیں جو خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ کسی مشین تلے روندے جا رہے ہیں یا کوئی ایجاد انہیں نگل رہی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جب مشینیں نہیں تھیں اس وقت لوگ کس طرح کے خوابوں

سے ڈرتے ہوں گے؟
میرا اپنا بھی ایک خواب ہے۔ اس خواب میں ایک بہت بڑی جھیل نظر آتی ہے۔ اتنی بڑی کہ اُس کے کنارے ہیلی کاپٹر کے شیشے والے پیٹ سے بھی نظر نہیں آتے۔ جہاں سے میں اس کی تہ میں جھانکتی ہوں۔ جھیل کا پانی خوف ناک بلاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ ایسی بلائیں جو قدیم زمانے میں زمین کی سطح پر گھومتی تھیں۔ وہ زمانہ جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ ابھی اُس نے آگ نہیں جلائی تھی۔ فصل نہیں اگائی تھی۔ اس خواب میں سورج چاند ستارے اور زمین آسمان کے درمیان پائی جانے والی دیگر تمام چیزوں کی شکلیں اور خصوصیات بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اچانک جھیل کی سطح برف سے ڈھک جاتی ہے اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں جاگ جاتی ہوں۔ اس خواب سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک کسی بھی خواب میں معنی تلاش کرنا لاحاصل لگتا ہے۔
یہی وہ جھیل ہے جہاں رات کے وقت شہر بھر کے خوب بہتے ہوئے آتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر تمام دماغوں کا گرد وغبار بیٹھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جھیل شہر کے مضافات میں پائے جانے والے پینے کے شفاف پانی کے اُن ذخیروں جیسی نہیں ہو سکتی، جن کی دن رات یوں حفاظت کی جاتی ہے۔ جیسے وہ خاردار تاروں کے درمیان رکھے انمول ہیرے ہوں۔ یہ ایک مختلف جھیل ہے۔ صدیوں کے جمع شدہ گلتے سڑتے خوابوں سے اس جھیل کا پانی مٹیالا اور بدبودار ہو گیا ہے اور اس کی سطح سے ہر وقت دھواں اٹھتا رہتا ہے۔
ایک سر میں رات بھر میں کتنے خواب آتے ہیں؟ اور شہر میں سروں کی مجموعی تعداد کیا ہے؟ اور دنیا میں اس طرح کے کتنے شہر پائے جاتے ہیں؟ اور زمین پر کتنی راتیں گزر چکی ہیں؟؟ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ریاضی میں تیز ہوتے ہیں اور بڑے بڑے اعداد کا لمحوں میں حساب لگا لیتے ہیں میں تو صرف اس ایک شہر میں رات بھر میں دیکھے جانے والے خوابوں کا شمار کرتی ہوں تو میرا سر چکرا جاتا ہے۔
یہ عجیب جھیل ہے۔ اس میں پیار کرنے والوں کے چہرے اور پھولی ہوئی لاشیں اور یادیں اور دھند اور دھواں اور پرزے اور سائنسی ایجادات اور نفع اور نقصان ایک دوسرے سے لپٹے تیرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے اس میں مردہ پیدا ہونے والے بچے بھی نظر آتے ہیں۔ مردہ پیدا ہونے والے بچے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ جھیل کی دوسری سمت بیٹھے عظیم تخلیق کار کے

ناممکل پیغامات ہوں۔
اس جھیل کو کوئی بھی نام دے لو۔ دنیا کے تمام افراد ایک برادری کی صورت میں صرف یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک انبوہ ایک ڈھیر ایک ناقابلِ فہم انبار جو سوتے میں بالکل ایک چیز کا بنا لگتا ہے لیکن جوں ہی جاگتا ہے جدا جدا ہو جاتا ہے۔ جھیل کی اکائی میں سب محویت سے پاک ہو جاتے ہیں۔
مگر عالمِ بیداری میں اُنہیں دوبارہ اپنی اپنی شخصیتوں کا لبادہ اُوڑھنا پڑتا ہے۔
جھیل کا خواب میرا ذاتی خواب ہے۔ اسے میں کسی ریکارڈ میں درج نہیں کروں گی۔ کسی فائل میں دفن نہیں ہونے دوں گی۔

اہم بات یہ ہے کہ ہسپتال کے جس شعبے میں مجھے ملازمت ملی ہے وہ دوسرے شعبوں سے بہت مختلف ہے ہمارے شعبے میں دوائیں نہیں دی جاتیں۔ مریض سے صرف گفتگو کی جاتی ہے۔ اُس کی سنی جاتی ہے۔ اُسے محسوس کیا جاتا ہے' مجھے اپنے شعبے کا طریقۂ کار پسند ہے۔ یہ ان جسمانی بیماریوں والے شعبوں کے طریقے سے بہتر ہے۔ جہاں رنگین محلولوں اور سفوف کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہسپتال کی عمارت نیم تاریک اور تنگ ہے جس کے باعث کبھی کبھی دوسرے شعبوں کے مریض اور معالج بھی ہمارے کمروں میں عارضی طور پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسے دنوں میں ہمارے شعبے کی برتری مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔
منگل اور بدھ کے روز جگہ کی کمی کے سبب آپریشن والے مریضوں کے پلنگ ہمارے شعبے کے ہال میں کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ ٹائپنگ کے دوران میری نظر بار بار ان کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ جس جگہ میں بیٹھتی ہوں۔ وہاں سے مریضوں کے فقط پاؤں نظر آتے ہیں۔ سرخ کمبلوں اور سفید چادروں سے نکلے صاف ستھرے زرد پیروں کی طویل قطار۔
کسی کسی دن اعصابی امراض کے شعبے والے بھی ہمارا کوئی کمرہ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے مریض عجیب وغریب بولیاں بولتے ہیں۔ لاطینی اور چینی زبانوں کے گانے گاتے ہیں اور سارا وقت شور مچاتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے مریضوں کی جسمانی حالت درست ثابت ہو جائے تو اعصابی امراض کے ماہر اُنھیں ہمارے شعبے میں بھیج دیتے ہیں۔
ان دشواریوں کے باوجود میں اپنے کام سے غافل نہیں ہوتی۔ سر جھکائے مسلسل دوسروں کے خواب ٹائپ کرتی چلی جاتی ہوں۔ اب تو مرے پاس مریضوں کے خوابوں کے علاوہ اپنے بھی ایک سے زیادہ خواب جمع ہو چکے ہیں۔

ان دشواریوں کے باوجود میں اپنے کام سے غافل نہیں ہوں۔
یہ خواب میں نے خود تخلیق کیے ہیں۔ لیکن ابھی میں ان خوابوں کو خود سے بھی نہیں دہراؤں گی۔ کچھ عرصے تک اُنھیں اُس مجسمے کی طرح وقت گزارنا ہوگا جو اپنی نقاب کشائی کی رسم سے ایک لمحے قبل تک مخمل کے سرخ کپڑے میں سر سے پاؤں تک ڈھکا رہتا ہے۔
بس جو بھی خواب حاصل کرتی ہوں جس طرح بھی حاصل کرتی ہوں اس پر سراسمیہ کے دستخط ضرور ثبت ہوتے ہیں۔ سراسمیہ کو ڈرامائی انداز میں ظاہر ہونا پسند ہے۔ ہر چند کہ وہ ظاہر ہونے کے لیے مختلف جگہوں اور اوقات کا انتخاب کرتا ہے۔ مگر کوئی جگہ' کوئی وقت ہو' وہ ہمیشہ ڈرامائی انداز میں سامنے آتا ہے۔
خوابوں کا کاروبار بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر سراسمیہ اپنی جانب سے اس میں شاعری کا عنصر شامل نہ کردے تو یہ کاروبار ناقابلِ برداشت ہوجائے۔ خوابوں کے کاروبار میں شاعری کا عنصر شامل کرنے پر میں سراسمیہ کی شکر گزار ہوں۔
چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس اس نوجوان نے بتایا تھا کہ اُس کے خواب...... لیکن میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اُس نوجوان کا خواب ہے جو اس روز سیاہ جیکٹ پہنے ہمارے کلینک میں داخل ہوا تھا؟ مجھے یقین ہے کہ یہ اُس کا ذاتی خواب ہے۔
دل میں یقین کا جذبہ ہو تو طاقت اور التجاؤں اور آنسوؤں سے خواب تحریر کیے جا سکتے ہیں۔ دوسروں کے خواب ٹائپ کرنا آسان کام ہے لیکن ذاتی خواب تخلیق کرنے میں بہت توانائی صرف ہوتی ہے۔
ہسپتال کے مرکز میں ایک اور شعبہ ہے' جو ہمارے شعبے سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے خواب ہمارے بس میں نہ آسکیں' اسے ہم عمارت کے مرکزی حصے میں بھیج دیتے ہیں۔ میں نے ہسپتال کا وہ شعبہ آج تک نہیں دیکھا۔ ہر چند کہ اس کی سیکریٹری میری واقف ہے۔ (ہم دونوں ایک ہی ہال میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں) مگر اس کا حلیہ اور اُٹھنے بیٹھنے کا انداز مجھے اُس سے دور رکھتا ہے۔ اس کا نام بھی عجیب سا ہے۔ میں اکثر اُس کا نام بھول جاتی ہوں۔ کچھ اس طرح کا نام جیسے ''مِل روبج'' یا ''مِل رُوج'' اس طرح کے نام ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نظر نہیں آتے۔ میں نے ایک مرتبہ ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی کی تھی اور یہ دیکھ کر خوش ہوئی تھی کہ شہر میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا نام ''اسمتھ''

نہیں ہے۔

بہر حال یہ مل روبج یا مل روج نام کی عورت بڑی صحت مند اور اونچی لمبی ہے اس کا لباس عام لباس سے زیادہ کسی ادارے کی وردی معلوم ہوتی ہے۔ (ضروری نہیں کہ یہ ادارہ کوئی قانون ہی نافذ کرتا ہو) مل روج کے سنگین چہرے پر چند غیر معمولی تل بھی ہیں۔ یہ تل دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید مل روج کا چہرہ سورج کی روشنی میں بہت کم رہا ہے۔ دھوپ کی تپش حاصل نہ ہو تو جلد پر طرح طرح کے داغ پڑ جاتے ہیں۔ ممکن ہے مل روج نے مصنوعی روشنیوں تلے پرورش پائی ہو۔ اگر اس کے چہرے سے اس کی آنکھیں نوچنے کی کوشش کی جائے تو محسوس ہوگا جیسے کوئی پتھر کھرچ رہا ہے۔

میرے وارڈ کی ہیڈ سیکریٹری کا نام مس ٹیلر ہے۔ مس ٹیلر روزِ اول سے ہمارے وارڈ سے وابستہ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس دن میں پیدا ہوئی تھی۔ اسی روز وارڈ کا افتتاح ہوا تھا۔ مس ٹیلر ہسپتال کے بارے میں ہر چیز جانتی ہے۔ وہ اس کے تمام ڈاکٹروں' مریضوں' شعبوں اور منصوبوں سے واقف ہے۔ اپنے پیشے میں اتنی لگن میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ وہ ہسپتال میں موجود ہر جان دار اور بے جان شے کا حساب رکھتی ہے۔ اُسے تمام وقت اعداد و شمار میں گھرا دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔

دفتر میں میری دل چسپی صرف خواب جمع کرنے کی حد تک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہسپتال میں آگ لگ جائے تو مس ٹیلر خود کو بچانے سے پہلے اعداد و شمار کی فائلیں بچانے کی کوشش کرے گی۔ میرے اور مس ٹیلر کے مشاغل مختلف ہونے کے باوجود ہمارے آپس کے تعلقات خوش گوار ہیں۔ بس میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ مجھے دفتر کی فائلوں میں پرانے خواب پڑھتے دیکھ لے۔ عام طور پر ہمارا شعبہ بے پناہ مصروف رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے کبھی کبھی خوابوں کے پرانے ریکارڈ میں جھانکنے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔ مگر اتنی عجلت میں انوکھے اور اُچھوتے خوابوں کا انتخاب ایک مشکل عمل ہے۔ میرے فن کا تقاضا ہے کہ میں فرصت سے بیٹھوں' خوابوں کی گہرائی میں اُتروں' ان کے سارے پہلوؤں کو جانچوں' اُنھیں ہر زاویے سے پرکھوں اور پھر جن خوابوں کو ہر طرح سے مکمل پاؤں اُنھیں گھر لے جا کر خوابوں کی مقدس کتاب میں درج کردوں۔ اگر شراب کا معیار بتانے والے ماہرین' پہلا قطرہ چکھنے سے قبل ایک گھنٹے تک شراب کی خوش بو سونگھ سکتے ہیں تو میں خوابوں کے سلسلے میں اس فرصت اور سہولت سے

کیوں محروم ہوں۔
کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بڑا ٹرنک لاؤں اور خوابوں کی ساری فائلیں اُس میں بھر کے لے جاؤں۔ ہسپتال کے گیٹ پر غیر معمولی قسم کی پوٹلیوں اور بنڈلوں کو کھلوا کر دیکھا جاتا ہے اور اسٹاف کے چند دوسرے لوگ بھی سرکاری سامان کی نگہداشت پر مامور ہیں مگر میں ٹائپ رائٹر یا کوئی قیمتی دوا وغیرہ چرانے کا منصوبہ نہیں بنا رہی میں تو بس پرانے خوابوں کی فائلیں ایک رات کے لیے گھر لے جاؤں گی اور دوسری صبح اُنہیں اسی ترتیب سے دوبارہ الماری میں سجا دوں گی۔ اس میں کسی کا کیا نقصان ہے؟ یوں تو میں خوابوں میں فقط جھانکنے سے بھی کچھ معلوم کر سکتی ہوں لیکن مس ٹیلر کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جس کے سبب میں ہر آہٹ اور سرگوشی پر چونک جاتی ہوں' اور اس طرح میں چند لمحوں کے لیے بھی اپنا شوق مکمل توجہ سے پورا نہیں کر پاتی۔
اُداس دنوں میں جب میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ پرانی فائلوں سے کسی خواب کی ایک جھلک ہی دیکھ لوں۔ سراسمیہ میری جانب پشت کر کے پہاڑوں جتنا بلند ہو جاتا ہے اور مجھ پر اتنا خوف طاری ہوتا ہے کہ میں اپنے حواس گم کر بیٹھتی ہوں۔
ایسے موقع پر میری حالت ان بھیڑوں کی سی ہوتی ہے جو آنکھوں کے سامنے اُگی سبز گھاس چرنے میں اس قدر مشغول ہو جاتی ہیں کہ چراگاہ کے اختتام پر قربانی کے چبوترے کی موجودگی سے آخری لمحے تک بے خبر رہتی ہیں۔
اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہر روز سراسمیہ کے آدمیوں کو اُن کی پناہ گاہوں سے باہر نکال رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کے لیے سراسمیہ کے دربار تک رسائی رکھنے والوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہر چند کے اس کے گروہ میں فقط وہی نمایاں منصب پر فائز ہوتا ہے جو خوابوں کو یاد رکھے اور خواب دیکھنے والوں کو بھول جائے۔ یوں بھی خوابوں کے مقابلے میں خواب دیکھنے والوں کی کیا وقعت ہے؟ مگر ڈاکٹر یہ تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے لیے تو ''سراسمیہ'' مریض کے بدن میں داخل ہونے والا کانچ کا ٹکڑا ہے جسے وہ روحانی پائپوں کی مدد سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
''ہیری کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' اعتراض کرنے والوں کو ڈاکٹر یاد دلاتے ہیں۔ ''جب وہ ہمارے شعبے میں داخل ہوا تھا تو سراسمیہ اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ اسی لیے تو اُسے

پوری دُنیا غلاظت کا ڈھیر نظر آنے لگی تھی۔ اُس نے کام پر جانا چھوڑ دیا تھا کہ راستے میں انسانوں کا تھوک اور جانوروں کی آلودگی پڑی ہوتی ہے۔ پہلے یہ گندگی جوتوں کو لگتی ہے۔ وہ کہتا تھا اور جب گھر آکر جوتے اُتارو تو ہاتھ ناپاک ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد منہ تک پہنچنے میں اسے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟''

''ہیری کو جسمانی معذور بھی برے لگتے تھے'' معذوروں کے ناخن اور کانوں کا پچھلا حصہ میل سے اٹا ہوتا ہے''۔ وہ اکثر گفتگو کا آغاز ہی اس جملے سے کرتا تھا۔ لیکن ہمارے مشوروں اور ہدایات پر عمل کرنے سے وہ بالکل نارمل ہوگیا تھا۔ یاد ہے؟ علاج کے آخری دن اُس نے ہم سب کے ساتھ کیسی خوش دلی سے ہاتھ ملایا تھا اور ہمارا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے آخری دن اُس کی آنکھوں کے شعلے بجھے ہوئے تھے۔ اور وہ احمقوں کی طرح مسکراتا ہوا ہمارے کلینک سے روانہ ہوا تھا۔ اگر صورتِ حال یہی رہی تو کتنے ہیری آئیں گے۔ صحت یاب ہو کر چلے جائیں گے' اور میں اپنے خوابوں کے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں کرسکوں گی۔ مجھے بہر طور اپنی رفتار بڑھانی ہے' اور مس ٹیلر کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔

اس مسئلے کا صرف یہی حل ہے کہ کسی دن دفتر ہی میں رات گزاردوں اور صبح تک تمام فائلوں سے اپنے مطلب کے خواب ڈائری میں تحریر کرلوں۔

دفتر میں رات گزارنے کا خیال کئی دنوں سے (کمبلوں سے نکلے مریضوں کے زرد پیروں کی قطار کی طرح) بار بار میرے سامنے آرہا ہے۔ ایک دن پانچ بجے شام میں خود کو دفتر کے واش روم میں چھپتے دیکھتی ہوں۔ گہرے ہوتے اندھیرے کے ساتھ دفتر سے گھر جانے والوں کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ معدوم ہوجاتی ہے۔ میں واش روم سے باہر نکلتی ہوں تو دن بھر مصروف رہنے والے ہسپتال کی عمارت' سوموار کے چرچ کی طرح خالی اور اُداس محسوس ہوتی ہے۔ میں فوراً اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔ ٹائپ رائٹرز اپنے خانوں میں بند کیے جاچکے ہیں۔ ٹیلی فونوں میں تالے پڑے ہیں۔ دنیا اپنی جگہ موجود ہے۔

میں چھت پر لگا ہلکی طاقت کا بلب روشن کر کے' ریکارڈ میں موجود خوابوں کی سب سے پرانی فائل کا پہلا صفحہ کھولتی ہوں۔ فائل کا رنگ ابتدا میں نیلا رہا ہوگا مگر اب اُس کی جلد زرد ہوگئی ہے۔ میری پیدائش کے دن یہ فائل بالکل نئی ہوئی ہوگی۔ میں صبح تک اس فائل کی ورق گردانی کرتی ہوں۔

آدھی رات کے قریب میں اس فائل میں درج آخری خواب پڑھتی ہوں۔ مئی کی انیس تاریخ کو ایک نرس اپنے مریض کی الماری کھول کر لانڈری کے تھیلے سے پانچ کٹے ہوئے سر نکالتی ہے۔ اُن میں سے ایک سر نرس کی ماں کا ہے۔

سرد ہوا کا ایک ہلکا جھونکا میری گردن کو چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں خوابوں کی فائلوں کے سامنے فرش پر بیٹھی ہوں اور اب ٹانگوں پر فائل کا بوجھ محسوس کر رہی ہوں۔ اچانک میری نظر سامنے والے دروازے پر پڑتی ہے۔ دروازے کے کواڑ فرش سے اُٹھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی دوسری طرف دو مردانہ جوتے نظر آرہے ہیں۔ جوتوں کی نوکیں میری سمت ہیں۔ بھورے چمڑے کے بنے ہوئے اونچی ایڑیوں والے یہ جوتے غیر ملکی ساخت کے ہیں۔ جوتے ساکت ہیں۔ ہر چند کہ ان کے اوپر کالے رنگ کی وہ ریشمی جرابیں بھی ہیں۔ جن سے کسی ٹانگوں کی زرد رنگت جھلک رہی ہے مگر جوتے ساکت ہیں۔

''بے چاری'' کوئی انتہائی پیار بھری آواز میں کہتا ہے..... ''بے چاری' فرش پر کیسے بیٹھی ہے۔ اب تک تو اس کی ٹانگیں اکڑ گئی ہوں گی۔ اس کی مدد کرو۔ سورج نکلنے والا ہے''۔

دو ہاتھ میرے بازوؤں تلے سے نکل کر مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ میری ٹانگیں واقعی سن ہو چکی ہیں۔ میں لڑکھڑاتی ہوں۔ خوابوں کی فائل فرش پر جا پڑتی ہے۔ ''کچھ دیر تک یوں ہی کھڑی رہو۔ خون کی گردش درست ہو جائے گی۔'' ہسپتال کے مالک کی سرگوشی میرے کان میں گونجتی ہے۔ میں اپنی ڈائری سینے سے لگالیتی ہوں۔ یہ میری آخری امید ہے۔

''اسے کچھ نہیں معلوم''

''اسے کچھ نہیں معلوم''

''اسے سب کچھ معلوم ہے!''

چمکدار جوتے کی نوک خوابوں کی فائلوں کو ٹھوکر مارتی ہے۔ میری پیدائش کی پہلی چیخ کے وقت شہر میں دیکھے جانے والے تمام خوابوں کا ریکارڈ' الماری کی تہ کے اندھیرے میں چلا جاتا ہے۔

وہ مجھے عمارت کے مرکز کی سمت لے جا رہا ہے۔ میں اپنی رفتار تیز کر دیتی ہوں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے گھسیٹا جا رہا ہے۔

''اس سے پہلے کہ تم مجھے نکالو'' میں مضبوط لہجے میں کہتی ہوں۔ میں خود نوکری چھوڑ دوں گی'' تم

ہمارے کام آتی ہو''۔اس دفعہ مالک کہیں دور سے بولتا ہے۔''ہمیں تمہاری ضرورت ہے''۔
میں اور مالک چلتے رہتے ہیں۔یہاں تک کہ پیچ در پیچ راہداریوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔اس کے بعد سرنگیں آتی ہیں۔آخری سرنگ کے اختتام پر آہنی پھاٹک کھل جاتا ہے۔ہمارے گزرنے کے بعد ہماری پیٹھ پیچھے پھاٹک یوں بند ہوتا ہے جیسے مویشیوں کو مذبح خانے لے جانے والی گاڑی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔
ہم ایک انجانے کمرے میں داخل ہوچکے ہیں۔کم از کم میرے لیے یہ کمرہ بالکل اجنبی ہے۔میں دوسروں کے علاقے میں آگئی ہوں۔اور میرا سامان پیچھے رہ گیا ہے۔ہینگر پر لٹکا کوٹ......اور میرے ڈیسک کی دراز میں میرا ابٹوا پڑا ہے۔صرف میری ڈائری میرے ساتھ ہے اور سراسمیہ ہے جس کی تپش مجھے برف باری میں منجمد ہونے سے بچارہی ہے۔میں انتہائی تیز روشنیوں کے نیچے کھڑی کردی گئی ہوں۔''آگئی ہے''۔
''چڑیل''
مس مِل روج فولادی ڈیسک کے پیچھے کھڑی مجھے گھور رہی ہے کمرے کی ساخت ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کا نچلا حصہ ہو۔کسی بھی دیوار پر کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہے۔سامنے سے سراسمیہ کے نائب نمودار ہوتے ہیں اُن کی آنکھیں دہکتے ہوئے کوئلوں سے زیادہ سرخ اور روشن ہیں۔وہ مجھے عجیب آوازوں میں خوش آمدید کہتے ہیں۔انہیں معلوم ہوچکا ہے کہ میں سراسمیہ کی صفوں میں شامل ہوں اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ دنیا میں سراسمیہ کے کارکن کس حال میں ہیں۔
''امن۔میں تمہارے لیے امن وسلامتی کا پیغام لے کر آئی ہوں''۔میں اپنا ڈائری والا ہاتھ بلند کرکے اُنھیں مخاطب کرتی ہوں۔
''یہ پرانا راگ ہے۔بی بی''۔مِل روج ہاتھی کی طرح جھوم اٹھتی ہے۔''......اب ہم ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوں گے''۔
مس مِل روج مجھ پر جھپٹتی ہے۔میں بچنے کی کوشش کرتی ہوں۔مگر وہ بہت تیز رفتار اور طاقت ور ہے پہلی بار اُس کا وار خالی جاتا ہے مگر دوسری مرتبہ وہ مجھے دبوچ لیتی ہے۔
''پرانا راگ مت الاپو۔یہ ڈائری ہمارے حوالے کردو''۔
مس مِل روج کے سانسوں میں پاگل کردینے والی بو ہے۔میں اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش

میں اس کی مرد وں جیسی مضبوط اور بے رس چھاتی کو اپنے وجود کی پوری قوت سے پرے دھکیلتی ہوں۔لیکن میں اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہوں۔اُس کی انگلیاں درندے کے پنجوں کی طرح میرے بدن میں پیوست ہو رہی ہیں۔

''میری بچی...... میری بچی میرے پاس لوٹ آئی ہے''۔وہ میرے کانوں میں پھنکارتی ہے۔

''یہ لڑکی''۔ ہسپتال کے مالک کی آواز سے کمرہ گونجتا ہے۔''سراسمیہ کے ساتھ وقت گزارتی رہی ہے''۔

''بری بات!''

''بری بات!''

سفید لکڑی کا ایک تخت عین میرے سامنے بچھا دیا گیا ہے۔مل روج میری کلائی سے گھڑی اتارتی ہے۔انگلیوں سے انگوٹھی نکالتی ہے بالوں سے ہیئر پن الگ کرتی ہے۔پھر وہ میرا لباس اُتار کر مجھے موسم کی پہلی برف جیسی بے داغ اور سفید چادروں میں لپیٹ دیتی ہے۔اچانک کمرے کے چاروں کونوں سے پتھرائی آنکھوں والے چار وجود نکل کر مجھے سفید تخت پر لے جاتے ہیں۔انہوں نے آپریشن تھیٹر والے کپڑے اور نقاب پہن رکھے ہیں۔ ان کا مقصد سراسمیہ کی بادشاہت ختم کرنا ہے۔وہ ایک ایک کر کے میری دونوں ٹانگیں اور بازو قابو کر لیتے ہیں۔دروازے سے آنے والا میرے سر کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔میں اُسے نہیں دیکھ سکتی۔مگر اُس کے ہاتھوں میں موجود تیز دھار والے اوزاروں کی کھڑاہٹ سن سکتی ہوں۔

سراسمیہ کے نمائندے میری بے بسی پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں وہ گنگناتے ہیں۔

''فقط خوف سے محبت کی جا سکتی ہے''

خوف سے محبت 'باشعور ہونے کی علامت ہے

فقط خوف 'ہر طرف خوف کا راج ہو۔

فقط خوف سے محبت کی جا سکتی ہے۔''

مل روج اور ہسپتال کا مالک سراسمیہ کے نمائندوں کو خاموش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ میرے سر کے پیچھے کھڑے شخص کو اشارہ کیا جاتا ہے۔یکلخت مشین اور تیز دھار آلات چلنے کی آواز بقیہ تمام آوازوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔جوں ہی میں خود کو معدوم ہوتے محسوس کرتی ہوں چھت پر

لگی روشنیوں سے سراسیمہ کا چہرہ جھانکتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی ہوں۔ آواز کی کڑک سے کائنات پر سائے پڑ رہے ہیں۔

میں عمر بھر سراسیمگی سے وابستہ رہی ہوں' اور مجھے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وابستگی بیسویں منزل سے چھلانگ ہے۔ گلے میں پڑی رسّی ہے' دل پر رکھے خنجر کی نوک ہے۔

☆

سلویا پلاتھ' عجیب عورت تھی تمام عمر خواہشِ مرگ میں مبتلا رہی۔ بالآخر تیسری کوشش میں تیس برس کی عمر میں خود کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جس طرح کوئی مرد افسانہ نگار حقیقی طور پر یہ نہیں بتا سکتا کہ خاوند کی لاش دیکھنے پر کسی عورت کے ابتدائی احساسات کیا ہوتے ہیں' اسی طرح عورت کے خوابوں کی دنیا بھی مرد کے لیے مکمل اجنبی ہے اس نہاں خانے میں ہم فقط کسی عورت کی ہمراہی میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن خوابوں کا جہان اس قدر رنج اور ذاتی ہوتا ہے کہ ہم اکثر اپنے خواب خود سے بھی نہیں دہراتے۔ جب دوسرے درجے کے ادیب اپنے خواب تحریر کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو دراصل وہ جانتے ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر سلویا پلاتھ واقعی اپنے خواب بیان کرنے لگی تھی نتیجتاً وہ خواب در خواب خالی ہوتی گئی۔ ذہن اور سینے کا خلا ایک حد سے بڑھ جائے تو بیرونی فضا کے دباؤ سے وجود کا انہدام لازمی ہے۔ اسی لیے ایک دن سلویا نے تنور میں سر ڈال کر اپنے اس دماغ سے نجات حاصل کی جس پر خوابوں کے برملا اظہار سے شگاف پڑنے لگے تھے۔

مرشد کی ہدایت کے بغیر خود میں اترنے کا لازمی نتیجہ...... انجذاب! گمراہی! ٹوٹ پھوٹ!

مگر سلویا پلاتھ تیس سال کی عمر تک ایسی نظمیں' ناول اور افسانے لکھ چکی تھی کہ دولت مستعجل ہونے کے باوجود اسے ادبی تذکروں میں پائیداری حاصل ہوئی۔ اس نے کسی ماہرانہ رہنمائی کے بغیر آنکھیں اندر کو پھیر لیں اور اپنی ذات کے مشاہدے میں مصروف ہو گئی یہ بڑی منزل ہے اور ہر بڑی منزل کی طرح یہاں بھی جان کے زیاں کا اندیشہ رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب سلویا پلاتھ ادب کے عالمی افق پر شہابِ ثاقب کی طرح روشنی بکھیر کر معدوم ہو گئی تو کسی کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ کم از کم وہ لوگ قطعی حیران نہیں ہوئے جو اس کی تحریروں کی گہرائی' شدت اور بلوغت کے سامنے خود کو عریاں ہوتے محسوس کر چکے تھے۔ ان کے مطابق "...... وہ آگ سے کھیل رہی تھی اسے راکھ ہونا ہی تھا"۔

جیمز اسٹیفینز

خواہش

پندرہ سال کی ازدواجی زندگی میں اس کی بیوی نے پہلی مرتبہ اسے اتنا مضطرب الحال پایا تھا۔

''بھئی وہ عجیب شخص تھا''۔ اس نے تیسری بار یہ بات دہرائی۔ ''ویسے تو اس کے چہرے کے نقوش عام آدمیوں جیسے تھے اور آنکھیں بھی کوئی ایسی غیر معمولی نہیں تھیں۔ مگر اس کی نظریں۔ وہ کس انداز سے دیکھتا تھا۔ تمھیں کیا بتاؤں۔ کاش تم میرے ساتھ ہوتیں''۔

''آگے تو بڑھو۔ پھر کیا ہوا؟'' اس کی بیوی جلد از جلد پوری بات سن کر سونا چاہتی تھی۔

''......تو وہ میرے آگے چل رہا تھا۔ میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور پیچھے سے وہ بالکل عام آدمیوں جیسا تھا۔ ویسے تو وہ سامنے سے بھی عام آدمیوں جیسا تھا' لیکن اس کی نظریں......''

''اف فوہ!'' اس کی بیوی اُکتا گئی۔ ''خدا کے بندے ہوا کیا؟''

''تو وہ میرے آگے چلتا جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک انتہائی تیز رفتار کار گلی میں داخل ہوئی۔ ممکن ہے کہ بڑی سڑک پر اس کار کی وہی رفتار مناسب تصور کی جاتی لیکن وہ گلی قطعی کشادہ نہیں تھی اور تم جانتی ہو کہ تنگ گزرگاہ میں ذرا سی تیز رفتاری......''

''پھر کیا ہوا؟''

''تو جیسے ہی کار اُس کے نزدیک پہنچی وہ پیچھے دیکھے بغیر دوسری سمت جانے کے لیے فٹ پاتھ سے اُترنے لگا۔ اگر وہ ایک قدم اور اٹھاتا تو یقیناً کار اُسے روندتی چلی جاتی۔ تم جانتی ہو......''

''پھر؟''

''تو اس سے پہلے کہ وہ ایک قدم اُٹھانے کی مہلک غلطی کرتا' میں نے عقاب کی طرح جھپٹ کر اُسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ زندگی سے بیزار معلوم ہوتے ہو!'' میں نے کہا۔ ''اس عمر میں ٹوٹی ہڈیاں دوبارہ نہیں جڑتیں......'' اور وہ مسکراتا رہا۔

''کمال ہے!'' اچانک اس کی بیوی کو قصہ دلچسپ معلوم ہوا۔ ''بعد میں ہم دونوں سڑک کے آخر تک چلتے رہے۔ اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ وہ بہت عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ چوراہے پر

واقع ایک ریستوران میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ میں دفتر سے دن کے کھانے کے لیے ہی نکلا تھا۔ اس لیے انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی''۔
''تو آج تم نے دن کا کھانا ایک اجنبی کے ساتھ کھایا''۔ اس بار اس کی بیوی نے فقط کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

''سنو تو'' اس نے بے صبری سے ہاتھ ہلایا۔ ''جب ہم ریستوران میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے تو اُس نے اچانک کہا کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے' اور میں تمہاری کوئی بھی ایک آرزو پوری کر سکتا ہوں۔ بتاؤ تمھیں زندگی میں سب سے زیادہ کس چیز کی خواہش ہے؟''
''ارے واقعی؟''

''ہاں۔ میرے لیے بھی یہ بات غیر متوقع تھی۔ ایسی کہانیاں میں بچپن سے سنتا آیا ہوں لیکن...... لیکن جب میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں ایک ایسی سنجیدگی دیکھی جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی''۔
''پھر تم نے کیا مانگا؟'' اب اس کی بیوی با قاعدہ متوجہ تھی۔
''مجھے بزرگوں کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ علم' صحت اور دولت دنیا کی سب سے بڑی نعمتیں ہیں۔ پہلے میں نے دولت کے بارے میں سوچا۔ اور اس خواہش کا اظہار کرنے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ دولت کی تو ہمیں خاص ضرورت نہیں ہے......''
''دولت کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے'' بیوی کا لہجہ تند ہو گیا۔
''ایک لحاظ سے تم درست کہہ رہی ہو''۔ اس نے جواب دیا۔ ''لیکن جب میں نے دولت کے مسئلے پر غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ ہم وہ سب کچھ کر چکے ہیں یا کر سکتے ہیں جو دولت کے ذریعے ممکن ہے۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی سیر ہم متعدد مرتبہ کر چکے ہیں۔ ہمارا اتنا بڑا ذاتی مکان ہے۔ اندرون ملک زرعی زمینیں ہیں۔ میرا کاروبار اتنا جم چکا ہے کہ اب اگر میں اس میں دل چسپی لینا کم بھی کر دوں تو بھی ایک معقول آمدنی ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ پھر ہماری اولاد بھی نہیں ہیں کہ اس کے مستقبل کی فکر کریں''۔
''مگر پھر بھی......'' بیوی کے لہجے میں ناگواری تھی۔
''مگر پھر بھی......'' اُس نے مسکرا کر دہرایا۔ ''مجھے کوئی خواہش ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ میں نے صحت اور علم کے بارے میں بھی سوچا لیکن میں مثالی صحت کا مالک ہوں اور جہاں تک علم کا تعلق

ہے تو میں اس معاملے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بہت زیادہ علم تو ویسے بھی خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ عالموں کے بارے میں اتنا تو تم جانتی ہو کہ وہ ہمیشہ اداس اور سرگرداں رہتے ہیں۔

''یہ تو تم نے اچھا کیا''۔ بیوی نے کہا۔ ''عالم فاضل ہونا کیا کام آتا ہے''

''تنگ آ کر میں نے اس سے کہا کہ تم ہی بتاؤ میں کیا مانگوں۔ اس پر وہ بولا کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ تمھیں اپنی خواہش خود معلوم کرنا ہوگی''۔

میں نے کہا ''فرض کرو تم اس صورت حال میں ہوتے تو اپنے لیے کیا خواہش کرتے۔ اس نے کہا' میں قطعی کوئی خواہش نہ کرتا اور چیزوں کو ایسے ہی ہونے دیتا جیسے وہ ہو رہی ہیں۔ اس جواب پر میں حیرت زدہ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے بھی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے''

''ارے!'' اُس کی بیوی بے ساختہ بول اُٹھی۔

''ٹھہرو تو'' اس نے فوراً کہا ''مجھے بالآخر سمجھ میں آ ہی گیا کہ میں کیا مانگوں میں نے سوچا میں اڑتالیس سال کا ہو چکا ہوں۔ دولت مند اور کامیاب ہوں۔ علمی اعتبار سے بھی پس ماندہ نہیں ہوں لیکن ظاہر ہے عمر گزرنے کے ساتھ آدمی جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس سے کہا جناب میں آخری وقت تک بالکل ایسی ہی رہنا چاہتا ہوں جیسا کہ میں اس وقت اڑتالیس برس کی عمر میں ہوں...... میں نے اُس سے لافانی ہوجانے یا اس طرح کی کسی بچکانہ خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں اس میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ اپنے تمام ساتھیوں کو رخصت ہوتے دیکھو اور خود ضعیف و لاچار تنہا زندہ رہو۔ اس لیے میں نے ہر زاویے سے جانچ پرکھ کر خواہش کی کہ میں جسمانی طور پر بدن نہیں چاہتا ہوں''۔

''تمھیں یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے تھی''۔ اُس کی بیوی جھنجلا کر بولی۔

''تم اسی حالت میں رہو گے لیکن میرے بدن پر تو زوال آئے گا میں ایک جوان آدمی کی بوڑھی بیوی بن کر زندہ نہیں رہنا چاہوں گی۔ تمہاری یہ خواہش میرے ساتھ زیادتی ہے''

''میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی'' اُس نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ جیسا میں اب ہوں اگر آخر تک ایسا ہی رہوں تو بھی یہ ایسی جسمانی حالت نہیں ہے کہ تمھیں دھوکہ دوں اور نئی محبتیں کرنے لگوں یا عیاشیوں کی طرف مائل ہو جاؤں۔ تم ذرا غور تو کرو''۔

''پھر اس نے کیا کہا؟'' بیوی کا لہجہ دوبارہ ہموار ہو گیا۔

''اُس نے کہا۔ ٹھیک ہے اور دوسرے موضوعات پر گفتگو شروع کر دی۔

''کیسے موضوعات''

''مذہب' روحانیت' حیات بعد الموت وغیرہ''۔ پھر خاوند کا لہجہ اچانک معنی خیز ہو گیا۔''ایک بات ہے مجھے آج عجیب سا سرور محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے پہلے کبھی خود کو اتنا تازہ دم اور پر سکون نہیں پایا''۔

اُس کی بیوی اچانک بلند آواز سے ہنسنے لگی۔''تم ایک احمق آدمی ہو' وہ بولی۔''اور میں اس سلسلے میں تم سے کم نہیں ہوں۔ اگر کوئی ہماری آج کی باتیں سن لیتا تو ہمارا کس قدر مذاق اُڑاتا''۔

یہ سن کر وہ بھی ہنس دیا۔ پھر دونوں نے خاموشی سے شب خوابی کا لباس پہنا اور شب بخیر کہہ کر بستر پر دراز ہو گئے۔

رات کو کسی وقت اُس کی بیوی نے ایک خواب دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک بحری جہاز پر سوار کسی انجانی منزل کی جانب رواں ہے۔ اچانک جہاز پانی میں اُبھری ایک چٹان سے ٹکرا کر آگے سے چیخ جاتا ہے۔ اور دھیرے دھیرے ڈوبنے لگتا ہے۔ جوں جوں جہاز کا اگلا سرا پانی میں غرق ہوتا جاتا ہے۔ وہ پیچھے کی جانب ہٹتی جاتی ہے۔ بالآخر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اب کہیں پاؤں دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی۔

جوں ہی اس کے پاؤں پانی میں بھیگنے شروع ہوئے وہ تڑپ کر بیدار ہو گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے شکر ادا کیا کہ یہ سب کچھ محض ایک خواب تھا۔ چند لمحوں تک وہ خوف اور سردی سے کپکپاتی رہی۔ اور پھر حدت حاصل کرنے کے لیے کھسک کر اپنے خاوند کے قریب ہو گئی۔ یکلخت اُسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے خاوند کے بجائے برف کی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ وہ چیخ مار کر بستر سے اُٹھی اور بتی جلا کر اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کا خاوند دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

☆

بنیادی طور پر تمام حکایات سبق آموز ہوتی ہیں۔ چونکا دینے والا اختتام حکایت کے کہانی پن میں اضافہ کرتا ہے۔ جب بچہ اپنے بزرگوں سے کہانی کی فرمائش کرتا ہے تو بزرگوں کی دانشمندی کا تقاضا ہے کہ وہ اسے کوئی ایسا قصہ سنائیں جس کا آخری جملہ یکدم پورا واقعہ بدل دے۔ نابالغ ذہن کے لیے یہ افسانے کی موثر ترین شکل ہے۔ اسی لیے بچے خود پر اہلِ دہر کا قیاس کرتے ہوئے مان لیتے ہیں کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔

بہر حال اس کیفیت میں ابتدائے عمر کا ہیجان شامل ہے۔ محض ''غیر متوقع قافیے'' کی کوئی کتنی ا۔

کب تک داد دے گا؟ لیکن اگر تمام واقعے کی فضا خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں شام جیسی ہو تو کہانی حیران کن انجام کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی متاثر کرتی ہے...... بڑوں کی توجہ بھی مبذول کرلیتی ہے۔

بعض اوقات مصنف فقط آخری جملے کی چکا چوند پر سفر شروع کردیتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ راستے میں لگنے والی ٹھوکر اس کی سنجیدہ مسافت کو مضحکہ خیز بنا رہی ہے۔ اس کے برعکس مسحور کن ابتدا کے بعد کہانی کو ششدر کردینے والی انتہا تک پہنچا دینا قصہ گوئی کے کمالات میں سے ایک ہے "خواہش" عالمی افسانے کی صفِ اوّل میں اس کمال کی نمائندگی ہے۔

گراہم گرین

مشاہدہ

لندن کے اُس ریستوران میں جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔آج آٹھ جاپانی ایک میز کے گرد بیٹھے انگریزی کھانے میں مشغول تھے۔ وہ آپس میں جاپانی زبان میں گفتگو کر رہے تھے جس کا ایک لفظ بھی سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔لیکن ان کے لبوں پر رقصاں دائمی مسکراہٹ اور ہر بات سے پہلے ادب سے جھک جانا اور دوسرے کا جواب سننے کے دوران مستقل تائید میں سر ہلاتے رہنا' مجھے بہت بھلا لگ رہا تھا۔اُن آٹھ شائستہ اور مہذب جاپانی شہریوں میں سے سات نے عینکیں پہنی ہوئی تھیں۔ ریستوراں کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھی خوبصورت لڑکی وقفے وقفے سے ان جاپانیوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتی' مگر اس لڑکی کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش تھا جس کے سبب وہ اپنی ذات اور سامنے بیٹھے اپنے ساتھی کے علاوہ دنیا کی کسی چیز پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔

لڑکی کے بال بھورے اور چہرے کے نقوش دل کش لطافت کے حامل تھے۔ اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر نرم اور دھیما تھا' لہجے میں تندی اور جارحیت کی جھلک تھی جو کبھی کبھی مبہم زیریں رو سے بڑھ جاتی۔ ایسے موقعوں پر لڑکی کی باتوں میں تلخی کا عنصر نمایاں ہو جاتا تھا۔اس کے دائیں ہاتھ کی منگنی کی انگلی پر ایک جدید طرز کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

گفتگو کے دوران لڑکی اس انگلی کو زیادہ حرکت دیتی تھی۔

''.....تو تم سمجھ گئے۔ہم اگلے ہفتے شادی کر سکتے ہیں'' لڑکی نے کہا۔

''ہاں۔لڑکے نے اثبات میں گردن ہلائی۔

لڑکے کی آنکھوں میں وہ خلا تھا جو عام طور پر غائب الدماغ' یا غبی لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔وہ کچھ دیر تک یوں ہی بے دھیانی سے سر ہلاتا رہا' اور پھر جذبات سے عاری آواز میں بولا: ''ہم شادی تو کر لیں گے مگر امی ......'' میں لڑکے کا جملہ پورا نہیں سن سکا' کیوں کہ اس لمحے جاپانیوں کے گروہ کا سب سے عمر رسیدہ شخص کھڑا ہو کر اپنی مادری زبان میں کوئی پر

مزاح مکالمہ ادا کرنے لگا۔ اور اچانک دوسرے جاپانیوں کی فطری مسکراہٹ دبے دبے قہقہوں میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کے دوران بھی فرطِ ادب سے دہرے ہو کر ایک دوسرے کے سامنے سرخم کر رہے تھے اور میں مجلسی آداب کے اس دل چسپ نظارے میں محو ہو گیا تھا۔

لڑکی کے منگیتر کی شکل لڑکی سے ملتی تھی۔ اُن کے چہروں کے نقوش یوں مشابہ تھے کہ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا تھا جیسے ایک ہی مصور کی بنائی ہوئی ''نر'' اور ''مادہ'' کی تصویریں آمنے سامنے رکھی ہوں۔ لڑکا گزشتہ صدی میں پیدا ہوتا تو انگلینڈ کی نیوی میں شمولیت اختیار کر سکتا تھا۔ اُس زمانے میں نازک نقوش اور حساس طبیعت فوج میں عہدہ بہ عہدہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔

''وہ مجھے پانچ سو پاؤنڈ تو ایڈوانس دے رہے ہیں'' لڑکی نے کہا ''اور غیر مجلد ایڈیشن کے حقوق وہ پہلے ہی فروخت کر چکے ہیں۔ سمجھے؟''

گھریلو نظر آنے والی لڑکی کے اس خالص کاروباری اندازِ گفتگو نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ حیرت کا ایک اور سبب بھی تھا۔ لڑکی میرے ہی پیشے سے وابستہ تھی۔ ''وہ بھی کتابیں لکھتی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس سال تھی۔ ''بیس برس کی خوبصورت لڑکی...... اور ادیب بننے کی خواہش...... اسے تو زندگی سے کوئی اچھی اور آسان چیز طلب کرنا چاہیے تھی''۔

''لیکن میرے چچا......'' لڑکا بولا۔

''تمہارے تعلقات ان سے ویسے بھی کوئی خاص خوشگوار نہیں ہیں اور اس طریقے سے ہم بہت جلد خود کفیل ہو جائیں گے''۔

''تم'' لڑکے نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ''تم خود کفیل ہو جاؤ گی۔ میں نہیں''

''میں نے پبلشر سے تمہارے بارے میں بھی بات کی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر وہ واقعی اس طبیعت کا ہے تو...... میرے خیال میں تم پہلے اچھی کتابیں پڑھنی شروع کر دو...... مشہور ناول، افسانے......''

''لیکن مجھے تو کتابوں سے کبھی دور کا واسطہ بھی نہیں رہا''

''ابتدائی رہ نمائی کے لیے میں موجود ہوں''

''امی کہتی ہیں کہ عملی زندگی میں ادب کمزور بیساکھی ثابت ہوتا ہے''

''پانچ سو پاؤنڈ پیشگی، اور غیر مجلد کے حقوق خاصی کمزور بیساکھی ہے؟'' لڑکی کے لہجے میں طنز تھا۔

لڑکا خاموش ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر گہری سوچ کی شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

اُس کے بارے میں میرا خیال غلط ثابت ہو رہا تھا۔ وہ گزشتہ صدی کی نیوی میں بھی ترقی کا زینہ طے نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی نے چند لمحوں تک گفتگو میں اُسے اُس کی زندگی کے بنے بنائے اور طے شدہ راستے سے ہٹا دیا تھا اور اب وہ مکمل نئے سانچے میں ڈھلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لڑکے کی زندگی میں پے در پے ٹھوکریں لکھی تھیں۔

''تمھیں معلوم ہے مسٹر وائٹ نے کیا کہا ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''مسٹر وائٹ کون ہے؟''

''اُف۔ فوہ ایک تو تم کوئی چیز ٹھیک طرح سنتے بھی نہیں۔ میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ مسٹر وائٹ میرے پبلشر کا نام ہے...... ہاں تو مسٹر وائٹ نے کہا کہ انہوں نے گزشتہ دس برسوں میں کسی نئے لکھنے والے کے پہلے ناول میں مشاہدے کی ایسی گہرائی نہیں دیکھی''

''یہ بہت بڑی بات ہے''۔ لڑکے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''پبلشرز صلاحیتیں پہچانتے ہیں''۔

''بس مسٹر وائٹ چاہتے ہیں میں ناول کا نام بدل دوں''

''واقعی؟''

''مستقل بہتی ندی'' انہیں یہ نام پسند نہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کا نام ''پانی'' ہونا چاہیے''

''تم نے کیا جواب دیا''

''میں مان گئی۔ جب مصنف کی پہلی کتاب چھپ رہی ہو تو اسے اپنے پبلشر کے مشورے مان لینے چاہئیں۔ خصوصاً جبکہ وہ ہماری شادی کا خرچ بھی برداشت کر رہے ہیں''

اُس نے بے دلی سے کہا۔ ''یقیناً تم نے بہت اچھا کیا''۔ اور بدستور اپنی پلیٹ پر رکھی ہوئی مچھلی کے قتلے بنانے میں مصروف رہا۔ وہ تمام گفتگو کے دوران اسی طرح سر جھکائے چھری کانٹے سے مشغول رہا تھا۔ اگر وہ کبھی سر اٹھاتا بھی تو محض اس کی خالی الذہنی واضح ہوتی تھی۔

جاپان کے معززین نے مچھلی ختم کر لی تھی اور اب وہ اپنی شکستہ انگریزی اور انتہا کی خوش خلقی کو کام میں لاتے ہوئے ادھیڑ عمر بیرے کو تازہ پھل لانے کو کہہ رہے تھے۔ ان کی پوری گفتگو ''براہِ مہربانی' براہِ مہربانی' شکریہ' شکریہ'' پر مشتمل تھی۔ لڑکی نے جاپانیوں پر نظر ڈالی' پھر مجھے دیکھا اور دوبارہ لڑکے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اُسے اپنے مستقبل کی فکر لاحق تھی میرا جی چاہا کہ میں اُٹھ کر اس کے پاس جاؤں اور اسے سمجھاؤں کہ اپنے پہلے ناول پر مستقبل کی بنیاد رکھنا انتہائی غیر دانش مندی کی بات

ہے۔ میں لڑکے کی ماں کے اعتراض کو حق بجانب سمجھتا تھا کیوں کہ...... شاید...... غالباً میں اس کی ماں کا ہم عمر تھا۔

میں لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے پبلشر کی بات سو فی صد درست کیوں مان رہی ہے؟ پبلشرز بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کی صلاحیتوں کے بارے میں مبالغہ کرنا' عام انسانی کمزوری ہے۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ تمہاری ناول ''پانی'' کا پہلا ایڈیشن پانچ سال میں فروخت ہو جائے گا۔؟ تم خود کو ناکامی کے ان پانچ برسوں میں مستقل مزاجی سے دوسرے ناول پر کام کرنے کا اہل سمجھتی ہو؟ وقت گزرنے کے ساتھ تصنیف کا کام مشکل ہوتا جائے گا...... بہت مشکل ہو جائے گا۔ روزانہ قلم تھام کر کورے کاغذ کا سامنا کرنا بالآخر اعصاب شکن ہو جاتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ تمہاری یہ ''قوتِ مشاہدہ'' بھی کمزور ہو جائے گی۔ جب مصنف چالیس برس کا ہو جاتا ہے تو یہ بات بے معنی ہو جاتی ہے کہ وہ کیا کچھ کرنے کا اہل ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار فقط ان کتابوں پر ہوتا ہے جو وہ اب تک تحریر کر چکا ہوتا ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا اندازہ اس کی کارکردگی سے لگایا جاتا ہے۔ اس کے مستقبل کے منصوبوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

''میرا دوسرا ناول ایک جزیرے کے مکینوں کے بارے میں ہوگا''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم کسی جزیرے پر رہ چکی ہو''

''میں کسی جزیرے پر نہیں رہی۔ لیکن اب رہوں گی۔ ادب میں تازہ نگاہی بہت اہم ہوتی ہے۔ نیا اندازِ فکر اور...... اور باریک بینی۔ میں چھ مہینے کسی جزیرے پر گزاروں گی''۔

''لیکن اس وقت تک ایڈوانس سے اتنی رقم بچی ہوگی کہ ہم......''

''تم ایڈوانس کو ہی سب کچھ کیوں سمجھ رہے ہو؟ پانچ ہزار کی فروخت پر پندرہ فی صد ملے گا۔ اور دس ہزار کے بعد ناول کی قیمت کا بیس فی صد ملنا شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد بیس فی صد مقرر ہے۔ جوں جوں ناول بکتا جائے گا...... اور پہلے ناول کی کامیابی کے بعد دوسرے ناول کا ایڈوانس بہت بڑھ جاتا ہے''۔

''لیکن اگر یہ کامیاب نہ ہوا؟''

''مسٹر وائٹ کہتے ہیں ہو جائے گا اور وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں''

''لیکن میرے چچا مجھے بلاوجہ کسی جزیرے پر جانے کی اجازت نہیں دیں گے''

''تو......؟''

''تو میرا خیال ہے تمہاری جزیرے سے واپسی پر ہماری شادی زیادہ موزوں رہے گی''

لڑکی کے لہجے کی تندی میں تلخی کا عنصر نمایاں ہوگیا ''بات سنو'' اُس نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا ''پانی کی کامیابی کے بعد شاید میں واپس نہ آؤں''

''اوہ!'' لڑکے نے پشت کرسی سے ٹکادی تھی۔

لڑکی نے مجھ پر نظر ڈالی۔ جاپانیوں کے گروہ کو دیکھا اور سر جھکا کر مچھلی کا ایک قتلہ منہ میں ڈالا۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں اپنے دوسرے ناول کا نام ''سبز ہرا'' رکھوں گی''

''لیکن سبز ہرا تو ایک ہی رنگ ہوتا ہے'' لڑکے نے کہا۔

لڑکی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''تم کسی ناول نگار سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتے''

''لیکن تم ابھی ناول نگار نہیں بنی ہو''

''میں پیدائشی ناول نگار ہوں۔ مسٹر وائٹ کہتے ہیں میری قوتِ مشاہدہ......''

''ہاں تم نے بتایا ہے مگر...... مگر تم یہاں...... یہاں لندن میں بھی تو مشاہدہ کر سکتی ہو۔ یہاں بھی کتنی قابلِ دید چیزیں ہیں۔ ضروری ہے کہ جزیرہ......''

''لندن کو میں اپنے پہلے ناول ''پانی'' میں بیان کر چکی ہوں۔ میں بہ حیثیت ناول نگار خود کو دہراؤں گی نہیں...... یہ طے ہے''

لڑکے نے پلیٹ سے بل اٹھایا اس پر درج مجموعی رقم پر ایک نظر ڈالی اور اپنی جیب سے بٹوا نکالنے لگا۔ لڑکی نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ بل میں ادا کروں گی''

''کیوں؟''

''یہ میری خوشی کا دن ہے''

''کس چیز کی خوشی؟''

''اف او! پہلے ناول کی۔ اور کس چیز کی؟ تم احمق نہیں ہو لیکن کبھی کبھی تم مجھے حیران ضرور کر دیتے ہو''

لڑکے نے خاموشی سے بل اس کے حوالے کر دیا۔ اسی لمحے آٹھوں جاپانی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے سامنے رکوع کی حالت میں کھڑے ہو کر بیک وقت رخصتی کے کلمات کی ادائیگی سے ایک سماں پیدا کر رہے تھے۔ پھر وہ قطار بنا کر

روانہ ہو گئے۔

میں نے سر گھمایا تو دیکھا کہ لڑکی اور لڑکا بھی ریستوران سے جانے کی تیاری کر رہے تھے اور لڑکا کرسی کی پشت سے اپنا کوٹ اُٹھا کر پہن رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ لڑکی اپنے پہلے ناول کی مایوس کن فروخت سے دل برداشتہ ہو کر بالآخر اشتہاری فلموں کی ماڈلنگ شروع کر دے گی اور لڑکے کو سُپر اسٹور سے معقول آمدنی ہوتی رہے گی۔ پھر مجھے مسٹر وائٹ کا خیال آیا۔ کسی چھوٹے سے گمنام طباعتی ادارے کے ادھیڑ عمر مالک نے اس خوبصورت لڑکی کے پہلے ناول کے سرورق کے لیے کس قدر مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کیے ہوں گے...... ''اس کی باریک بین نگاہیں سات پردوں کے اندر دیکھ لیتی ہیں۔ اس کا مشاہدہ تہہ کی خبر لاتا ہے'' اور سرورق کی پشت پر وہ اس لڑکی کی تصویر بھی ضرور چھاپے گا۔ کیونکہ رسالوں اور اخباروں کے تبصرہ نگار بھی پبلشرز کی طرح بہرحال انسان ہی ہوتے ہیں...... لیکن جب اس لڑکی کا حسن ڈھل جائے گا تو اسے مشہور ادیبہ نہ بن سکنے پر بہت افسوس ہوتا۔ شدید احساس محرومی...... لیکن...... لیکن اُس وقت میں زندہ نہیں ہوں گا...... مجھے کیا۔ بوڑھے ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی مستقبل کے اندیشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

''معلوم نہیں آج اس ریستوراں میں اتنے جاپانی کیسے جمع ہو گئے'' لڑکے نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

''جاپانی؟ کون سے جاپانی؟ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر وہ ایک دم جھنجھلا گئی۔ ''بعض اوقات مجھے لگتا ہے کہ تم شادی کے موضوع پر بات کرنے سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر خیالی چیزوں کو موضوع گفتگو بنانے کی کوشش کرتے ہو۔ دراصل......'' لڑکی کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ''تم مجھ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتے''۔

☆

گراہم گرین نے ۱۳ اپریل ۱۹۹۹ء کو چھیاسی برس کی عمر میں فرانس کے ایک ساحلی شہر کے چھوٹے سے فلیٹ میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ یہ آنکھیں دنیا کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھیں۔ ہر چند کہ گزشتہ بیس سال سے نیلے رنگ کی ان آنکھوں کو زیادہ تر نیم تاریک خواب گاہ کی دیواریں اور میز پر بکھرے قلم اور کاغذ ہی دیکھنے نصیب ہوئے مگر گرین کا ذہن

ساٹھ برس کی شدید زندگی کے مشاہدات و تجربات سے لبریز تھا۔ وہ جب چاہتا اپنی یادوں کی پٹاری سے کوئی حیران کن واقعہ برآمد کرسکتا تھا۔ عمر بھر کی ریاضت نے اس کی قوت بیان کو بھی یوں صیقل کردیا تھا کہ اب اسے گہرائی میں اترنے کے لیے پرشکوہ الفاظ اور پیچیدہ جملوں کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی ماہر پیراک کی طرح وہ سطح پر ہلچل پیدا کیے بغیر ہلکے سے خم کے ساتھ حسب خواہش اپنا رخ تہ کی سمت کرلیتا تھا۔ اسی باعث چند حلقوں میں یہ تک کہا گیا کہ گرین کے ناول "THE HEART OF THE MATTER" کے ابتدائی سو صفحات جدید ادب کے سو بہترین صفحات ہیں۔

"مشاہدہ" ان کہانیوں میں سے ایک ہے جس کے اختتام پر قاری کے لبوں پر مسکراہٹ کی لرزش پھیل جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ کسی دل چسپ انکشاف کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ عورت اور مرد ازل سے ایک دوسرے پر منکشف ہوتے رہے ہیں۔ اور غالباً یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ دونوں اصناف کے درمیان اب تک اتنی بحث اور الزام تراشی ہوچکی ہے کہ فقط اسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔

گورکی اور چیخوف ایک مرتبہ عورت کے موضوع پر بات کرتے ٹالسٹائی کے پاس پہنچے تو ضعیف العمر ٹالسٹائی یوں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اس کی سفید داڑھی زمین پر لگ رہی تھی۔ وہ دیر تک اسی حالت میں خاموشی سے دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔ بالآخر گورکی نے اس کی رائے دریافت کی تو ٹالسٹائی نے مسکرا کر کہا۔ "عورت کی حقیقت میں اپنی تجہیز و تکفین کے وقت بتاؤں گا' تاکہ جملہ مکمل کرتے ہی میں اپنے تابوت میں داخل ہو کر اسے اندر سے بند کرلوں' اور یوں لوگوں کی بدسلوکی سے بچ جاؤں"۔

گراہم گرین نے "مشاہدہ" میں عورت کے بارے میں کوئی توہین آمیز بات نہیں کی' بلکہ انتہائی دل چسپ انداز میں بتایا ہے کہ شادی یا محبت کا معاملہ بنتِ حوا کے نزدیک اس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ اپنے دیگر تمام جذبات و خواہشات پسِ پشت ڈال دیتی ہے' (اور...... شاید یہ بات درست بھی ہے) لیکن یہ بھی طے ہے کہ علم و فن کا حصول نسلِ انسانی کی بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہیں جبکہ عورت کی کشش اور ترغیب سے کائنات میں انسان کا وجود قائم ہے۔ اس لحاظ سے عورت جبلی طور پر انسانیت کے ارفع ترین مقصد کی جانب بڑھتی ہے۔ جس کے باعث راہ میں آنے والی دیگر تمام چیزیں اس کے لیے نسبتاً غیر

اہم ہو جاتی ہیں یوں حیاتیاتی اعتبار سے روئے زمین پر آدمیت کے فروغ میں عورت کے بنیادی طاقتور اور مرکزی کردار کے مقابلے میں مرد کا کردار کمزور اور ثانوی ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے ول ڈیوراں نے کہا تھا کہ تسخیرِ فطرت کے بعد آدمی بالآخر پلٹ کر اپنی جانب دیکھے گا۔ اس طرح نفسیات آدمی کا آخری تحقیقاتی مضمون ثابت ہوگا' اور اس آخری مضمون کا آخری موضوع عورت ہوگی۔

ارنسٹ ہمینگوے

روشن گاہ

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کیفے تقریباً خالی ہوگیا تھا۔ صرف ایک بوڑھا گاہک اب تک برآمدے میں بیٹھا تھا۔ برآمدے کے درخت کے اوپر بجلی کا بلب تھا جس کی روشنی سے بننے والے پتوں کے سائے بوڑھے کے وجود پر پھیلے تھے۔ دن کے وقت برآمدے اور سڑک پر دھول منڈلاتی تھی لیکن رات کو اوس کے سبب' گھاس اور پودے نم آلود ہوگئے تھے اور بوڑھا صاف فضا میں دیر تک بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ کیفے کے اندر موجود دونوں ویٹرز جانتے تھے کہ بوڑھا نشے میں ہے اور انہیں ڈر تھا کہ اگر اسے زیادہ نشہ چڑھ گیا تو وہ بغیر بل ادا کیے چل دے گا۔ یوں تو بوڑھا اچھا گاہک تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ مدہوشی میں وہ کیا کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ویٹرز اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

''گزشتہ ہفتے اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی'' ایک ویٹر نے کہا۔

''کیوں؟'' دوسرے نے پوچھا

''کوئی وجہ نہیں تھی''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''یہ بہت دولت مند ہے'' پہلا ویٹر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

دونوں ویٹرز دروازے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے اور مستقل برآمدے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ بوڑھا پتوں کے سائے تلے بیٹھا تھا اور پتے ہوا کے ساتھ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

بوڑھے نے اپنا خالی گلاس' میز سے ٹکرایا۔

نوجوان ویٹر اس کی بات سننے پتوں کے سائے میں چلا گیا۔

''کیا چاہیے؟''

بوڑھا کچھ دیر ویٹر کو دیکھتا رہا۔ ''ایک اور...... برانڈی''

’’تمھیں نشہ چڑھ جائے گا‘‘۔ ویٹر نے کہا۔

بوڑھا بدستور اُسے دیکھتا رہا۔ ویٹر کیفے کے اندر چلا گیا۔

’’لگتا ہے ساری رات بیٹھے گا‘‘ وہ اپنے ساتھی کے پاس پہنچ کر بڑبڑایا۔ ’’مجھے تین بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوتا۔ کم بخت خودکشی میں کامیاب ہو جاتا تو اچھا تھا‘‘

ویٹر نے بڑبڑاتے ہوئے برانڈی کی بوتل اٹھائی اور کیفے سے نکل کر ایک مرتبہ پھر پتوں کے سائے میں پہنچا۔ اُس نے برانڈی سے بوڑھے کا گلاس بھر دیا۔

’’تم خود کو مار ہی لیتے تو اچھا تھا‘‘۔ ویٹر نے آہستہ سے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ بوڑھا اونچا سنتا ہے۔

’’......اور ڈالو‘ بوڑھے نے اپنی بات واضح کرنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

اس مرتبہ ویٹر نے گلاس اتنا بھر دیا کہ تھوڑی سے برانڈی گلاس سے چھلک کر میز کی سطح داغ دار کر گئی۔

’’شکریہ‘ بوڑھے نے بغیر سر اٹھائے کہا۔

ویٹر کیفے میں واپس چلا گیا۔ وہ برانڈی کی بوتل الماری میں رکھ کر دوبارہ اپنے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔

’’اب وہ نشے میں ہے‘‘ اس نے کہا۔

’’وہ ہر رات نشے میں ہوتا ہے‘‘۔

’’اس نے خود کو مارنا کیوں چاہا تھا‘‘۔

’’مجھے کیا معلوم‘‘۔

’’طریقہ کیا تھا‘‘۔

’’گردن میں رسّی ڈال کر‘‘۔

’’بچا کیسے‘‘۔

’’اُس کی بھانجی پہنچ گئی تھی‘‘۔

’’اس کے پاس پیسے کتنے ہیں‘‘۔

’’بہت‘‘۔

’’اسی سال کا تو ہو گا‘‘۔

''تب تو ہونا چاہیے''۔

''کاش اب یہ گھر چلا جائے۔ میں تین بجے سے پہلے نہیں سو پاتا۔ کیا مصیبت ہے؟''۔

''اس کو جاگنا پسند ہے''۔

''یہ اکیلا رہتا ہے۔ لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری بیوی میرا انتظار کرتی ہے''۔

''ایک زمانے میں اس کی بھی بیوی تھی''۔

''اب اس کی بیوی ہوتی بھی تو اس کا کیا کر سکتی تھی''۔

''کیا کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے بیوی کے ساتھ یہ خوش رہتا''۔

''اس کی بھانجی تو ہے۔ جس نے اُسے بچایا تھا''۔

''ہاں''۔

''میں کبھی بھی اتنا بوڑھا نہیں ہونا چاہوں گا۔ بوڑھا آدمی ایک مصیبت ہوتا ہے''۔

''سب کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صاف ستھرا بوڑھا ہے۔ دیکھو اس وقت نشے میں ہے لیکن پھر سر جھکائے بغیر چھلکائے پی رہا ہے۔ دیکھو''۔

''دیکھ رہا ہوں۔ کاش یہ اب گھر جائے۔ اسے کسی کا خیال نہیں ہے''۔

بوڑھے نے سر اٹھایا اور کیفے کے اندرونی حصے کی طرف دیکھا۔ دونوں ویٹرز ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان تھا۔ دوسرے کی عمر ڈھل رہی تھی۔

بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر میز پر گلاس بجایا۔ ''برانڈی...... ایک اور'' اس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا''

گھر جانے کے لیے بے چین ویٹر اُس کے پاس آیا۔

''ختم'' اس نے نشے میں دھت بوڑھے کو سمجھانے کے لیے جملوں کی بجائے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بند۔ بس''۔

''...... ایک اور'' بوڑھے نے دہرایا۔

''ختم۔ بس'' ویٹر نے گلاس اٹھا کر میز کی سطح گیلے کپڑے سے پونچھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

بوڑھا کھڑا ہو گیا۔ جیب سے چمڑے کا بٹوا نکال کر اُس نے لہراتے جسم کے ساتھ پیسے گنے بل ادا کیا اور ایک چھوٹا نوٹ بخشش کے طور پر الگ سے ویٹر کے ہاتھ میں رکھ کر باہر کی جانب چل دیا۔

ویٹر اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لڑکھڑانے کے باوجود اعتماد سے چلتا بوڑھا آدمی۔ ضعیف اور

اکیلا' مگر باوقار۔
''تم نے اسے مزید کچھ دیر کیوں نہیں ٹھہرنے دیا؟'' ادھیڑ عمر ویٹر نے نوجوان ویٹر سے پوچھا۔
''ابھی ڈھائی نہیں بجے ہیں''۔
''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ اپنے بستر پر''۔
ایک گھنٹہ کیا ہوتا ہے؟''۔
''اس کے لیے کچھ نہیں ہے میرے لیے بہت ہے''۔
''ایک گھنٹہ تو ایک گھنٹہ ہی ہوتا ہے''۔
''تم خود بوڑھے آدمیوں کی طرح بات کرتے ہو''۔ نوعمر ویٹر چڑ کر بولا۔'' اسے اتنا ہی شوق ہے تو بوتل خرید کر گھر لے جائے' اور صبح تک پیے۔ ایک ہی بات ہے۔''
''ایک ہی بات تو نہیں ہے''۔
''ہاں فرق تو ہے'' شادی شدہ ویٹر نے خود اپنی ہی بات کی مخالفت میں سر ہلایا۔ وہ غلط بات پر اصرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف جلدی میں تھا۔
''تمھیں وقت سے پہلے گھر پہنچنے پر کسی ناخوش گوار بات کا خدشہ نہیں ہوتا''
''تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔'' نوجوان سنجیدہ ہو گیا۔
''نہیں۔ نہیں'' ادھیڑ عمر ویٹر نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔'' مذاق کر رہا ہوں یقین کرو۔ محض مذاق''۔
''مجھے کسی ناخوش گوار بات کا ڈر نہیں''۔ نوعمر ویٹر کیفے کے دروازے بند کرتے ہوئے بولا۔'' مجھے اعتماد ہے میرا وجود اعتماد کی مٹی سے بنا ہے''۔
''تمہارے پاس نوجوانی ہے۔ اعتماد ہے۔ نوکری ہے''۔ ادھیڑ عمر ویٹر نے ٹھنڈی سانس بھری۔
''تمہارے پاس ہر چیز ہے''۔
''تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟''۔
''سوائے نوکری کے' ہر چیز کی...... میں کبھی بھی پر اعتماد نہیں رہا۔ اور اب میں نوجوان بھی نہیں ہوں''
چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔
''......میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ہوٹلوں میں دیر تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔'' ڈھلتی عمر والے ویٹر کی نظریں خلا میں گڑ گئیں۔'' وہ لوگ جو بستر پر نہیں جانا چاہتے۔ جنہیں رات کے وقت صاف

ستھری اور روشن جگہوں کی تلاش ہوتی ہے"۔
"میں تو گھر جا کر سونا چاہتا ہوں" چھوٹا اکتاہٹ سے بولا۔
"ہم دو مختلف لوگ ہیں...... اور یہ صرف نوجوانی اور اعتماد کی کمی کے باعث نہیں ہے۔ میں ہر رات کیفے بند کرنے سے پہلے سوچتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی کیفے میں بیٹھنے آئے اور اُسے مایوسی ہو"
"لیکن پچھلی گلیوں کے شراب خانے تو رات بھر کھلے رہتے ہیں"
"تم سمجھ نہیں رہے۔ پچھلی گلی کے شراب خانے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ایک صاف ستھرا اور روشن کیفے ہے۔ اس طرح کی جگہ رات کے اندھیرے اور تنہائی میں بہت خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر ایسے وقت جب پتوں کے سائے پڑ رہے ہوں۔
"شب بخیر" چھوٹے نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔
"شب بخیر" بڑے نے جواب دیا۔ بتیاں بجھانے کے دوران وہ مستقل خود کلامی کرتا رہا" اصل چیز تو روشنی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جگہ صاف ستھری ہو۔ موسیقی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موسیقی کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ پچھلی گلیوں کے شراب خانوں میں تو آدمی صحیح انداز میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ رات بھر وہی کھلے رہتے ہیں"۔
وہ کس چیز سے ڈر رہا تھا؟ نہیں اسے ڈرنا نہیں کہہ سکتے۔ یہ خوف نہیں تھا۔ یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی کچھ بھی نہیں تھا۔ آدمی خود بھی کچھ نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اور صرف روشنی کی ضرورت تھی۔ روشنی کی اور تھوڑی سی صفائی اور سلیقے کی۔ کچھ ناروا میں رہتے تھے' لیکن اسے محسوس نہیں کرتے تھے' مگر وہ جانتا تھا یہ سب ناروا ہے۔ ناروا خالص ناروا۔ ہمارا ناروا جو ناروا میں ہیں۔ ناروا کی قسم' ناروا کی بستی میں ناروا ہوگا۔ جیسا کہ ناورا میں ہے۔ ہمیں ناروا دو۔ ہمارا روزانہ کا ناروا۔ اور ہمیں ناروا سے ناروا تک بہل کرو۔ اور ناروا میں ناروا کا عمل روک کر ناروا سے نجات دلاؤ کہ ہم ناروا سے الگ ہو کر ناروا سے ایک ہو سکیں۔ قائم رہے کچھ بھی نہیں کہ جو بھرا ہوا ہے کچھ بھی نہیں سے' اور رہے گا تیرے ساتھ ہمیشہ کچھ بھی نہیں۔
وہ مسکرایا اور اُس شراب خانے میں داخل ہو گیا۔ جہاں کافی کی مشین نصب تھی۔
"کیا چاہیے؟ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے شخص نے پوچھا۔
"ناروا۔ ایک پیالہ"
بار مین نے اسے حیرت سے دیکھا اور اُس کے لیے کافی اُنڈیلی۔

"یہاں روشنی تو مناسب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن دیواروں کو سلیقے سے سجایا نہیں گیا۔ اور صفائی"

بارمین اُس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اتنی رات گئے' نئے موضوع پر گفتگو کا آغاز بے معنی تھا۔

"کچھ اور چاہیے؟" بارمین نے پوچھا۔

"نہیں ۔شکریہ" ویٹر نے کہا اور کافی ختم کر کے خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ اُسے پچھلی گلیوں کے شراب خانے یوں بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ کسی روشن اور صاف ستھری جگہ کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اب وہ مزید کچھ سوچے بغیر اپنے گھر جائے گا' بستر پر دراز ہوگا' اور صبح کی روشنی کے ساتھ آنکھیں موندنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

"مجھے بے خوابی کی شکایت ہے"۔ اُس نے خود کو یقین دلایا۔ "اکثر لوگوں کو یہ مرض ہوتا ہے"۔

☆

ہم ساری زندگی ایک ٹھنڈے ہوتے سیارے کی سطح پر چلتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے قدموں تلے کیا ہے؟ کسی کسی کو یہ خیال آتا ہے اور وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک جاتا ہے' اور پھر تیزی سے گفتگو کرنے لگتا ہے انکشاف کے اس لمحے میں وہ پانی کی سطح پر جمی کائی سے لے کر اشرف المخلوقات کے شعور تک جست لگاتا ہے' اور ساری عمر کے لیے اپنا درجۂ حرارت اور دل کی دھڑکن بڑھا لیتا ہے۔ چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کشف سے گزر کر گفتگو نہیں کرتے بلکہ چونک کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

سکوت' اولیاً کی وراثت ہے۔ مکالمہ' فلسفیوں اور ادیبوں کا پیشہ ہے۔ ارنسٹ ہمینگوے اپنے پیشے کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا' اس لیے وہ ریاست ہائے متحدہ کی خیرہ کن روشنیوں اور "پاپا ہمینگوے" کے بزرگانہ دبدبے کے ساتھ بھی ادب کے بڑوں کے گروہ میں شامل نہیں ہو سکا۔ اس کی یک سطحی تحریروں میں گہرائیاں تلاش کی گئیں۔ "سمندر اور بوڑھا" کو عظیم ناول ثابت کیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تقریباً بچکانہ خودکشی کو بھی کائنات گیر تناظر میں دیکھا اور دکھایا گیا مگر ہمینگوے' خصوصی ادبی صلاحیتوں کا حامل نہیں تھا۔ اس لیے اپنے تمام جنگی تجربے اور خون ریز کھیلوں کے ذاتی مشاہدے کے باوجود اسے بالآخر بحیثیتِ مجموعی دوسرے درجے کا ادیب قرار دیا جائے گا۔

۱۹۵۴ء کا نوبل انعام حاصل کرنے والا ادیب' اپنی تحریروں میں کہیں بھی نفس و آفاق کا گہرا ربط یا شدید تصادم نہیں دکھا پاتا۔ افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی وہ کوئی وسیع منظر تخلیق کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

عظیم ادب' مشاہدے اور مراقبے کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے اور کسرتی بدن والے اس مہم جو ادیب کا ذہنی افق اتنا وسیع نہیں تھا کہ وہ زندگی میں ایک بار پھر پانی کی سطح پر جمی کائی سے لے کر اشرف المخلوقات کے شعور تک جست لگاتا...... ارنسٹ ہیمنگوے' مراقبے کی صفت سے محروم تھا۔

''روشن گاہ'' ہیمنگوے کی غالباً واحد کہانی ہے' جس میں وہ قاری کے دل پر دستک دینے میں کامیاب ہوا ہے۔

جان ٹونڈر

مکڑی

وکٹر نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولتے ہی اپنی نئی نویلی دلہن کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ ماریا کو اسی حالت میں لئے حجلۂ عروسی میں داخل ہونا چاہتا تھا''......زندگی کا بیمہ دوراندیشی کی علامت ہے''۔ وکٹر نے آواز آئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک انشورنس ایجنٹ جھاڑیوں سے نمودار ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ چکا تھا''......زندگی کا بیمہ......آپ نہیں چاہتے کہ......'' ماریا نے قہقہہ لگایا۔ وکٹر کو بھی ہنسی آ گئی۔ ایسے موقع پر دولہا کو بیمہ بیچنے کی کوشش کرنا نہایت مضحکہ خیز بات تھی۔ ''نہیں'' وکٹر نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنا کندھا یوں آگے جھکایا کہ انشورنس ایجنٹ کا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر پھسل گیا۔

''یہ بہت ضروری ہے'' ایجنٹ نے اصرار کیا۔ ''میرا کارڈ رکھ لیں۔ آپ جب چاہیں مجھے بلا سکتے ہیں''۔

وکٹر کے ہاتھ خالی نہ ہونے کے باعث ایجنٹ نے اپنا کارڈ اُس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ پھر وہ وکٹر اور اُس کی بیوی کو قہقہے لگاتے، شہر کے مضافات میں واقع اس خوبصورت اور خاموش گھر میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔

انہوں نے کمرے میں آنے کے بعد ایجنٹ کے قدموں کی چاپ کو مدھم ہوتے سنا۔ یکلخت وہ سناٹے کے احساس پر غالب آ گئی۔ کچھ دیر بعد دن کی روشنی شام کے دھندلکے میں تبدیل ہونے لگی۔ پھر شام کا دھندلکا رات کی سیاہی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ ایک اور دن اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ انہیں ایک دوسرے سے محبت تھی اور آج وہ مذہب اور ملک کے ضابطے اور قانون کے مطابق عمر بھر کے ساتھی بن گئے تھے۔

ایک بے نام سی گونج سے وکٹر کی آنکھ کھل گئی۔ کمرہ نیم تاریک تھا۔ کچھ دیر تک وکٹر کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس لمحے صبح ہے یا شام...... ماریا اس کے کندھے پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ نیند میں مزید دل کش ہو گیا تھا اور اس کا منہ گہری نیند میں سوئے ہوئے بچے کی طرح ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ وکٹر کو ماریا کی معصومیت پر پیار آ گیا' اور وہ بے اختیار اُس کی کمر سہلانے

لگا۔
مگر گونج بڑھتی گئی۔ عجیب آواز تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچہ ڈھول پر بے تکے انداز میں ہاتھ مار رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں اس آواز کی لہروں سے کھڑکی کے شیشے بجنے لگے۔ ماریا کے پرسکون نقوش پر بے چینی کی موہوم سی شکنیں پڑنے لگیں۔
"کون ہے؟" وکٹر نے کھڑکی کھول کر آواز لگائی۔
"مچھلی والا! مچھلی چاہیے؟" کہیں نزدیک سے جواب آیا۔
"اوہ نہیں۔ آگے بڑھو" وکٹر جھنجھلا گیا۔
گونج مدہم پڑنے لگی۔ وکٹر کچھ دیر تک کھڑکی سے جھانک کر سمتوں کا اندازہ کرتا رہا۔ وہ واپس پلٹا تو ماریا بستر پر بیٹھی آنکھیں جھپک رہی تھی۔
"کون تھا؟" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"مچھلی والا"
ماریا بے اختیار ہنسنے لگی
"کچھ خریدا؟"
"مجھے مچھلی پسند نہیں ہے" وکٹر نے جواب دیا۔
وہ دونوں اب تک شب عروسی کی خواب ناک فضا میں گم تھے مگر مچھلی والے کی آمد انہیں عجیب انداز میں حقیقی دنیا میں واپس لے آئی تھی۔ وکٹر نے گھڑی دیکھ کر ماریا کو وقت بتایا' اور بستر کے قریب پڑی پھلوں کی ٹوکری سے سیب نکال کر چھری سے کاٹ کر کھانے لگا۔ اس دن کے بعد ان کے شب و روز دوسرے تمام لوگوں کی طرح یکساں انداز میں گزرنے لگے۔
کچھ دنوں بعد وکٹر کو خیال آیا کہ اب اُسے اپنا کام دوبارہ شروع کر دینا چاہیے۔
"لیکن تمھیں کام کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے"۔ ماریا نے کہا
"یہ معاملہ ہم نے شادی سے پہلے ہی طے کر لیا تھا" وکٹر نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔
ماریا کی اتنی آمدنی تھی کہ وہ دونوں آرام سے اس میں گزارا کر سکتے تھے' مگر وکٹر کو کام کرنا پسند تھا۔ اور یہ بات اُس نے ماریا کو ابتدا ہی میں سمجھا دی تھی۔
"تمہارا کام ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا" ماریا نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا اور وکٹر کو ایک مرتبہ پھر اُس پر بے تحاشا پیار آیا۔ اُس نے ماریا کو گلے سے لگا کر اسے محبت بھری

سرگوشیوں میں تسلی دی۔ دوسری صبح جب وہ گھر سے روانہ ہو رہا تھا تو ماریا نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

وکٹر شادی شدہ زندگی کی ابتدائی مصروفیات اور خوشیوں میں اس قدر گم تھا کہ اُسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ماریا کا رنگ زرد پڑتا جا رہا ہے۔ اور اب اُس کے بازوؤں میں وکٹر کو سمیٹنے کے لیے پہلے جیسی طاقت اور گرمجوشی نہیں تھی۔

''کیا بات ہے؟'' بالآخر ایک دن وہ ماریا کا چہرہ بغور دیکھنے پر چونک گیا۔ ''تمہاری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں اور...... اور تم اس قدر تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ تمھیں کوئی چیز پریشان کر رہی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کچھ بھی نہیں...... کیا بات ہو سکتی ہے؟'' ماریا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے تم پر تنہائی اثر انداز ہو رہی ہے تم کہو تو......'' وکٹر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ماریا کی تنہائی کیسے دور کر سکتا ہے۔ ''تم کہو تو...... میں اپنا کتا یہاں منگوا لوں۔ پالتو جانور بھی گھر کے ایک فرد کی طرح ہوتا ہے''

''نہیں'' ماریا کانپ گئی۔ ''مجھے کتے بالکل پسند نہیں ہیں۔ مجھے کتوں سے ڈر لگتا ہے اور پھر تنہائی میرا مسئلہ نہیں ہے''۔

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''۔

''یوں ہی...... معمولی سی چیز ہے''۔

''پھر بھی...... بتاؤ تو سہی''۔

''پہلے وعدہ کرو تم ہنسو گے نہیں''۔

''وعدہ''۔

''گھر میں ایک مکڑی ہے''۔

''مکڑی؟؟'' اگر وکٹر کو بر وقت اپنا وعدہ یاد نہ آجاتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتا۔ ''یہاں ایک سے زیادہ مکڑیاں ہوں گی'' وہ بہ مشکل ہنسی روکتے ہوئے بولا۔ ''یہ مضافاتی علاقہ ہے۔ تم بڑے شہر کی رہنے والی ہو''۔

''مجھے معلوم ہے۔ مگر یہ عام مکڑی نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے۔ اتنی'' ماریا نے وکٹر کو اپنے ہاتھ کی انگلی دکھائی۔ ''اور سارے کمرے میں دوڑتی پھرتی ہے...... اس قدر تیز''۔

اُس لمحہ وکٹر کو اپنی بیوی سے اُلجھن سی محسوس ہوئی۔ مکڑی سے اتنا زیادہ خوف زدہ ہو جانا غیر فطری تھا۔ اور پھر اسے اُس کا کتا بھی نہیں منگوانے دے رہی تھی۔ وکٹر کو اس نئے گھر میں ''ٹیری'' بہت یاد آتا تھا۔ وہ وکٹر سے اس قدر مانوس تھا کہ صبح کے وقت اخبار منہ میں دبائے اس کے بستر پر آ جاتا تھا۔ اور اگر کبھی وکٹر اپنا بٹوا یا پائپ وغیرہ بھول جاتا تو وہ اس کی فراموش کردہ چیزیں اسے گیٹ پر پہنچا دیتا تھا۔

رات کو وکٹر نے ماریا سے دن کے واقعات کے بارے میں بات کرنی چاہی مگر اس وقت تک وہ بہت تھک چکا تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک ہر چیز معمول کے مطابق ہوتی رہی۔ سوائے یہ کہ ایک مرتبہ رات کے کھانے میں مچھلی دیکھ کر اُس نے ماریا کو یاد دلایا کہ اُسے مچھلی ناپسند ہے تو اسے ماریا نے بتایا کہ مچھلی والا اُس کی عدم موجودگی میں آیا تھا اور اصرار کر کے مچھلی بیچ گیا تھا۔ اُس رات سونے سے قبل وکٹر نے ایک بار پھر ماریا کی زرد پڑتی رنگت پر تشویش کا اظہار کیا'' کیا واقعی تمھیں مکڑی اتنا پریشان کر رہی ہے؟''

''ہاں''۔ مکڑی کا ذکر کرتے ہی ماریا کا سانس ناہموار ہو گیا'' اتنی بڑی ہے......اتنی'' اس بار ماریا نے انگلی میں ہتھیلی کا کچھ حصہ بھی شامل کر دیا۔'' اور سارے کمرے میں دوڑتی پھرتی ہے اُس کی ٹانگیں۔ خدایا! بال ہی بال۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔ اُف!''

اُس دن کے بعد جب بھی ماریا نے مکڑی کا ذکر کیا وکٹر کو اپنی بیوی سے کراہت محسوس ہوئی۔ بالآخر تنگ آ کر اُس نے سارے گھر میں ایک طاقتور کیڑے مار دوا چھڑک دی۔ لیکن کچھ ہی دن بعد اُس نے ایک شام کام سے واپسی پر ماریا کو دروازے پر کھڑے زاروقطار روتے دیکھا تو وہ چڑ گیا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟''

''میں نے اُسے پھر دیکھا ہے''۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی'' اور وہ بڑی ہو رہی ہے مستقل بڑی ہو رہی ہے۔''

''بکواس'' وکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

''اندر مت جانا۔ خدا کے لیے اس گھر سے دور رہو۔'' وہ وکٹر کے سینے پر سر رکھ کر لرزنے لگی۔'' کوئی دوسرا گھر دیکھتے ہیں۔ میری بات مانو اس منحوس کو یہیں چھوڑ دو''

''ہوش میں آؤ!'' اُس نے ماریا کا سر اٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔'' کوئی مکڑی

کے خوف سے گھر چھوڑتا ہے؟ احمق"

وکٹر نے کمرے کا ایک ایک کونا چھان مارا' مگر اسے کہیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ آخر کار اُس نے دروازہ کھول کر ماریا کو بھی اندر کھینچ لیا۔ "بہت ہوگیا" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں اپنا کتا منگوار ہا ہوں۔ ٹیری بہت ذہین اور دلیر جانور ہے۔ اول تو یہ تمہارا وہم ہے لیکن اگر یہاں کوئی اس طرح کی مکڑی ہے بھی تو ٹیری اسے ایک دن میں ختم کر دے گا۔ اور تم بھی اُس کی عادی ہو جاؤ گی۔ وہ تمہاری تنہائی کا ساتھی بن جائے گا"

اگر وکٹر کو اگلے چند دنوں میں اس قدر کام نہ ہوتا تو وہ ٹیری کو لینے خود جاتا لیکن مصروفیت کے باعث اُس نے اپنے دفتر کے آدمی کو اس کام پر مامور کر دیا۔

وکٹر ایک ہفتے کا دورہ مکمل کر کے گھر لوٹا تو ماریا رات کے کھانے پر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ مزید زرد ہو چکا تھا۔ اور پورے گھر میں مچھلی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کھانے کی میز پر تلی ہوئی مچھلی دیکھ کر وکٹر کو متلاہٹ ہونے لگی۔

"کتا کہاں ہے؟" وکٹر نے پوچھا۔

"وہ تو مصیبت بن گیا تھا۔" ماریا نے جواب دیا' اور سر جھکائے مچھلی کے قتلے بنانے میں مصروف رہی۔

"وہ ہے کہاں"۔

"مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ ہنگامہ۔ مجھے لگتا تھا میں پاگل ہو جاؤں گی"۔

"پھر؟" یکلخت وکٹر کی آواز بہت بلند ہوگئی۔ "تم نے کیا کیا؟"۔

"پھر مچھلی والا آ گیا۔ میں نے کہا وقتی طور پر تم رکھ لو۔ ابھی تو اسی کے پاس ہے"۔

"پاگل عورت!" وکٹر نے سسکاری بھری۔

"آجائے گا" وہ گھبرا گئی۔ "مچھلی والے نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے واپس لے آئے گا۔ اب تم آ گئے ہو تو بے شک آجائے۔ میں اُس کے ساتھ اکیلی نہیں رہ سکتی تھی"۔

"تم صرف اپنی مکڑی کے ساتھ اکیلی رہ سکتی ہو" وکٹر کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

ماریا نے نفی میں سر ہلایا۔ "مکڑی چلی گئی ہے" اس نے اطمینان سے کہا۔

اگلے چند دن وکٹر صبح و شام مچھلی والے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس نے آس پاس کے ہر دروازے پر دستک دی۔ ہر دکاندار سے دریافت کیا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ مچھلی والا کب

اور کہاں سے آتا ہے۔اور کس طرف کو چلا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ ماریا اور وکٹر کے تعلقات کی ابتدائی گرم جوشی ماند پڑ گئی۔اب وہ ایک خاموش مفاہمت کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔ ماریا تشویش ناک حد تک کمزور ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں کے حلقے مزید گہرے ہوتے جا رہے تھے۔وکٹر نے کئی بار ماریا سے اس کی بگڑتی ہوئی صحت کا سبب دریافت کرنا چاہا' مگر ہر مرتبہ اس کی سرد مہری سے چڑ کر خاموش ہو گیا۔ایک صبح وکٹر کی آنکھوں میں بے خوابی کے سرخ ڈورے تھے اور اس کی آواز میں شدید بیزاری تھی''تم گھر کی صفائی سے بے خبر ہوتی جا رہی ہو'' اس نے ماریا کے جاگتے ہی کہا''بستر میں کھٹمل پیدا ہو گئے ہیں''۔

''ناممکن!'' ماریا نے لاپروائی سے کہا۔

''میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' وکٹر جھنجلا گیا۔''مجھے ساری رات کھٹملوں نے کاٹا ہے۔

''کہاں کاٹا؟ دکھاؤ''۔

وکٹر نے قمیض اوپر اٹھائی۔بدن پر کوئی نشان نہیں تھا۔

''تم لڑنے کا بہانہ کیوں ڈھونڈ۔تے ہو؟''۔

وکٹر خاموش ہو گیا اسے کھٹملوں کا کاٹنا واضح طور پر یاد تھا مگر جسم پر کوئی علامت نہ ہونے کے باعث وہ لاجواب ہو گیا تھا اس دن کے بعد بھی وہ کئی بار رات کے وقت کیڑوں کے کاٹنے سے بے چین ہوا۔لیکن ہر مرتبہ اسے اپنے جسم پر نشان تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی۔تنگ آ کر اس نے رات بھر جاگ کر اندھیرے کی مخلوق کو موقع پر پکڑنے کا منصوبہ بنایا۔

آدھی رات تک وہ آنکھیں کھولے لیٹا رہا' کھڑکی کے شیشے سے آنے والی چاندنی سے کمرے کا فرنیچر چمک رہا تھا۔کچھ دیر میں وکٹر کے پہلو میں سوئی ہوئی عورت کا چہرہ بھی چاند کی کرنوں سے جگمگانے لگا۔ایک وقت تھا کہ اسے ماریا کا نیند میں کھلا ہوا منہ دل کش لگتا تھا۔مگر آج اس کا یہی انداز وکٹر کی پیشانی پر شکنیں ڈال رہا تھا۔صبح کے قریب کسی لمحے اس کی آنکھ لگ گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ کسی نوکیلی چیز کی چبھن سے جاگ گیا۔اس کے بدن کی اچانک حرکت سے خون چوسنے والی بلا نے اس کی کھال میں گڑے اپنے دانت نکال لیے۔اور ایک سمت کو بھاگ پڑی۔اس پر نظر پڑتے ہی وکٹر سکتے میں آ گیا۔اس کا رنگ سیاہ تھا۔اور وہ بستر پر پائے جانے والے عام کیڑوں سے بہت بڑی اور مختلف تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ وکٹر کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

حواس بحال ہونے پر اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ ایک بھیانک سپنا تھا۔رات بھر جاگتے

رہنے کے سبب اسے خواب اور خیال کے درمیان کہیں ایک ایسا کیڑا دکھائی دیا تھا جو درحقیقت میں کہیں وجود نہیں رکھتا ہے۔ اس منطقی نتیجے کے باوجود دن بھر وکٹر کے اعصاب چٹختے رہے اور اس کے تصور میں بار بار وہ مکروہ شکل اُبھرتی رہی جس سے اس کا بدن ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گیا۔ بالآخر اس نے ارادہ کیا کہ اب وہ ہر حال میں صبح تک جاگتا رہے گا اور یوں خود کو اس اذیت ناک واہمے سے نجات دلائے گا۔

اس روز بستر پر جا کر اس کو احساس ہوا کہ اگر وہ چاہتا بھی تو صبح تک پلک نہیں جھپک سکتا تھا۔ گزشتہ رات کے واقعے نے اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رات گئے جب چاند کی کرنیں کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کے اضطراب میں کچھ کمی ہوئی۔ تاریکی آہستہ آہستہ ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اور بستر کے ساتھ رکھا لیمپ روشن کرنے سے ماریا کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات دردناک حد تک خاموش تھی۔ وقفے وقفے سے دور کہیں کوئی کتا بھونکتا تو اس کی آواز اچھی لگتی تھی۔ چاند کے علاوہ کوئی چیز حرکت نہیں کر رہی تھی۔

چاند کی حرکت کا اندازہ فرنیچر اور بستر پر پھیلتے سمٹتے سایوں سے ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ چاندنی ماریا کے بالوں اور سینے کو روشن کرتی اس کے چہرے تک آ گئی کچھ دیر قبل ماریا کا چہرہ مکمل تاریکی میں تھا مگر اب وہ اتنا واضح ہو گیا تھا کہ اس کا ہلکا سا کھلا ہوا منہ اندر تک دیکھا جا سکتا تھا وکٹر نے جھرجھری لے کر اِدھر اُدھر دیکھنا چاہا مگر کمرے کی کوئی اور چیز اس کی توجہ مبذول نہیں کر سکی۔ اچانک وکٹر کو ماریا کے منہ میں کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی۔ "یہ سوتے میں زبان بھی نکالتی ہے"۔ اس نے کراہت سے سوچا' لیکن فوراً ہی اس کی آنکھیں اُبل پڑیں ماریا کے منہ سے باہر آنے والی چیز اس کی زبان نہیں تھی۔

بل کھائے ہوئے سیاہ دھاگے جیسی کوئی چیز اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کے کونے سے باہر نکل کر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد دوسرے کونے سے ایک اور سیاہ دھاگا نمودار ہوا اور پھر آہستہ آہستہ دونوں دھاگوں کے درمیان سے ایک ٹھوس سیاہ چیز جھانکنے لگی وکٹر نے چیخ ماری اور بے اختیار اس کا الٹا ہاتھ ماریا کے ہونٹوں کو خون آلود کر گیا۔ ماریا لرزہ خیز آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھی اور پھر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وکٹر کو دیکھنے لگی۔ سیاہ رنگ کا عجوبہ غائب ہو چکا تھا۔ لیکن ماریا کے چہرے پر وکٹر کی انگلیوں کے نشانات تھے "مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف کر دو" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

وہ ماریا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کیا کہے" میں ایک خواب دیکھ رہا تھا...... اتنا عجیب۔ اتنا بھیانک...... اس دوران...... خدایا...... مجھے معاف کر دو"۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے الماری کھولی' اور ایک شیشی سے بہت سی نیند کی گولیاں نکال کر حلق میں انڈیل لیں۔ اس کے بعد وہ صبح تک بے ہوشی کی نیند سویا رہا۔

دوسرے دن شام تک اسے ماریا پر ترس آتا رہا اس نے اپنے واہموں اور وسوسوں سے مغلوب ہو کر ماریا کو جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ اپنی بدسلوکی کی تلافی کرنے کے لیے وہ سارا دن ماریا سے مصنوعی پیار کا اظہار کرتا رہا۔ ماریا نے بھی اس دن گھر کی صفائی پر بطورِ خاص توجہ دی۔ وہ بھی روز روز کی غلط فہمیوں اور الزام تراشیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

شام کے وقت ماریا نے ڈرائی کلینک کے لیے بھیجے جانے والے اس کے کپڑوں کی جیبوں سے نکلنے والی کئی دنوں کی بھولی بسری چیزیں اس کے حوالے کیں تو وہ ایک ایک کر کے تمام چیزیں کوڑے کے ڈبے میں پھینکتا گیا' لیکن انشورنس ایجنٹ کا کارڈ ہاتھ میں آنے پر وہ ٹھٹک گیا۔ اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے وہ کارڈ واپس جیب میں ڈال لیا۔ بستر پر جانے سے قبل اس نے ایجنٹ کو خط تحریر کیا۔ جس میں اُسے اطلاع دی کہ وہ اپنی بیوی ماریا کی زندگی کا بیمہ کرانا چاہتا ہے۔

اس رات جب کسی چیز نے اس کی جلد میں دانت اُتارے تو اس نے جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھنے کی بجائے آنکھیں کھول کر دھیرے دھیرے گردن اٹھائی۔ بل کھائی ہوئی آٹھ ریشے دار ٹانگوں والی مکروہ مخلوق اس کے سینے پر بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے آنے والی چاندنی کے باعث سیاہ مکڑی کا سایہ وکٹر کی گردن تک پہنچ رہا تھا۔ شب زاد بلا نے اپنی سرخ چمکدار آنکھیں وکٹر کی آنکھوں میں گاڑ رکھی تھیں۔ وکٹر کے سینے کی ہلکی سی جنبش سے چوکنی ہو کر وہ آگے پیچھے ہونے کی بجائے کیکڑوں کی طرح پہلو کی سمت حرکت کرنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وکٹر کے سینے سے اتر کر ماریا کی چھاتیوں پر چلی گئی اور پھر پہلو بدل کر رینگتی ہوئی ماریا کی ٹھوڑی پر پہنچ کر اس کے ہونٹوں پر ٹانگیں مسلنے لگی۔ اس دوران وہ وکٹر کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کی ٹانگوں کے لمس سے گہری نیند سوئی ہوئی ماریا کا ادھ کھلا منہ مزید کھل گیا اور وہ فوراً اپنی پچھلی ٹانگوں کو سمیٹ کر ماریا کے منہ میں اترنے لگی۔ روپوشی کے آخری لمحے تک وہ وکٹر کو گھورتی رہی۔ ماریا کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے منہ بند کر کے اطمینان سے اُس قے آور مخلوق کو نگلنے کے بعد دوبارہ منہ کھول دیا۔ وکٹر نے دیکھا کہ ماریا کے حلق میں مکڑی کے اترنے سے ایک ابھار سا پیدا ہوا جو کسی لہر کی طرح حرکت کرتا

اس کے پیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس دوران وکٹر غیر ارادی طور پر بستر کے قریب رکھی پھلوں کی ٹوکری سے چھری اٹھا چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پوری قوت سے چھری ماریا کے حلق میں اتار دی۔ چند لمحوں تک وکٹر مکمل حواس باختگی کے عالم میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر وہ چونک کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نیند کی گولیوں سے مٹھی بھر کر حلق میں انڈیل لی۔ وہ جانتا تھا کہ کمرے میں کوئی خوفناک واقعہ پیش آچکا ہے۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اور اس حادثے کا شکار ہوا ہے۔ جبکہ اس کی حیثیت محض ایک لاتعلق تماشائی کی ہے۔

دوسرے دن وکٹر کی آنکھ کھلی تو اس کے سر میں خواب آور دوا کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا غسل خانے میں گیا اور دیر تک ٹھنڈا پانی انڈیلتا رہا۔ باہر نکل کر اس نے پہلی مرتبہ ماریا کو نظر بھر کر دیکھا۔ اس کے منہ کی طرح اس کی آنکھیں بھی آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ چھری بدستور اس کے حلق میں پیوست تھی۔ بستر خون سے بھرا ہوا تھا پلنگ کے ساتھ خون دائرہ دار پھیلنے کے بعد ایک سرخ لکیر بناتا دروازے تک چلا گیا تھا "یہ گلا کٹنے کے بعد بہت دیر تک زندہ رہی ہے"۔ وکٹر کو خیال آیا "......ورنہ اتنا زیادہ خون بہنا ناممکن تھا......"

وکٹر جرم کے نشانات ابتداسے مٹانا چاہتا تھا اس نے ماریا کے گلے سے چھری نکالی اور اسے رومال سے صاف کر کے واپس پھلوں کی ٹوکری میں رکھ دیا اسی لمحے وکٹر کو ایک آواز سنائی دی۔ "شکریہ" کسی نے آہستہ سے کہا "بہت، بہت شکریہ"

وکٹر فطری ردِعمل کے تحت اس آواز کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ آخری لمحے میں اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ یقیناً مر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اس کا بدن سرد ہو گیا تھا اس کے چہرے پر زردی پھیل رہی تھی۔ اور خون صاف کرنے سے زیادہ اہم یہ تھا کہ وکٹر اسے دفنانے کے لیے گڑھا کھودے۔ وکٹر نے اسے کندھے پر اٹھایا تو ایک بار پھر وہی آواز سنائی دی۔ آواز زندہ تھی اور ماریا کے کٹے ہوئے گلے سے آرہی تھی "میں تمہاری شکر گزار ہوں' شکریہ۔ بہت بہت شکریہ"۔

وکٹر نے اسے واپس بستر پر رکھ دیا اور اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔ وکٹر کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں وکٹر چاہتا بھی تو حرکت نہیں کر سکتا تھا وقت گزرتا رہا۔ دن کی روشنی مدہم پڑ گئی شام کا دھندلکا بتدریج گہرا ہو تا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو گیا۔ وکٹر بدستور اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

مقررہ وقت پر انشورنس ایجنٹ نے گھر کی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے دوبارہ بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اس مرتبہ گھنٹی کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ پھر غالباً اس کی نظر خون کی لکیر پر پڑی۔ اس کے پسپا ہوتے قدموں کی گونج سے چونک کر وکٹر ہوش میں آیا۔ انشورنس ایجنٹ اس کا راز ہمراہ لیے جا رہا تھا۔ جلد ہی پوری دنیا کو خبر ہو جائے گی۔ اب چند لمحوں کی تاخیر بھی اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ وکٹر نے دوبارہ لاش کندھے پر رکھ لی۔

''شکریہ۔ بہت بہت شکریہ'' وہ بولی۔

''بکواس بند کرو'' اس نے سسکاری بھری۔ ''فقط گڑھا کھودنے کی دیر ہے تمھیں تو میں منہ کے بل زمین کی تہہ میں دے دوں گا۔ پھر قیامت تک خاموش رہو گی''

''شکریہ''۔

''بکومت...... میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں'' یہ کہتے ہوئے وکٹر لان میں نکل آیا۔ اس نے ایک کیاری کی نرم مٹی کو گڑھا کھودنے کے لیے موزوں پایا تو شانوں کا بوجھ اتارنے لگا۔

''شکریہ''۔

وکٹر نے پوری طاقت سے ماریا کے منہ پر چانٹا مارا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ اس نے زندگی میں بھی ایک بار ماریا کے ہونٹوں پر اسی طرح الٹے ہاتھ کا تھپڑ لگایا تھا۔

''شکریہ''۔

''کس بات کا شکریہ؟'' وہ پاؤں پٹخ کر چیخ پڑا۔

''...... کیوں کہ اب تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے''

''نہیں'' خوف سے اس کی زبان بل کھا گئی۔ ''تم...... تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گا''

وکٹر دونوں ہاتھوں سے کیاری کی مٹی کھودنے لگا۔ اچانک ایک مختلف قسم کی آواز بلند ہوئی۔ وکٹر نے پلٹ کر ماریا کی جانب دیکھا وہ خاموش تھی۔ یہ ایسی آواز تھی، جیسے کوئی بچہ گتے کا بنا ہوا بھونپو بجا رہا ہو۔ وکٹر آواز کا سراغ لگانے پھاٹک تک چلا گیا۔ پھاٹک کے دوسری طرف ایک ریڑھی کھڑی تھی۔ ریڑھی کے پیچھے ایک دبلا پتلا، چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا۔

''مچھلی والا!'' وکٹر کو دیکھتے ہی ریڑھی کے پیچھے کھڑے آدمی نے آواز لگائی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک مچھلی تھام رکھی تھی۔ ریڑھی پر مردہ مچھلیوں کا انبار لگا تھا۔ ڈھیر کے ساتھ ہی

گتے کا بھونپور کھا تھا۔ مچھلی والے نے ہاتھوں میں تھامی مچھلیاں وکٹر کو دکھاتے ہوئے یوں ہوا میں لہرائیں جیسے بچوں کو للچایا جاتا ہے۔ ''نرم نرم۔تازہ۔صحت مند غذا۔کھانے والا مزا پائے گا''
''تم آدھی رات کو مچھلیاں بیچنے تو نہیں آئے'' وکٹر کی زبان میں اب تک بل پڑے ہوئے تھے......
''نہیں......میں مدد کرنے آیا ہوں۔
''مدد؟'' وکٹر کی ٹانگیں بے جان ہونے لگیں۔ ''کس طرح کی مدد''۔
''قانون کسی کو نہیں بخشتا۔'' مچھلی والا یوں بولا جیسے کتاب پڑھ رہا ہو۔ ''قانون سے بالاتر کوئی نہیں۔قانون انصاف کرتا ہے۔سزا دیتا ہے۔صرف میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں''
''تم میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہو؟''۔
''اس لیے کہ میرے پاس تمہارا کتا ہے؟''۔
مچھلی والا وکٹر کے آگے آگے چلتا ہوا کیاری کے قریب رکھی لاش تک پہنچ گیا۔وکٹر کو اس کے اعتماد پر حیرت ہوئی۔وہ لاش کو اٹھانے کے لیے جھکا تو مچھلی والے نے اسے روک دیا۔ ''لاش میں اٹھاؤں گا''۔اس نے اطمینان سے کہا۔ ''تم نے بہت کام کیا ہے تم تھک چکے ہو۔ابھی تمھیں قانون سے بچنے کے لیے بھی طویل جدوجہد کرنی ہے۔آؤ میرے ساتھ آؤ'' وہ ایک ہاتھ سے لاش تھامے اور دوسرے ہاتھ سے وکٹر کا بازو پکڑے واپس اپنی ریڑھی تک پہنچ گیا۔ ''تم بھی اس کے ساتھ لیٹ جاؤ'' اس نے لاش کو مچھلیوں کے ڈھیر میں رکھتے ہوئے کہا۔
''کیا؟؟ کیا کہہ رہے ہو؟ میں اس کے ساتھ لیٹوں گا۔نہیں۔'' وکٹر کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔
مچھلی والا خاموشی سے لاش کو مچھلیوں سے ڈھکنے میں مصروف رہا۔کچھ ہی دیر میں ماریا کا برف کی طرح سرد بدن سر سے پاؤں تک مردہ مچھلیوں کے انبار میں گم ہوگیا۔ ''آؤ اس کے ساتھ لیٹ جاؤ'' اس نے یوں کہا' جیسے وکٹر کا انکار کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔
''میں......میں کچھ بھی کرلوں گا۔لیکن یہ......یہ نہیں۔میں تمہارے ساتھ ریڑھی دھکیلوں گا......یا کچھ بھی......مچھلیاں اٹھالوں گا۔مگر میں لاش کے ساتھ کیوں لیٹوں؟''
''چلو'' مچھلی والے نے وکٹر کو کمر سے پکڑ کر اٹھالیا۔ ''اس کے ساتھ لیٹ جاؤ۔قانون سے بچنے کی یہی صورت ہے۔ورنہ وہ تمھیں دیکھ لیں گے' اور پھر......تم تو جانتے ہو۔لیٹ جاؤ۔لیٹ جاؤ۔میں تمھیں بچالوں گا''۔
وکٹر کو مچھلیوں کے ڈھیر میں لیٹنے کے بعد خیال آیا کہ اب کوئی بھی شخص تن تنہا اتنی بھاری ریڑھی کو

نہیں چلا سکتا۔ لیکن مچھلی والے کی قوت نے اسے حیران کر دیا۔ رات کی خاموشی تاریکی میں ریڑھی اچھلتی پھسلتی چلنے لگی۔ ریڑھی کے پہیوں کی دھیمی سی آواز کے ساتھ مچھلی والے کے قدموں کی دھمک بھی مستقل بلند ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وکٹر اور ماریا کے چہروں سے مچھلیاں دائے بائیں پھسل گئیں۔ اور ریڑھی کے جھٹکوں کے باعث ان کے بدن ٹکرانے لگے۔ مچھلیوں کی تیز بو کے سبب وکٹر کی طبیعت متلانے لگی۔ اور کبھی کوئی بڑا دھچکا لگتا تو ماریا کا سرد منھ بھی اس کی ناک سے ٹکرا جاتا۔

بالآخر ایک جگہ ریڑھی رکی تو وکٹر چھلانگ مار کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک عجیب سا کمرہ تھا کمرے میں سخت سردی تھی اور دیواروں پر عام چھت کی جگہ ایک بڑا گنبد تھا۔ کمرے سے باہر جانے کا راستہ کسی جانور کے کھلے ہوئے منہ کی طرح تھا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک غیر معمولی چوڑائی کا میز رکھا تھا۔ مچھلی والے نے دو موم بتیاں روشن کیں' اور لاش کو میز پر لٹا کر وکٹر کی سمت گھومتے ہوئے بولا

''یہ بہت محفوظ جگہ ہے یہاں تم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ تم ہمیشہ محفوظ رہو گے''

''لیکن مجھے کرنا کیا ہے؟'' وکٹر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' مچھلی والے نے ایک مرتبہ پھر حیران کن طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وکٹر کو اٹھا کر میز پر بٹھا دیا اور بولا۔ ''تمھیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ تم آرام سے بیٹھو۔ سب کچھ میں کروں گا''

وکٹر ساکت بیٹھا مچھلی والے کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مچھلیوں کے کھلے ہوئے منہ چیر کران کے ٹکڑے میز پر سجا رہا تھا۔

''مجھے متلاہٹ ہو رہی ہے میں الٹی کہاں کروں؟'' وکٹر سینہ تھام کر چیخا۔ ''اپنا دھیان بٹاؤ۔ اِدھر اُدھر دیکھو'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''کچھ نہیں ہو گا''

وکٹر نے مچھلیوں سے بچنے کے لیے منہ دوسری طرف کیا۔ تو اس کی نظر ماریہ کے چہرے پر پڑی۔

''شکریہ'' وہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ ''بہت بہت شکریہ۔ اب تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے''۔

''یہ مکڑی ہے'' وکٹر خوف سے لرزنے لگا۔ ''مکڑی اب تک زندہ ہے''۔

''تمہارا قصور ہے؟'' مچھلی والے نے کہا۔ ''مکڑی کیوں زندہ رہ گئی؟''۔

''میرا قصور؟ میرا کیا قصور ہے؟؟ تم کتا واپس نہیں لائے تھے''۔

مچھلی والا اپنا کام چھوڑ کر وکٹر کے قریب آ گیا۔ ''مجھے کتے کی ضرورت تھی'' وہ وکٹر کے چہرے پر آنکھیں گاڑ کر بولا۔ ''تمہارا کتا میری ریڑھی کھینچتا تھا۔'' کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کی

آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ ہولناک خاموشی میں فقط مردہ ہونٹوں سے ابھرنے والی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یکلخت وکٹر کو خیال آیا کہ صرف وہ اپنے کتے کا نام جانتا ہے۔ ''ٹیری! ٹیری'' اس نے بلند آواز سے اپنے کتے کو پکارا۔ جواب میں کتے کی بھونکار سنائی دی۔ وہ اپنے مالک کے پکارنے پر دور کسی تاریک کونے سے شیشوں کو توڑتا اور لکڑی کے تختوں کو الٹتا پلٹتا اس کی سمت بڑھنے لگا تھا لیکن وکٹر انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مچھلی والا ماریا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ماریا کے منہ میں کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ اس کے گال لرز رہے تھے۔ وکٹر نے چھلانگ ماری اور مقبرے جیسے تاریک کمرے سے نکلنے کے لیے راہداری میں دوڑنے لگا تھا۔ کتا بھونک رہا تھا۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے لکڑیاں چیری جا رہی تھیں اور کوئی مسلسل وکٹر کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

اچانک وکٹر ایک انتہائی پرسکون اور خوبصورت جگہ پہنچ گیا۔ دریا کے کنارے پھول کھلے تھے۔ اور صبح کی آمد کے آثار تھے۔ ''مقبرے میں اس وقت مچھلی والا' مکڑی اور کتا ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں گے'' اسے خیال آیا مگر جلد ہی اس نے کندھے اچکا دیے ''مجھے کیا'' وہ زیرِ لب بولا۔
''کچھ دیر بعد یہاں روشنی پھیل جائے گی اور پرندے چہچہائیں گے''۔
وکٹر دریا کے کنارے کھڑا انتظار کرتا رہا۔ لیکن صبح نہیں ہوئی اور کسی پرندے کی آواز سنائی نہیں دی۔

☆

اس افسانے میں ایک فضا تخلیق کی گئی ہے ایک ماحول بنایا گیا ہے ہالینڈ کے جان ٹونڈر کی یہ کہانی ''بھیانک خواب فکشن'' کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ خواب بیان کرنا آسان عمل نہیں ہے۔ دوسرے درجے کے ادیب خواب کے نام پر مبالغہ آرائی کرنے لگتے ہیں یا اَنمل بے جوڑ واقعات بیان کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ''خواب اور خیال'' زندگی کا عظیم ترین معمہ ہیں۔ خواب کے دوران کبھی کبھی لاشعور کی گہرائیوں سے وہ چیزیں بھی سطح پر ابھر آتی ہیں جنہیں خواب دیکھنے والا خود سے بھی نہیں دہرانا چاہتا۔

کائنات کی ہر چیز سہ البعادی (Three Dimensional) ہے لیکن وجود انسانی سے باہر ''وقت اور خلا'' اور وجود کے اندر ''خواب و خیال'' ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق بعدِ چہارم (Fourth Dimension) سے ہے ہم چاند کی سطح پر چہل قدمی کرنے والے خلا نورد کی باتیں گھر بیٹھے سن سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ بیٹھا شخص کیا سوچ رہا ہے اس کے ذہن میں کیا خیالات آ رہے ہیں۔؟ دنیا کا حساس ترین آلہ ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے۔ دل کے مریض کے

بدن سے ایسی مشین پیوست کردی جاتی ہے۔ جس سے اسکرین پر اس کے دل کی دھڑکنیں ایک لکیر بناتی چلی جاتی ہیں اور یوں ان کی خفیف ترین غیر معمولی جنبش کا بھی سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر پہلو میں لیٹا شخص کس خواب سے مضطرب ہو رہا ہے؟ نہ صرف یہ کہ ہمیں آج اس بات کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ آیندہ بھی خواب معلوم کرنے کا امکان نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فقط یہ کہ خوابوں کا تعلق فورتھ ڈائمینشن سے ہے جبکہ کائنات تھری ڈائمنشنل ہے۔ اس عالم آب و گل میں تیار کی جانے والی ہر مشین لامحالہ تھری ڈائمنشنل ہوگی۔ اس لیے فقط ان اشیاء کے لیے کارآمد ہوگی جو حواسِ خمسہ کی زد میں آتی ہیں۔ یعنی وہ اشیاء جنھیں سنا' سونگھا' دیکھا' چکھا اور چھوا جاسکتا ہے۔ وقت اور خلا' خواب اور خیال کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ یہ نامعلوم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ان کا محض تصور کیا جاسکتا ہے ادراک ناممکن ہے۔

دینی تعلیمات میں ان دو مختلف دنیاؤں کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ حواسِ خمسہ کی دنیا' عالمِ خلق اور فورتھ ڈائمنشل دنیا عالم امر کہلاتی ہے۔ ہمارا بدن عالمِ خلق سے وابستہ ہے ہم اسی عالم میں جنم لیتے' پروان چڑھتے اور مر جاتے ہیں۔ لیکن خواب و خیال' عالم امر سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ دنیا (عالم خلق) میں خواب بھی اسی راز کا حصہ ہیں (آئن اسٹائن نے وقت اور خلا کو ایک ہی چیز ثابت کر دیا ہے' مگر اس سے مجموعی صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خواب ور خیال کو ایک ہی چیز ثابت کر دیا جائے)

سگمنڈ فرائڈ کی ''خوابوں کی تعبیر'' اور ینگ کی اجتماعی علامتوں کے حتمی تجزیے میں دنیا کے تمام ماہرینِ نفسیات یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسان دراصل خوابوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے اس قدر پیچیدہ اور غیر واضح صورتِ حال کو موضوع بنانے والے ادیب کی معمولی سی لغزش اسے مکمل طور پر گمراہ کرسکتی ہے۔ ''خواب فکشن'' محض غیر معمولی واقعات اور غیر متناسب کرداروں کا بیان نہیں ہے سپنوں کی دنیا کی نیم روشن' نیم تاریک گلیوں میں کوہ قاف کے طلسمی ماحول اور جنوں' پریوں کے جمگھٹوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بالغ ہونے پر ہم خوابوں کی اثر پذیری سے محفوظ ہو جاتے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے خواب سہانا ہو یا بھیانک عمر کے ہر حصے میں ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور خواب کے شکنجے کی سختی کا راز ہی یہ ہے کہ وہ حقیقی دنیا سے مطابقت رکھتا ہے۔ عام حالات میں یہ تطابق ناقابلِ بیان ہوتا ہے لیکن اسے محسوس کیا جاسکتا ہے اور اسی احساس کے باعث خوابوں کا۔۔۔ انتہائی شدید ہوتا ہے۔ ہمیں تقریباً تمام قابلِ

ذکر خواب سارا دن یاد رہتے ہیں کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یاد مہینوں اور برسوں پر محیط ہوتی ہے اور کبھی کبھی کوئی خواب ایسا بھی دکھائی دیتا ہے کہ۔

میں ایک پل کے رنج فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

جان ٹونڈر کا خواب ''مکڑی'' اسی کیفیت کا حامل ہے۔

ولیم سن سوم

بوسہ

بالآخر وہ لمحہ آگیا جب لڑکی نے آنکھیں بند کر کے اپنا چہرہ سپردگی کے عالم میں اوپر اٹھا دیا۔ رولف کو اس لمحے کا ایک مدت سے انتظار تھا۔ لیکن ادھ کھلے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے یک لخت اسے مکمل لا حاصلی کا احساس ہوا۔ تکمیل کے مرحلے پر وہ منزل سے ہزاروں میل دور چلا گیا۔ راستے میں جنگل تھے۔ دشوار گزار وادیاں تھیں اور ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ حقیقت کے نشیب و فراز تھے۔

وہ چہرہ اونچا کیے صوفے پر بیٹھی رہی۔ اس کی بھوری دل کش زلفوں کے پیچ و خم ہمیشہ کی طرح مسحور کن تھے۔ موتیوں جیسے سفید اور یکساں دانتوں کے درمیان اس کی زبان کی گلابی نوک ہلکی سی جھلک دکھا کر دوبارہ وجود کے اندھیروں میں گم ہوگئی کمرے کے اندر جانے والی کھڑکیاں' دروازے، بند ہو جانے کے باعث اندر ہی رہ گئی تھیں' اور رات کے اس لمحے پریشانی کے عالم میں روشنی کے گرد گھوم رہی تھیں۔ بہت دیر سے سوائے مکھیوں کی سرسراہٹ کے 'کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک بار لڑکی نے رولف کا چہرہ نزدیک لانے کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔ تو اس کے ریشمی لباس کی سلوٹوں نے آپس میں رگڑ کھا کر ایک خوش کن آواز پیدا کی تھی۔ لباس کی کیف آور تانوں اور لڑکی کے اعضا کے رقص نے رولف کے وجود میں ہلچل مچا دی تھی۔

لیکن وہ عین وصال کے لمحے میں اتنا دور کیوں چلا گیا تھا؟ پہلی ملاقات کے وقت بھی اس نے خود کو لڑکی سے اس قدر جدا محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے ہونٹوں پر جھکتے جھکتے اچانک دوسری طرف نکل گیا تھا۔ وہ حواس باختہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ شدت کے اس لمحے میں بھی وہ اپنے غیر منطقی عمل کا جواز تلاش کر رہا تھا۔ پسپائی کی دلیل ڈھونڈتا ہوا پسپا ہو رہا تھا۔

''غالباً'' اس نے سوچا۔ ''میں ایک بڑی جست لگانے کے لیے پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ یا

شاید..... شاید مجھے اب بھی اس کے انکار کا خوف ہے لڑکی کا انکار مرد کے وجود پر گہری خراش ڈال دیتا ہے ''میں خوف زدہ ہوں مجھے اپنے وجود کی نفی کا اندیشہ ہے'' لیکن دراصل اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ' ناممکن کا دفعۃً امکان کی حدود میں آ جانا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا یقین ہوتے ہی ایک طویل جدوجہد ختم ہونے کا افسوس ہوا تھا۔ منزل سے ہمکنار ہو کر وہ مقابلے کی لذت باقی نہ رہنے کے صدمے سے دوچار تھا۔ جس ستارے کی تلاش میں اس نے ان تھک پرواز کی تھی وہ نزدیک آنے پر اپنی کشش کھو بیٹھا تھا جبکہ دور افق پر کئی ایسے ستارے روشن تھے جن کی چمک ناقابلِ حصول ہونے کے باعث ان تک جاذب نظر تھی۔ اس کی افسردگی بلاوجہ نہیں تھی۔

ہر چند کہ ذہن کے صحرا میں چلنے والے جھونکے نے گرد باد کے ذرّوں کو آسمان تک پہنچا دیا تھا مگر رولف کی جبلتوں میں اٹھنے والے طوفان کی پیش رفت جاری تھی۔ امید کے بجھنے سے خواہش کی چنگاری سرد نہیں ہوئی تھی۔ بدن کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اب خواہش کا راستہ ہموار تھا' اور وہ ایسی گاڑی کی طرح تھی جو پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں اس قدر طاقت صرف کر چکی ہوتی ہے کہ اس کے پہیے آگ کی طرح گرم ہو جاتے ہیں اور اس کے مختلف حصوں سے دھواں اٹھتا ہے اور جوڑوں سے شکست و ریخت کی آوازیں آتی ہیں لیکن بلندی سے اُتر کر میدان کا راستہ اسے اس کی محنت کا صلہ لگتا ہے وہ آہستہ آہستہ اپنی تھکن دور کرتی ہے۔ اسے محسوس ہو جاتا ہے کہ ہموار راستے پر منزل کا حصول اب محض وقت کی بات ہے کٹھن اور ناممکن اور دشوار پر قابو پایا جا چکا ہے۔

لبوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوا تو رولف پر منکشف ہوا کہ فتح کی مایوسی شکست کی مایوسی سے زیادہ شدید اور حوصلہ شکن ہوتی ہے اس نے اپنے مقبوضہ علاقے کو غور سے دیکھا۔ لڑکی کے سڈول شانے ایک سمت سے روشن اور دوسری طرف سے تاریک تھے اسے خیال آیا کہ جب لڑکی نے اس کے سر کو اپنے چہرے کے قریب لانے کے لیے بازو بلند کیے تھے تو اس کے کندھے اس کے رخساروں کو چھونے لگے تھے۔ لڑکی کے گالوں پر وہ سرخی تھی جو شاعروں کو شاعری پر اکساتی ہے بازو اوپر اٹھے تو رولف نے دیکھا کہ اس کا سر دائیں جانب ہلکا سا خم کھا گیا ہے اور اس کی پلکوں نے بوجھل ہو کر آنکھوں کو آدھا ڈھانپ لیا ہے۔ یہ تصنع نہیں تھا۔ اس لمحے بناوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ رولف کے تصرف میں تھی۔ نیم باز اور سرخ ڈوروں والی

آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا' جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ وصال کا لمحہ؟ جس کی سرشاری عمر بھر کے لیے ایک خوش گوار ذائقہ اور پُر کیف یاد چھوڑ جاتی ہے؟ اچانک اس کی زلفوں سے ایک طویل بال الگ ہوا۔ اور اس کے چہرے سے گزرتا ہوا اس کے لبوں تک پہنچ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ہونٹوں پر لپٹ جانے والے بال کو دوبارہ سر کے پیچھے جمایا۔ اس عمل کے دوران وہ دھیرے سے یوں مسکرائی جیسے کوئی نیند سے بیدار ہونے پر سہانے سپنے کے آخری منظر پر مسکراتا ہے۔ رولف نے لڑکی کی دل کش ہنسی کو بھی اپنے مقبوضہ علاقے کا حصہ جانا اور زیرِ لب کہا "یہ بھی میرا ہے۔ یہ بھی میرا ہے"۔ یہ سب کچھ اب اس اجنبی کی ملکیت ہے۔ جسے لوگ میرے نام سے پکارتے ہیں۔ جو میرے گھر میں رہتا ہے اور جس کی شناخت بھی میں ہوں۔ میں نے اسے بالغ ہوتے دیکھا ہے بچپن میں وہ اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کترنے پر کئی بار مار کھا چکا ہے۔ ایک بار وہ اخروٹ کے درخت سے گر پڑا تھا۔ اور دیر تک اپنی ماں کی گود میں سر چھپا کر روتا رہا تھا۔ اسکول سے پہلا انعام ملنے پر وہ شور مچاتا گھر آیا تھا۔ بلوغت کی سرحد پر اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خود کو برباد کردے یا دوسروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ بہرحال اب اس کی زندگی متوازن اور مستقل ہے اس نے زندگی میں ناکامیاں اور ذلتیں سہی ہیں۔ مگر اس کے گزشتہ شب و روز میں چند کامیابیاں بھی ہیں وہ دنیا سے رائیگاں نہیں جا رہا اور...... اب وہ مزید ایک کامیابی کا لمحہ۔ شاید سب سے بڑی کامیابی۔ اجنبی نے اس لڑکی کو سپردگی پر مجبور کر دیا ہے جو چند دن قبل تک معمولی کامیابیوں والے مردوں کی رسائی سے دور تصور کی جاتی تھی۔ اجنبی کا جادو چل گیا ہے وہ جیت گیا ہے اور اب خزانہ اس کے قدموں میں پڑا ہے۔ وہ اس تک پہنچنے کے لیے خود کو جھکا رہا ہے جسے کل تک اس سے بلند سمجھا جاتا تھا وہ آج اس سے پست ہے۔

اجنبی کو اب کیا کرنا ہے۔ خزانے کو ٹھوکر مار کر پرے ہٹا دے؟ نہیں۔ کاش یہ ممکن ہوتا۔ مگر بیدار بدن آسانی سے آنکھیں نہیں موندتا۔ خواہش کے اجزائے ترکیبی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اب اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ بوسہ لینے کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اجنبی کی انا بے بنیاد نہیں ہے آمادگی ظاہر کرنے والی لڑکی بے پناہ خوبصورت ہے اس کی آنکھوں میں معصومیت اور شوخی کا امتزاج ہے اس کی جلد بچوں کی طرح نازک اور شفاف ہے ناک اتنی ستواں ہے کہ لگتا ہے اس کی تخلیق کا بنیادی مقصد سانس لینا نہیں بلکہ دل کش نظر آنا تھا۔ یہ

صورت مقدس ہے اس کی پاکیزگی یوں چھائی ہوئی ہے جیسے یہی وہ چہرہ ہو جسے آنسوؤں کی دھند میں دیکھا جاتا ہے۔

لیکن اس کی دوشیزگی کے روشن ہالے میں تاریکی کے دھبے بھی ابھر رہے ہیں اس کی آنکھوں کی چمک رولف کو ایک مرتبہ پھر مدتوں دور لے گئی ہے دنیا سے الگ وہ تفریح گاہ' اسٹیج کا آہستہ آہستہ بلند ہوتا پردہ' وہ آسیب زدہ ناٹک جس کے سارے کردار خواب میں چلتے دکھائی دیتے ہیں۔اور تفریح گاہ سے گھر واپس پہنچنے پر ان کا ہر بات پر الجھنا۔وہ رات بہت عجیب تھی۔اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔

محبت کی روشنی میں اندھیرے کے داغ جتنی تیزی سے ابھرے۔اتنی ہی تیزی سے ڈوب گئے۔

رولف مزید جھک گیا۔

اب اس کی آنکھیں تسخیر شدہ چہرے کے بہت نزدیک چلی گئی تھیں۔رولف کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے محدب عدسے کی مدد سے دیکھ رہا ہے کاجل کی لکیر' پلکوں کا دل کش خم' دائیں گال کے تل سے پھوٹنے والا چھوٹا سا بال جسے وہ کاٹنا یا اکھاڑنا بھول گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی نمی کی تہہ تھی اور پوری طرح سے بند نہ ہونے کے باعث وہ اس کے لبوں کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلے کے اندر وہاں تک دیکھ سکتا تھا۔جہاں سے اس کے وجود کا اندرونی اندھیرا شروع ہوتا تھا۔رولف کو حیرت ہوئی کہ اس کے گالوں کے مسام بقیہ چہرے کے مساموں سے بڑے ہیں اور ناک کے نیچے بہت مبہم' بہت موہوم سی مونچھوں کے آثار ہیں۔نرم و نازک ریشمی بالوں کا سراب سا وجود اُسے اچھا لگا۔

اور اب خواہش غالب آ رہی ہے اس قدر باریکیاں' اتنی تفصیلات' ایسی عریاں وضاحت' دل پر نقش ہو جانے والی آسمانی حسن کے پس منظر میں اس قدر زمینی خصوصیات' روحانی دل کشی کے پیچھے اتنی کڑی خاکی جدوجہد...... وہ بالآخر اس کی شخصیت کے پردے چاک کرتا' اس کے وجود کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔یہ وہی طلسماتی لمحہ ہے جب خواہش کی تکمیل سے قبل ہی خواہش کی تکمیل ہو جاتی ہے آخری حصہ اتنا نزدیک آ جاتا ہے کہ منزل کی جانب بے چینی سے اٹھتے قدم خود بخود آہستہ ہو جاتے ہیں یہ آرام کا لمحہ ہے دسترس میں آ جانے والی چیز کو فاصلے سے دیکھنے کا آخری موقع! سکون کا اور سانس درست کرنے کا وقفہ۔جب آدمی کو خیال آتا ہے کہ اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔مستقل مزاجی اور آہستگی کو عجلت اور اضطراب پر فضیلت حاصل ہے۔قرب

یقیناً وصال سے زیادہ قیمتی ہے۔

بوسے کے وقت دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحوں بعد اُس نے آنکھیں کھول کر سر اٹھایا اور ایک بار پھر اس چہرے کو دیکھا جو اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھا۔ رولف یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں، اور وہ تاثرات سے عاری چہرہ لیے چھت کو گھور رہی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' یہ کیا سوچ رہی ہے؟ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے؟ یہ خواب کے عالم میں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بوسے کا احساس تک نہ ہو۔ لڑکی اس کے تصرف میں آئی بھی ہے یا نہیں؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ دور دراز وادیوں میں بھٹک رہی ہو؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو وہ کیسے معلوم کر سکے گا کہ یہی حقیقت ہے؟ وہ اس کے بارے میں کوئی بھی چیز جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟''

اچانک لڑکی نے اپنی نگاہیں چھت سے ہٹائیں اور رولف کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ رولف کو اس کی آنکھوں میں دور دور تک کوئی جذبہ دکھائی نہیں دیا۔

☆

پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر وادی میں آباد گاؤں دیکھا جائے تو آدمی دم بخود رہ جاتا ہے۔ سرکش دریا ایک موہوم سی لکیر دکھائی دیتا ہے جس کے کنارے بستے مکان بچوں کے تعمیر کردہ گھروندے نظر آتے ہیں۔ اس منظر میں سب سے اداس چیز صحنوں کے چولہوں سے اٹھتا دھواں ہوتا ہے۔

اگر پہاڑ کی چوٹی سے وادی کی تفصیلات بیان کی جائیں تو یہ پرندے کی آنکھ کا مشاہدہ (Bird's Eye View) کہلائے گا، جبکہ وادی میں آباد گاؤں کی گلیوں میں داخل ہو کر گھروں کی طرزِ تعمیر، دروازوں کی ساخت، کھڑکیوں کا رنگ و روغن اور ان سے جھانکتے چہروں کے نقوش پر نظر ڈالنا چشمِ عمومی کا مشاہدہ (Microscopic View) ہے عام طور پر افسانہ نگار کا دیدۂ بینا ان ہی زاویوں سے اپنے اطراف کی دنیا دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل والا مرحلہ بھی آتا ہے۔ بدھ مت کی چینی شاخ کے علماء کا کہنا ہے کہ انسان غور سے نہیں دیکھتا، ورنہ ریت کے ہر ذرے میں ایک گوتم بدھ موجود ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی

کافکا ایک جگہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا ہے ''دنیا کتنی دل چسپ جگہ ہے؟ اندازہ کرنا ہو تو مٹھی

بھر دنیا آنکھوں کے نزدیک لا کر غور سے دیکھو"
مٹھی بھر دنیا غور سے دیکھنا' خورد بینی مشاہدہ (Microscopic view) کہلاتا ہے۔ اس طور دکھائی دینے والے مناظر کی اپنی نزاکتیں' پیچیدگیاں اور لذتیں ہوتی ہیں۔ "بوسہ میں باریک بینی اور نفسیاتی گہرائیوں کی دنیا آباد ہے کہانی نویس نے مرد اور عورت کے درمیان ازل سے موجود پر اسرار کشش کے نشیب و فراز یوں اجاگر کیے ہیں جیسے وہ تمام عمر فقط اسی موضوع پر غور کرتا رہا ہو۔ مشاہدے کے غیر معمولی زاویے اور مراقبے کی منفرد دست نے اس افسانے کو بہت مختلف اور مؤثر بنا دیا ہے۔"

یاں یاں نے

بھوک

اس کمرے میں جس کا وہ کرایہ ادا نہیں کر رہا تھا۔ اسے بھوک ستا رہی تھی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ کئی دنوں تک وہ برداشت کرتا رہا۔ لیکن ایک رات بھوک اتنی بڑھ گئی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے اور کچھ بھی کھانے کو نہ ملے تو وہ بھوک پر زندہ رہ سکتا ہے بھوک آہستہ آہستہ اس کے پیٹ میں ٹھوس شکل اختیار کر کے غذا کی طرح تحلیل ہو رہی تھی۔ ہضم ہو رہی تھی۔ بھوک کی لہریں معدے سے منہ کی جانب آتیں۔ زبان پر خوراک کی لذت پھیلا کر معدوم ہو جاتیں۔ یہ خواہش کا ذائقہ تھا۔ اس نے بستر پر کروٹ بدلی اور اپنے دوست پالو کے بارے میں سوچا جس نے اسے ریشمی ٹائی تحفے میں دی تھی۔ ٹائی سامنے دیوار پر ایک کیل سے ٹنگی تھی۔ دوستی کا مقدس رشتہ اس خیال پر اصرار نہیں کرتا کہ مرجھائی ہوئی ریشم سے روٹی کے پیسے حاصل نہ کیے جائیں۔ یہ ایک تحفہ ہے لیکن پالو کو معلوم بھی ہو جائے تو اسے خوشی ہوگی کہ اُس کا تحفہ دوست کی بھوک مٹانے کے کام آیا ہے۔

"اگر میری ٹانگ کٹ جائے اور میں اپنے وجود سے اُبلتے خون کو روکنے کے لیے زخم پر ٹائی لپیٹ دوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا چاہے اس عمل میں ریشم کی دھجیاں بکھر جائیں۔"

میں یہ ٹائی کسے بیچوں؟

ایک ارادہ اس کے بدن میں یوں کسمسایا جیسے وجود کا کوئی نازک عضو کسی ہاتھ کی گرفت میں آ گیا ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ وہ ایک لمحے میں دروازے تک پہنچا اور باہر نکل گیا۔ خیالات اور حرکات کے اس ہجوم میں وہ بھوک کی چبھن سے غافل ہو گیا تھا' لیکن گلی میں نکل کر جب وہ دائیں یا بائیں جانب جانے کے سلسلے میں شش و پنج کا شکار ہوا تو بھوک اس پر دوبارہ حملہ آور ہوئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے بھوک ایک وحشی اور منہ زور جانور ہے جس نے اسے زمین پر پٹخ دیا ہے اور اب یہ بپھرا ہوا بدمست حیوان ابد تک اسے اپنے سُموں تلے روندتا رہے گا۔ پنجوں سے تار تار کرتا پھرے گا۔ وہ دائیں سمت چلنے لگا گلی نیم تاریک تھی۔ درختوں کی شاخیں جہنمی خوشی سے سرشار ہو کر لہرا رہی تھیں۔ اسے کوئی معجزہ ہی بھوک سے نجات دلا سکتا تھا ایک گھر کی کھڑکی سے بلی نکل

رہی تھی یہ ایک موٹی تازی پالتو بلی تھی جو انسانوں سے اتنی مانوس تھی کہ رتن نے چمکارے یا پیار کیے بغیر اسے بازوؤں میں اُٹھالیا۔ رتن فوراً واپس چل پڑا۔ اُس کے وجود میں امید نے پر پھیلا دیے تھے۔ اس کا پیٹ بھر سا گیا تھا۔ جرم میں خوں ریزی شامل تھی۔

رتن نے جانور کو ہلاک کرنے کے لیے ہتھوڑا اُٹھالیا۔

پہلے وار میں ہتھوڑا بلی کی کھال کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ بلی نے پلنگ کے نیچے چھپنے کی کوشش کی' مگر کمرا چھوٹا اور دروازہ بند تھا اس نے رتن کو بری طرح نوچ لیا اس کی کلائیوں میں دانت گاڑ دیے رتن نے بائیں بازو پر تولیا لپیٹا اور بلی کو دم سے پکڑ کر اٹھالیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے بلی کے سر کو نشانہ بنایا لیکن ہوا میں معلق بلی الٹے لٹکے سانپ کی طرح لچکدار تھی الٹے لٹکے سانپ کے سر کو ہتھوڑے کی ضرب سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اس کے باوجود بلی نے موت کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح نہیں تو کسی اور طرح سے موت اُس تک پہنچ جائے گی۔ وہ غرانے لگی۔ اس کا غصہ خوفناک خرخراہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ رتن نے پھر ہتھوڑا اچلایا۔ بھاری وار خالی ہوا کو چیرتا گیا۔ اس نے دوبارہ حملہ کیا۔ اس کا نشانہ دوبارہ خطا گیا۔

......حرامزادی!

اچانک منظر پر ابتدا سے انتہا تک خاموشی چھا گئی۔ رتن نے سناٹے کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ سکوت کی گہرائی میں بچے کے مجرمانہ خیالات اور اسکی محرومیوں اور محتاجیوں کے انبار لگے تھے اور اس ڈھیر پر بلی کے اندیشے اور وسوسے رینگ رہے تھے رتن کی آنکھوں کے سامنے اُس کا دشمن جھول رہا تھا۔ دشمن بہت سخت جان تھا اس کی کھال' اس کے بال' اس کے بدن کی لچک' اس کے دانتوں کی تیزی اور نوکیلے پنجے' رتن کے دل پر خراشیں ڈال رہے تھے۔ بلی کی آنکھوں میں زندہ رہنے کی ابتدائی آرزو اب شدید ضد کی شکل میں نمایاں تھی۔ یہ بھورے رنگ کی ایک صحت مند اور خوبصورت بلی تھی۔ جس سے عام حالات میں رتن گھنٹوں کھیلتا۔ اسے پیار کرتا۔ کندھے پر بٹھا کر اُس کی کمر سہلاتا۔

بلی کے اندیشے اور وسوسے' اور رتن کی محرومیاں اور محتاجیاں کمرے کے سناٹے میں ہنگامہ برپا کر رہے تھے بلا اس قدر شور تھا کہ رتن کے کان بجنے لگے۔

رتن نے ہتھوڑا پھینک دیا۔ یہ ایک بے کار ہتھیار ثابت ہوا تھا۔ اب جانور کا گلا گھونٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کوئی تار نظر نہیں آ رہی تھی' اور وہ بلی کو چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے

اپنی پیٹی کھولی، اسے کھینچ کر پتلون سے الگ کیا اور ایک ہاتھ سے اس کا پھندا بنایا۔ چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد وہ الٹی لٹکی بلی کی گردن میں پیٹی کا پھندا ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے بائیں ہاتھ سے پیٹی کو کھینچا۔ اُس نے پوری طاقت لگا دی، لیکن پیٹی کا چمڑا بلی کی گردن میں نہیں اُتر سکا۔ یکلخت رتن ایک ایسے خواب میں داخل ہو گیا جہاں نرمی اور لچک کی لہریں ایک سیلاب کی شکل اختیار کر رہی تھیں۔ وہ غرقابی سے بچنے کے لیے بل کھاتی موجوں میں اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔ اس کی آنکھ کھلی تو بلی کا سر اس کے پاؤں تلے دبا تھا اور وہ دائیں ہاتھ سے پیٹی کھینچ رہا تھا مگر بلی کا وجود بہت نرم اور لچکدار تھا۔ تنگ آ کر اس نے پیٹی کو بلی سمیت دیوار سے لگی ایک کیل سے ٹانگ دیا۔ اب بلی کا سر اوپر ہو گیا تھا اور وہ پھانسی پانے والے مجرم کی طرح سیدھی جھول رہی تھی۔ لیکن بلی زندہ تھی۔ اس نے سیدھے ہوتے ہی دیوار کو پنجوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ رتن کانپ گیا۔ دیوار کی دوسری جانب پڑوسی آباد تھے۔ انہیں قتل کی خبر ہو جائے گی۔ مقتول خاموشی سے انجام کو پہنچ جائے تب بھی خون چیخ پڑتا ہے۔ مقتل سے آہیں اور کراہیں اور گھٹنوں کے بل چلتی درخواستیں اور فرش پر پیشانی ٹیکتی منتیں سماجتیں، دھوئیں کی طرح اٹھتی ہیں اور کونے کھدروں سے جلد یا بدیر نکل ہی آتی ہیں اور پورے ماحول کو کثیف کر دیتی ہیں۔ تماشائیوں کی آنکھوں میں چبھتی ہیں۔ ان کے رخساروں پر گیلی لکیریں کھینچ دیتی ہیں، پھر اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ بلی کے قتل پر لاگو نہیں ہوتا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اپنی پتلون سنبھالی جو پیٹی نکل جانے کے بعد بار بار نیچے پھسل رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے بلی کے سر پر ہتھوڑا مارا۔ اب بلی کے سر کے سامنے ایک ٹھوس چیز دیوار کی شکل میں موجود تھی جس سے ہتھوڑے کی ضرب کاری ہونے کا امکان بڑھ گیا تھا لیکن بلی پہلے سے زیادہ زندہ لگ رہی تھی۔ درد اور خوف اور خطرے نے جانور کی مخفی قوتیں بیدار کر دی تھیں۔ اس کی آنکھیں زندگی کی آگ سے دہک رہی تھیں۔ اس کے وجود پر اب تک کہیں خون کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی اور رتن کا ہاتھ شل ہو رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ مخلوق دراصل شیطان کا ایک روپ ہے۔ اُس نے سنا تھا کہ کبھی کبھی خبیث روحیں بلیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طرح انہیں انسانی گھروں میں داخل ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔

......اگر یہ شیطان ہے تو میں ٹھکانے لگ گیا!

اس نے سوچا کہ وہ بلی کو فرش پر اُتار کر اس معاملے کو ختم سمجھے، مگر پھر اسے خیال آیا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا شیطان تو پنجہ مار کر اُس کی آنتیں نکال دے گا۔ اُسے بچپن میں بتایا گیا تھا کہ ایسی مخلوق پر

مقدس نام دہراتے ہوئے پانی کے تین قطرے ڈال دیے جائیں تو شیطان انسانی روپ میں سامنے آجاتا ہے'' اور اگر میں صلیب کا نشان بنادوں تو...... تو شاید وہ انسانی صورت میں دیوار سے لٹکا رہے اور ممکن ہے کہ انسانی شکل اختیار کرنے کے باوجود اُس کی لمبائی چوڑائی بلی جتنی ہی رہے'' ...... میں شیطان کی ایسی لاش کا کیا کروں گا جس کے اعضا انسان کے' اور اونچائی بلی جتنی ہوگی؟''

رتن اس قدر خوف زدہ ہوگیا کہ اس نے ایسی حرکت سے اجتناب کیا جس میں کسی بھی زاویے سے صلیب جیسی شکل بننے کا امکان ہو کچھ دیر بعد وہ زرد ہوتی رنگت کے ساتھ ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا کیوں کہ اسے خیال آیا تھا کہ اس کے جسم کی کوئی بھی جنبش لاشعوری طور پر صلیب کا نشان بنا سکتی ہے...... پھر اچانک وہ کسی وحشی جذبے سے لبریز ہوکر اچھل کھڑا ہوا۔ اس نے بستر کے نیچے سے تھیلا نکالا' بلی کو دیوار سے اتار کر تھیلے میں بند کیا' اور پتلون کو اوپر گھسیٹ کر دونوں ہاتھوں سے اُس اچھلتے' لہراتے' بل کھاتے تھیلے پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ بلی اب تک زندہ تھی۔ وہ وقفے وقفے سے اچھلنے لگتی۔ رتن پھر اسے کچلنے کی کوشش کرتا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اب جانور کی شناخت بھی مشکل ہوگی اس نے تھیلا کھولا۔ بلی میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ اس نے رتن کے ہاتھ میں آتے ہی جھرجھری لی۔ بہرحال رتن نے اُدھڑے ہوئے وجود کو کیل سے ٹانگ کر اس کی کھال کھینچنی شروع کردی۔ یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا۔ رتن تھک گیا۔ بھوک کچھ دیر تک معدوم رہنے کے بعد اب دوبارہ اس کے اندرونی اعضا کو بل دے کر نچوڑ رہی تھی۔ بالآخر وہ بلی کو پچھلی دو ٹانگیں الگ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ٹانگیں اب بھی گرم تھیں۔ ان کی سطح سے مدہم سا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ برتن میں پانی بھر کر اُس نے انہیں چولہے پر رکھ دیا۔ بلی کی وہ جگہ جہاں سے ٹانگیں علیحدہ ہوئی تھیں وہ عجیب لگ رہی تھی۔ وہاں کی کھال یوں پلٹی ہوئی تھی جیسے کسی نے دستانہ اُلٹا کر اپنا خون آلود ہاتھ باہر نکالا ہو۔

رتن کے پاس نمک نہیں تھا۔ اس نے بے ذائقہ گوشت کے ٹکڑے تقریباً کچے کھائے۔ اور اس دن سے رتن کو اپنے وجود میں نوکیلے پنجوں والی مخلوق کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ پرانے زمانے میں عورتوں کے لباس پر زر و جواہر سے جنگلی جانور کاڑھ دیے جاتے تھے۔ رتن کو محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کے پیٹ پر کسی نے بڑے دانت اور تیز پنجوں والا درندہ ثبت کردیا ہے۔

شاید وہ بلی بیمار تھی یا جدوجہد اور خوف اور غصے سے اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا یا اس کا گوشت سرد ہونے سے پہلے کھالیا گیا تھا۔ یا کچلے جانے سے اس کے رگ و ریشے میں زہر سرایت کر گیا تھا۔

بہر حال رتن کے بدن پر صبح تک رعشہ طاری رہا تھا۔ اُس نے آدھی رات کو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بلی سے اپنی بخشش کی دعائیں مانگیں۔

دوسرے دن وہ گھر سے نکل کر خون خواروں کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ بھوک نے اس کے وجود میں اتنی دور تک پنجے گاڑ دیے تھے۔

☆

یاں یانے ایک عادی مجرم تھا۔ یہ طے ہے۔ یاں یانے ایک برا آدمی تھا۔ یہ طے نہیں ہے۔ وہ ایک منفرد ادیب تھا۔ یہ بھی طے ہے۔ وہ ایک عظیم ادیب تھا۔ یہ طے نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب میں یاں یانے کی شخصیت لاینحل معمہ ہے۔ ۱۹۱۰ء میں پیرس میں پیدا ہونے والا یہ ڈرامہ نگار، ناول نویس اور شاعر پینتیس برس کی عمر تک مختلف جرائم میں ملوث ہونے کے باعث یورپ کے پانچ ممالک سے نکالا جا چکا تھا' اور مجموعی طور پر تیرہ جیلوں کا مکین رہ چکا تھا۔ اس کے جرائم میں چوری اور اغلام بازی نمایاں تھے۔ ۱۹۴۴ء میں اس نے جیل ہی میں اپنا شاہکار ناول ''پھولوں کی ملکہ'' شروع کیا جس کے ابتدائی حصے پڑھ کر جین پال سارتر نے اسے جیل سے رہا کرانے کی مہم شروع کی۔ جس کے نتیجے میں وہ عمر قید سے بچ گیا۔ سارتر اس عادی مجرم کو ''اولیا'' کے درجے پر فائز قرار دیتا تھا۔ اس سلسلے میں سارتر کی دلیل انتہائی دل چسپ ہے۔ ''ولی کون ہوتا ہے؟ وہ شخص جو اپنی انا کو مٹا دیتا ہے۔ ہر چیز کو خدا کی ذات سے منسوب کرتا ہے بدی کو بھی اسی کی بخشش سمجھتا ہے جس نے نیکی کی قوت عطا کی ہے ذلت اور عزت دونوں کو قادرِ مطلق کا عطیہ مان کر خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے۔ یاں یانے خود کو مخلوق میں یوں رسوا کیا کہ وہ اب اپنی شخصیت کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ ولیوں کی خصوصیات میں سے ایک ہے......''

سارتر یہاں وہ نکتہ بیان کر رہا ہے جو ہماری روایت میں تصوف کے ملامتی سلسلے سے منسوب ہے۔

چوری کر' تے بھن گھر رب دا
اس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

''بھوک'' عام افسانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کا ذائقہ تلخ' شیریں اور ترش کے زمرے میں نہیں آتا۔ اور یہ بے مزا بھی نہیں ہے۔ اس قدر تند و تیز واقعہ اور اتنا نوکیلا کردار یاں یانے جیسا زیر زمین دنیا کا باشندہ ہی تخلیق کر سکتا ہے بظاہر سادہ نظر آنے والی یہ کہانی بباطن کئی خمار کشفی پیکروں (Images) کی حامل ہے۔

بلی کو قدیم زمانوں سے ایک طلسمی حیوان تصور کیا جاتا رہا ہے بلی کا گوشت کھانا یا کھلانا متعدد سفلی ''عملوں'' کا لازمی جزو ہے۔ سفلی علم کے مطابق بلی کا گوشت انسانی جسم میں تحلیل ہونے کے بجائے دوبارہ بلی کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس طرح ''معمول'' کے وجود میں بہت سی بلیاں قید ہو کر ایک دوسرے کو نوچنے لگتی ہیں۔ راولپنڈی میں عبدالقادر نامی ایک شخص کو شک تھا کہ اس کی بیوی نے کسی عامل کی ہدایت پر اسے بلیاں کھلا دی ہیں۔ وہ سردیوں کی راتوں اور گرمیوں کی دوپہروں میں پیٹ تھام کر فرش پر لوٹنے لگتا تھا۔ اور اتنی تکلیف کا اظہار کرتا تھا کہ خود اس کی بیوی بھی رو پڑتی تھی۔ عبدالقادر کے انتقال پر اس کے وجود کی بلیاں معدوم ہو گئیں لیکن کسی کو آخر تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اصل قصہ کیا تھا۔

پیرس کارٹن ہو یا راولپنڈی کا عبدالقادر، شجرِ انسانی کی شاخوں پر کھلنے والے تمام پتے اسی زمین سے رزق حاصل کرتے اور انہی ہواؤں میں لہراتے ہیں۔ ظاہری بود و باش اور تفاوت کے باوجود ان کی محرومیاں اور محتاجیاں یکساں، دکھ سکھ ساجھے اور توہمات کے پُراسرار جہانوں میں مطابقت پائی جاتی ہے۔

ع ان کے ماتم ایک سے، ان کی براتیں ایک سی

او ہنری

بے گناہ

وہ زمانہ گزر گیا جب جہنم کے ذکر پر ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں اور ہاتھ ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتے تھے۔ سائنس دانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ جسے ہم خدا کہتے ہیں وہ وقت ہے یا خلا ہے یا زمان و مکان کا مشترکہ نام ہے اور گناہ گاروں کو زیادہ سے زیادہ کسی کیمیائی ردعمل کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ جدید عہد کا خوش گوار منطقی نتیجہ ہے لیکن قدیم عقیدے بھی بہر حال کہیں گہرائیوں میں اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کا نام لے کر، آپ بلا خوف تردید جو چاہے کہہ سکتے ہیں...... یہ کہ آپ نے خواب میں کیا دیکھا اور یہ کہ آپ نے کسی طوطے کو کیا بولتے سنا۔

تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے خواب میں کیا دیکھا۔

صورِ اسرافیل کی گونج کائنات کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی اور ہم میدانِ حشر میں آخری فیصلے کے منتظر تھے۔ ایک فرشتے نے مجھے بازو سے پکڑا اور اُس طرف گھسیٹا جہاں دولت مند اور خوش حال دکھائی دینے والے چند انسانوں کا ایک گروہ فیصلے کا منتظر تھا۔

''غالباً تم ان میں سے ہو'' فرشتے نے اُس گروہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''یہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ......'' فرشتہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو......''

لیکن یہ مکالمہ بلاوجہ بات کو طول دے رہا ہے۔ مجھے اصل کہانی بیان کرنی چاہیے۔

ڈولی ایک سپر مارکیٹ میں کام کرتی تھی۔ وہاں وہ برتن بیچتی تھی۔ دودھ کے ڈبے بیچتی تھی کھلونے بیچتی تھی۔ ہفتے کے اختتام پر اُسے اس کی تنخواہ کا نصف حصہ ادا کر کے پوری تنخواہ کی رسید پر دستخط لیے جاتے تھے۔ بقیہ تنخواہ کاغذات پر ڈولی کے نام ہونے کے باوجود کوئی اور لے جاتا تھا۔

ابتدا میں ڈولی کو نصف سے بھی کم تنخواہ ملتی تھی۔ آپ جاننا چاہیں گے کہ وہ نصف سے کم تنخواہ میں

کیسے گزارہ کرتی تھی؟...... کیا؟؟ آپ نہیں جاننا چاہتے! میرے خیال میں آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف بڑی رقوم میں دل چسپی لیتے ہیں۔ تو چلیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ نصف تنخواہ میں کیسے گزارہ کرتی تھی۔

ایک دوپہر سپر مارکیٹ سے نکلتے وقت ڈولی نے لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے ساتھی سیلز گرل کو بتایا کہ "خبیث" نے اُس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے اور آج شام وہ خبیث کے ساتھ ایک مشہور ہوٹل میں کھانا کھانے جائے گی۔

"تم بہت خوش قسمت ہو" اس کی سہیلی نے رشک آمیز لہجے میں کہا "خبیث زبردست آدمی ہے۔ وہ لڑکیوں کو زبردست جگہوں پر لے جاتا ہے۔ گرینڈ کلب جیسی جگہ۔ جہاں زبردست موسیقی اور زبردست لوگ ہوتے ہیں۔ تم خبیث کے ساتھ زبردست وقت گزارو گی۔

اس دن ڈولی جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ اُسے شام کے لیے تیار ہونا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اور رخساروں پر ہیجان کی گلابی رنگت تھی۔ اُس کے بٹوے میں گزشتہ ہفتے کی تنخواہ کے بچے ہوئے چند سکے تھے سکے چھنکتے تو اُس کا چہرہ مزید نکھر جاتا تھا۔

شاہراہوں پر لوگوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سیکڑوں' ہزاروں یا شاید لاکھوں انسان سڑکوں پر دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ڈولی اپنے بدن پر اَن گنت آنکھوں کا بوجھ محسوس کرتی چلتی رہی۔ رات کے وقت رنگ و نور سے لبریز ہو جانے والا مخصوص علاقہ آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ اس علاقے کی گلیاں پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔

ڈولی نے اپنے کمرے میں پہنچ کر چاروں سمت دیکھا۔ یہ قرینے سے سجا ہوا ایک کمرہ تھا۔ یہ کمرہ عام گھروں کے کمروں سے اس طرح مختلف تھا کہ اس کے مکین کے بھوکے سو جانے کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک چھوٹا پلنگ' ایک میز' ایک کرسی' ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک لپ اسٹک اور پاؤڈر کا ڈبہ' دیوار سے آویزاں سال رواں کا کلینڈر' بستر پر پڑی کتاب جس کے سرورق پر جلی حروف میں "آپ کے خواب اور اُن کی تعبیریں" درج تھا۔ نمک اور کالی مرچ کی شیشیاں اور پلاسٹک کے بنے چند پھل جو ایک سرخ ریشمی ڈوری سے بندھے تھے۔ آئینے کے عین اوپر ایک فوجی جنرل کی تصویر رکھی تھی۔ جنرل مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ ڈولی اکثر تنہائی میں اس سے گفتگو کرتی تھی اور اسے پیار سے جنرل صاحب کہتی تھی۔

خبیث اسے سات بجے لینے آئے گا۔ جب تک وہ تیار ہوتی۔ ہم منہ دوسری طرف کر کے خبیث کے بارے میں باتیں کر سکتے ہیں۔
اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شہر کی لڑکیوں نے اس کا نام خبیث رکھا ہے۔ اُس کا بدن بہترین انسانوں جیسا اور روح درندوں کے مانند ہے۔ وہ نفیس کپڑے پہنتا اور مہنگے کھانے کھاتا ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فاقہ زدہ لوگوں کو فوراً پہچان لیتا ہے خاص طور پر لڑکیوں کے بارے میں تو اُس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ اس نے کتنے دنوں سے سوائے چائے اور روٹی کے کچھ نہیں کھایا ہے وہ اکثر مہنگے بازاروں اور ڈیپارٹمنٹل اسٹوروں میں گھومتا نظر آتا ہے اور مجبور و محروم لڑکیوں کو شاندار جگہوں پر کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ خبیث ہے۔ میں اُس کے متعلق زیادہ بات نہیں کروں گا میرا قلم آگے چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔
ڈولی فی الوقت سب کچھ فراموش کر چکی ہے۔ اسے صرف یہ یاد ہے کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اور زندگی کے روشن پہلو اس پر عیاں ہونے والے ہیں۔ اُسے آج سے پہلے کسی خوش حال شخص نے اپنے ساتھ وقت گزارنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اب وہ بھی ان جگہوں کے لطف سے آشنا ہونے والی تھی۔ جہاں فقط مال دار لوگ جا سکتے ہیں۔ لڑکیاں بتاتی ہیں کہ خبیث بہت شاہ خرچ ہے۔ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف درجے اول ہی کی چیزیں خریدتا ہے۔ اور ایسے کھانے کھلاتا ہے جن کے نام لیتے ہوئے لڑکیوں کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔
کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ڈولی نے دروازہ کھولا تو سامنے مالکِ مکان کو معنی خیز انداز میں مسکراتے پایا۔ ''کوئی تمھیں ملنے آیا ہے''۔ اُس نے آنکھ مار کر کہا۔ ''اپنا نام مسٹر ڈکنس بتا رہا ہے''
جو لوگ خبیث کو ذاتی طور پر نہیں جانتے تھے وہ اسے اُس کے اصلی نام سے ہی پکارتے تھے۔
ڈولی اپنا رومال اُٹھانے کے لیے گھومی اور اچانک ٹھٹک گئی اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ آئینے میں نظر پڑتے ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ پرستان میں ہے اور سو سال تک سوئی رہنے والی پری کی طرح اب آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہی ہے۔ آئینے کے اوپر سے اُسے وہ دیکھ رہا تھا...... وہ جو اسے کسی بھی کام کا حکم دے سکتا تھا اور کسی بھی کام سے روک سکتا تھا...... جنرل صاحب...... آج جنرل صاحب کے دل کش چہرے پر اُداسی کی جھلک نمایاں

تھی۔ وہ ناراض لگ رہے تھے۔ ڈولی کچھ دیر تک جنرل کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی اور پھر روہانسی آواز میں بولی "اسے کہو میں نہیں آسکتی...... کہہ دو میں بیمار ہوں...... یا کچھ بھی کہہ دو...... میں نہیں جاؤں گی"۔

جوں ہی دروازہ بند ہوا' ڈولی بستر پر منہ کے بل لیٹ کر رونے لگی۔ وہ دیر تک روتی رہی پھر خاموش ہو کر وقفے وقفے سے ہچکیاں لینے لگی۔ جنرل اس کا واحد دوست تھا۔ وہ ڈولی کے لیے مثالی مرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ڈولی اکثر اس سے خوابوں میں گفتگو کرتی تھی۔ اُس کے ساتھ دنیا کی سیر پر روانہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا تھا کہ کسی دن اُس کے دروازے پر دستک ہوگی۔ اور دروازہ کھولنے پر اُسے جنرل کھڑا نظر آئے گا۔ وہ قدم بڑھائے گا تو اُس کے سینے پر سجے بہادری کے تمغے سرشار کر دینے والی آواز میں چھنکتے جائیں گے۔ اس جھنکار کی گونج میں وہ ڈولی کا بازو تھام کر اسے اس کی تنہائی اور گھٹن سے نجات دلائے گا۔ ایک بار تو اُسے گلی میں جنرل کے تمغے چھنکنے کی آواز سنائی بھی دی تھی۔ لیکن جب اُس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تھا تو محلے کا ایک لڑکا بجلی کے کھمبے سے لوہے کی زنجیر ٹکرا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اُس کے ذہن کا فتور ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ جنرل اس وقت جاپان میں ترکوں کے خلاف اپنی فوج کی قیادت کر رہا ہے اور وہ کبھی بھی اُس کے دروازے پر دستک نہیں دے گا۔ اُس کے باوجود جنرل کی ایک نظر نے اُس روز خبیث کو بھگا دیا تھا۔ کم از کم ایک رات کے لیے اُسے پسپا کر دیا تھا۔

جب اُس کے آنسو خشک ہوئے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیا لباس اُتار کر اس نے گھر کے سادے کپڑے پہنے' اور اس دوران اپنے پسندیدہ گانوں کے بول دہراتی رہی۔ اسے کھانے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ اچانک آئینے میں اُسے اپنی ناک کے کونے پر ایک چھوٹا سا سرخ دھبا نظر آیا۔ کچھ دیر تک وہ اس دھبے کو غور سے دیکھتی رہی۔ یہ ایک بے ضرر داغ تھا۔ اس نے کندھے اچکائے اور سرخ نقطے سے لاتعلق ہو گئی۔ پھر اُس نے کمرے کی واحد کرسی پر بیٹھ کر گود میں تاش کے پتے پھیلائے اور اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے کھیل میں مصروف ہو گئی۔

نو بجے کے قریب ڈولی نے چائے بنائی اور ڈبے سے بسکٹ نکال کر مزے سے کھانے لگی۔ ایک بسکٹ اس نے جنرل کی جانب بھی بڑھایا۔ لیکن جنرل اسے یوں دیکھتا رہا۔ جیسے مصر کے

اہرام اپنی آنکھوں کے سامنے منڈلاتی تتلی کو دیکھتے ہوں گے......اگر صحراؤں میں تتلیاں وجود رکھتی ہیں۔
......نہیں کھانا تو نہ کھاؤ'' ڈولی نے اٹھلا کر کہا اور جنرل کی جانب بڑھایا ہوا بسکٹ اپنے منہ میں ڈال لیا'' ......اور یہ تم اس طرح گھورنا چھوڑ دو جنرل صاحب۔ اگر میری طرح تمھیں بھی نصف تنخواہ ملے تو میں دیکھوں تم کتنا اتراتے ہو۔ چھ ڈالر میں ہفتہ گزار سکتے ہو؟''
ساڑھے نو بجے ڈولی نے آئینے پر رکھی تصویر پر آخری نظر ڈالی۔ بتی بجھائی اور بستر پر دراز ہوگئی۔ تنہائی اور دکھ کی زندگی میں جنرل کو شب بخیر کہنا آسان کام نہ تھا۔
یہ کہانی اصل میں کہیں ختم نہیں ہوتی ۔اس کا بقیہ حصہ بعد میں آتا ہے اس وقت جب خبیث ایک بار پھر ڈولی کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا ہے اور اس مرتبہ ڈولی پہلے سے کہیں زیادہ اکیلی اور اُداس ہے اور اُسے پیٹ بھر کھانا کھائے کئی دن ہو چکے ہیں اور جنرل صاحب دوسری جانب دیکھ رہے ہیں......اور......''
میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ میں نے خواب میں خود کو قیامت کے روز ایک گروہ کے قریب کھڑے پایا تھا۔ گروہ کے افراد نہایت خوش حال دکھائی دیتے تھے۔ اور ایک فرشتے نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا تھا۔ ''غالباً تم ان میں سے ایک ہو؟''
''یہ کون لوگ ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔
''یہ؟'' فرشتے نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو مجبور لڑکیوں کو ملازمت دے کر انہیں نصف تنخواہ ادا کرتے ہیں۔ کیا تم ان ہی میں سے ہو؟''
''نہیں۔نہیں۔تمہاری لافانی زندگی کی قسم۔ میں ان میں سے نہیں ہوں''۔
میں نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''میں نے تو بس ایک یتیم خانے کو آگ لگائی تھی اور ایک اندھے فقیر کو اس کی رقم کی خاطر قتل کر دیا تھا''۔

☆

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ''ہم قصے کہا کرو تا کہ تمھیں عبرت ہو'' اور حضرت عیسیٰ نے بھی اپنی تعلیمات عام کرنے کے لیے علامتی کہانیوں کو وسیلہ بنایا تھا۔ انسانوں کی تقدیریں بدل دینے والی تمام کتابوں کی صنفِ تحریر نثر ہے۔ شاعری اس لحاظ سے تاریخ میں کمتر درجے پر فائز ہے کہ قوافی کی جھنکار اجتماعی شعور کو دائمی حرکت نہیں دے سکتی۔ جہاں جہاں شاعری نے یہ سعی کی وہاں وہ

''داستان'' کہلائی۔ جو دراصل طولانی قصے کا خوش نما نام ہے۔ تقریباً تمام عہد ساز مصنف اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کرتے ہیں۔ کہ ابتداء ذات سے ہوتی ہے۔ کائنات کی شمولیت کے بعد مسائل بدل جاتے ہیں۔ موضوعات میں تغیر آ جاتا ہے۔

بہر حال نثر کی سنجیدگی کے بھی مرحلے ہیں۔ چند ادیب اوائلِ عمری میں متاثر کرتے ہیں۔ مگر بالآخر ''سابقہ شوق'' بننا ان کا مقدر رہا ہے۔ اوٗ ہنری ایسے ہی چند ادیبوں میں شامل ہے۔ عمر اور تجربہ بڑھنے کے ساتھ قاری آسانی سے اس کے دائرہ اثر سے نکل جاتا ہے۔ اردو سمیت دنیا کی تمام زبانوں میں ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جو ابتدا میں دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ لیکن زندگی کے درمیانی اور آخری مرحلے میں بہت کم موقعوں پر ان کی کوئی کہانی' کردار یا جملہ یاد آتا ہے۔ عالمی افسانے کے ذہین قارئین امریکہ کے۔ او ہنری سے وہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ جو فرانس کے موپساں اور روس کے چیخوف کا مقدر بن چکا ہے۔ یعنی عنفوانِ شعور میں ان کے سحر میں شدت سے گرفتار اور بعد میں اپنی بچپن کی محبت پر شرمندہ۔ مگر ابتدائے شباب کے عشق پر چاہے کتنی ہی ندامت ہو اسے آخری دم تک برا نہیں کہا جاتا۔

او ہنری کی زیادہ تر کہانیاں حسنِ اتفاقات سے بوجھل ہو کر اس قدر مصنوعی انداز میں تکمیل کو پہنچتی ہیں کہ محسوس ہوتا ہے گویا مصنف نے محض انجام کو مدنظر رکھ کر بقیہ تمام واقعات کو ترتیب دیا ہو۔ یہ بذاتِ خود کوئی ایسا بڑا عیب نہیں ہے۔ مگر اکثر اوقات او ہنری اپنی کہانی کے پیچ و خم کو فطری رنگ دینے میں ناکام رہتا ہے اور سنجیدہ ادب کے لکھاریوں میں یہ کوتاہی ناقابلِ معافی ہے اس سے کہانی میں ''آورد'' کا عنصر اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ کہانی کی تخلیق کسی باقاعدہ منصوبے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے آمد کی عدم موجودگی اور میکانکی عمل کی زیادتی ہی وہ پہلو ہے جس کے باعث جاسوسی کہانیوں کو عالمی سطح پر ادب عالیہ کے درجے سے خارج تصور کیا جاتا ہے۔ او ہنری اپنے قصے کے پُر تکلف آغاز اور سوچے سمجھے انجام اور درمیانی واقعات کے بیان میں ضرورت سے زیادہ باہوش رہنے کے سبب خود کو لاشعور کی نیم تاریک وسعتوں سے آشنا نہ کر سکا۔ اسی لیے نیویارک شہر میں بیسویں صدی کی آمد کا باریک بیں شاہد' عورت باز' دن رات کا شرابی اور جرم و سزا کی گھناؤنی دنیا سے ذاتی طور پر آشنا اس افسانہ نگار نے جب ۱۹۱۰ء میں اڑتالیس برس کی عمر میں آخری سانس لیا تو وہ اپنی بے پناہ مقبولیت کے

باوجود ادب کے اس منصب پر فائز نہیں تھا' جہاں گہرائیوں کے خوگر قارئین بھی اس کے ساتھ دور تک اور دیر تک سفر کرنا پسند کرتے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیائے ادب کے مستند نقادوں کے کڑے تجزیوں کے باوصف او ہنری کے بعد آنے والے تمام افسانہ نگار اس کے افسانوں میں خالص ''کہانیت'' کے عنصر کی داد دیتے رہے۔ عام بات کو چونکا دینے والے زوایے سے عیاں کر کے افسانہ بنا دینا فن ہے اور او ہنری اس فن میں درجۂ کمال رکھنے والے مصنفوں میں سے ہے۔

جیسی اسٹیورٹ

ایک اور بہار

''اب'' امی نے نانا ابا کے سر پر اونی ٹوپی جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ.....اب آپ کو سردی نہیں لگے گی''۔

''کیا؟ کیا نہیں ہوگا؟'' نانا ابا نے ابھری ہوئی رگوں والا اپنا ہاتھ کان پر رکھ کر چہرہ امی کی طرف جھکاتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے سنا نہیں''۔

''اب آپ کو سردی نہیں لگے گی''۔ امی نے بلند آواز میں دہرایا۔ ''اور ذرا ٹھہریں میں آپ کے دستانے تو بھول ہی گئی''۔ نانا ابا نے ہاتھ کان پر رکھا تو امی کو ان کے دستانوں کا خیال آ گیا۔

''رہنے دو۔ نانا ابا نے کمرے سے باہر جاتی اپنی بیٹی کو آواز دی۔ ''اتنی ٹھنڈ نہیں ہے''۔

امی نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ نانا ابا نے کمر سیدھی کی تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔

''تمہاری امی نے مجھے اتنے کپڑے پہنا دیے ہیں کہ میری جگہ کوئی کمزور آدمی ہوتا تو اس کا دم گھٹ جاتا''۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے ان کی ہنسی میں چیڑ کے درختوں سے گزرتی ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ اور زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی بات سے زیادہ مجھے ان کے حلیے پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک اون میں لپٹے ہوئے تھے۔ اونی بنیان' اونی سوئٹر' اونی قمیص' اونی پاجامہ' اونی جرابیں اور ان سب کے اوپر مضحکہ خیز حد تک موٹا اور لمبا کوٹ جس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد وہ دستانوں کی ضرورت سے بھی بے نیاز ہو سکتے تھے۔ فقط ان کے چہرے پر اون نہیں تھی۔ لیکن وہاں ان کی برف جیسی سفید بھنویں اور داڑھی بھی اون جیسا ہی تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

نانا ابا کے کپڑے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے باہر پوری وادی برف سے ڈھکی ہو گی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ہر چیز بہار کی خوش گوار دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ پھول اور پودے خوشی سے لہراتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف رنگا رنگ پرندے چہچہا رہے تھے۔ مویشیوں کی آنکھیں بھی اندرونی سرشاری سے چمک رہی تھیں۔ اون کے ڈھیر میں سمائے ہوئے نانا ابا کو دیکھنے کے بعد جب میں

نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو میری ہنسی کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ نانا ابا بھی میرے ساتھ مسلسل ہنستے رہے۔
''آج میں اپنے پرانے دوست سے بھی ملوں گا'' انہوں نے کہا۔
''آپ کا پرانا دوست کون ہے نانا ابا؟'' میں نے پوچھا۔
انہوں نے میرے ہونٹ ہلتے دیکھے' لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیا وہ کہتے تو میں اپنی بات دہرا دیتا' مگر میرے سامنے اپنی سماعت کی کمزوری کا اعتراف کرنے میں انہیں سبکی محسوس ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں بھی ان کی انا قائم تھی۔
امی نے ایک ایک کرکے ان کے ہاتھوں پر اونی دستانے چڑھا دیے تو وہ اپنی چہل قدمی کی چھڑی تھام کر کھڑے ہوئے۔
''آج میں اس سے بھی ملوں گا'' انہوں نے امی کو بتایا۔ ''وہ وہیں ہوگا''۔
امی نے دروازہ کھولا تو نانا ابا آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن امی نے منع کر دیا۔ ''تمہارے نانا تنہا سیر کرنا پسند کرتے ہیں'' امی نے کہا۔ ''وہ شروع سے ایسے ہیں۔ تنہا اور خود پسند...... وہ جوانی میں بہت طاقتور آدمی تھے...... طاقت ور اور دلیر''۔ اب امی ایسے لہجے میں بول رہی تھیں جیسے وہ میری موجودگی سے بے خبر ہو کر خود کلامی میں مصروف ہوں۔ ''ان کا کام شہتیر کاٹنا تھا۔ دور دور تک ان جیسے مضبوط بازوؤں والا جوان نہیں تھا۔ وہ بہت وزنی کلہاڑی استعمال کرتے تھے۔ پھر ان کی ضرب...... کلہاڑی لکڑی میں اتنی دور تک اتر جاتی تھی کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔ اور اگر کبھی کلہاڑی شہتیر میں اٹک جاتی تو وہ اُسے کلہاڑی سمیت کندھے پر اٹھا کر زمین پر پٹختے تھے...... راہ چلتی عورتیں رُک جاتی تھیں''
نانا ابا اب کھیت عبور کر رہے تھے۔ اور میں اور امی دروازے پر کھڑے انہیں مسلسل دیکھ رہے تھے۔
''نانا کا پرانا دوست کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''کوئی نہیں''۔
''وہ کسی سے ملنے کی بات کر رہے تھے''۔
''اوہ۔ ہاں...... یہ بس ایک بات ہے محض ایک بات''۔
کھیت عبور کرتے ہی نانا ابا چیڑ کے پہلے درخت کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے

ایک ایک کر کے دستانے اتار کر کوٹ کی جیبوں میں رکھے اور اتنی آہستگی سے زمین پر جھکے جیسے پودا ہوا کے زور سے ایک سمت کو جھکنے لگتا ہے۔ جب وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ کھڑے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں چیڑ کا ایک کھوکھا تھا۔ وہ کھوکھے کو اپنے چوڑے چکلے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگے۔ دیر تک ٹٹولنے کے بعد وہ اس کی ایک ایک پرت کو یوں چھیلنے لگے جیسے اس کے مرکز میں انہیں کوئی بہت قیمتی چیز ملنے کی توقع ہو۔ جب کھوکھا آخری حد تک ادھڑ گیا تو انہوں نے اسے نہایت اطمینان سے واپس زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ چیڑ کے ایک چھوٹے سے درخت کے پتوں سے کھیلنے لگے۔ انہوں نے پتے کے ایک ایک نوکیلے تنکے کو پیار سے سہلایا۔ اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے آگے کو روانہ ہو گئے۔

''نانا ابا کیا کر رہے ہیں؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

امی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ گہری سوچ میں تھیں۔

''نانا ابا کب سے ہمارے ساتھ ہیں؟'' میں نے ذرا بلند آواز میں سوال کیا۔

''تم ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے'' ۔ وہ بولیں۔ ''گیارہ سال ہو گئے۔ انہوں نے اسی برس کی عمر میں کلہاڑی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ اب وہ اکیانوے سال کے ہیں۔ وہ کاشت کاری جاری رکھنا چاہتے تھے مگر......''۔

میں نانا ابا کے بارے میں حیرت انگیز باتیں سن چکا تھا۔ امی نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ چھوٹی تھیں تو وہ اور ان کے قصبے کی دوسری لڑکیاں نانا ابا کو شدید ترین جاڑوں میں ننگے پاؤں کام کرتے دیکھ کر سمجھتی تھیں کہ وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہیں' یا ان پر کسی بزرگ کی دعا کا سایہ ہے جس کے باعث وہ بیماریوں اور موسم کے اثرات سے مستقل طور پر محفوظ ہو گئے ہیں نانا ابا کو جب کوئی بہت مضبوط اور بڑی گانٹھوں والی لکڑی چیرنی ہوتی تو وہ قمیص بھی اتار دیتے تھے کیوں کہ اس طرح ان کے بازو زیادہ آسانی سے حرکت کر سکتے تھے ایسے موقعوں پر امی آس پاس رہنے والی اپنی سہیلیوں کو خاص طور پر بلا کر انہیں کام کرتے دکھاتی تھیں۔ وہ کام ختم کر کے گھر واپس آتے تو اس وقت تک ان کے چہرے سے بہہ کر داڑھی میں آجانے والے پسینے کے قطرے شیشے کی کرچیوں جیسے ہو جاتے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے داڑھی میں انگلیاں پھیرتے تو پسینے کے منجمد قطرے موتیوں کی طرح بکھر جاتے۔ اور اب امی انہیں پوری سردیاں

کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ انہیں سرد ہوا سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ وہ بوڑھے ہو گئے تھے۔

میں نانا ابا کو احتیاط سے چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا تجزیہ کر رہے تھے ایک مرتبہ انہوں نے چھڑی کی نوک سے اپنے سر پر منڈلانے والی تتلی کو چھیڑا اور مسکراتے ہوئے اس سے کچھ کہنا چاہا۔ ان گنت رنگوں والی تتلی جو بہار کی شفاف و نشیلی ہوا میں جھوم رہی تھی' غوطہ لگا کر دور چلی گئی۔ ہوا کا جھونکا آتا تو نانا ابا مسکرا کر اپنا چہرہ ایسے زاویے پر لے آتے کہ ان کی سفید' گھنی داڑھی عین درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔ جب تک جھونکے کا زور قائم رہتا وہ یوں ہی منہ اٹھائے کھڑے رہتے۔ مویشیوں کے باڑے کے سامنے انہوں نے بکریوں کو بلانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر مخصوص آواز نکالی۔ ان کی آواز سنتے ہی بکریاں دوڑتی چلی آئیں۔ بکریوں کے سر یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ نانا ابا سے ملاقات ہونے پر خوشی سے سرشار ہوں۔ نانا ابا نے اپنی چھڑی باڑے کے پھاٹک کے ساتھ کھڑی کر دی اور بکریوں کی کمر سہلا کر اُن سے گفتگو کرنے لگے۔ وہ ایک ایک بکری سے اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے مخصوص لہراتی ہوئی دھیمی چال کے ساتھ پھولدار درختوں کے جھنڈ کی طرف گھوم گئے۔ سرخ پھولوں سے لدی ہوئی ایک شاخ کھینچ کر وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک ایک پھول کا معائنہ کرنے لگے۔ موٹے اونی کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باعث وہ خود بھی کسی درخت کا تنا معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے بل کھاتی ٹہنی کو چھوڑا تو وہ پورے درخت میں ہلچل مچاتی اپنی جگہ پر واپس چلی گئی۔

''امی' دیکھیں نانا ابا کیا کر رہے ہیں'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''دیکھ رہی ہوں'' امی نے اُداسی سے کہا۔ ''ابا نے اتنی بہاریں دیکھی ہیں' اتنی بہاریں...... معلوم نہیں وہ اور کتنی بہاریں دیکھیں گے؟''۔

نانا ابا کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ انہوں نے راستے میں آنے والی ہر چیز کو چھو کر دیکھا اور اس سے باتیں کیں۔ ایک بھونرے سے وہ کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اور اسے ہاتھ ہلا کر ہدایات دیں۔ مکھیوں کے چھتوں کے نیچے وہ دیر تک کھڑے رہے۔ انہیں مکھیوں کی مصروفیت دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں کسی شہد کی مکھی نے ڈنگ نہیں

مارا۔ چند مکھیاں اپنے چھتے کو چھوڑ کر ان کے چہرے کے آس پاس منڈلاتی رہیں' اور پھر نزدیک کی جھاڑیوں میں غائب ہوگئیں۔ کھیت کے پاس ایک خاردار جھاڑی میں انہیں تتلی کا خول پڑا نظر آیا۔ وہ خول اٹھا کر اسے چیرنے لگے مگر ان کے ہاتھ کمزور ہو چکے تھے اور ان میں ہلکا سا رعشہ بھی تھا۔ وہ چند لمحوں تک خول کو الگ کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے' اور پھر انھوں نے برا منہ بنا کر اسے واپس جھاڑی میں پھینک دیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید یہ اسی تتلی کا متروک گھر ہو جو کچھ دیر پہلے ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

''امی آپ مجھے اجازت دیں تو میں جا کر نانا ابا کو یہ خول چیر دوں'' میں نے کہا

''تم اپنے نانا کو تنہا رہنے دو'' امی نے کہا۔ ''وہ بہار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں''

مجھے خیال آیا کہ سردیوں کے بعد آج امی نے پہلی بار نانا ابا کو گھر سے باہر جانے دیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ نانا ابا کو نکھری ہوئی دھوپ' اور چیڑ کے درختوں میں گونجتی ہوئی بہار کی ہوا' اور سرخ پھولوں والے درخت اور بکریاں اور تتلیوں کے خول اور شہد کی مکھیاں بہت اچھی لگتی ہیں اب وہ اگلی سردیوں کی آمد تک روزانہ یوں ہی چہل قدمی کیا کریں گے اور راستے میں آنے والی ہر چیز کو غور سے دیکھیں گے۔ اس سال ان کی چہل قدمی کا راستہ گزشتہ برس کے مقابلے میں مختصر ہو گیا تھا۔ ان کی پیدل چلنے کی صلاحیت ہر برس نسبتاً کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ مویشیوں کے باڑے کے اگلے پھاٹک تک نہیں گئے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جب میں نے پہلی بار ان کو سیر کے لیے جاتے دیکھا تھا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے جب کہ آج میں اور امی انہیں تمام وقت دروازے پر کھڑے دیکھتے رہے۔

واپسی پر نانا ابا گھر کی پچھلی سمت چلے گئے۔

''اب نانا ابا کہاں جا رہے ہیں'' میں نے امی سے پوچھا۔

وہ گودام کے تختوں پر بیٹھ کے دھوپ تاپیں گے۔ تم انہیں مت تنگ کرنا'' امی نے کہا۔

''میں انہیں کچھ نہیں کہوں گا'' میں نے جواب دیا۔ ''میں صرف دیکھوں گا''

امی خاموش ہو گئیں۔ لیکن جب مکان کی عقبی کھڑکیوں کی طرف بھاگ کر گیا تو وہ بھی وہاں آگئیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ میں نانا ابا کے پاس جا کر ان کی تنہائی میں مخل ہوں گا۔ میں اور امی ایک ہی کھڑکی سے نانا ابا کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے گودام میں آکر اپنی چھڑی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ بہار کا گہرا نیلا آسمان آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ بے داغ نیلی سطح

پر تیرنے والے اُجلے سفید بادلوں کے ٹکڑے دل میں عجیب طرح کی امنگ پیدا کر رہے تھے۔
نانا ابا دھیرے دھیرے ایک تختے پر بیٹھنے کے بعد سر جھکا کر یوں دائیں بائیں دیکھنے لگے جیسے زمین پر کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ اچانک ان کی آنکھوں کو چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اوہ' تو تم یہاں ہو۔ مجھے معلوم تھا تم یہیں ہو گے۔ کیسے ہو پیارے دوست' کیسے ہو؟''

''یہ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟'' میں نے امی سے پوچھا۔

امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کھڑکی کی سلاخیں تھام کر اونچا ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نانا ابا ایک کچھوے سے کھیل رہے ہیں۔

''وہ تو کچھوے سے باتیں کر رہے ہیں۔'' میں نے امی کو بتایا۔

''مجھے معلوم ہے'' امی نے کہا۔

''وہ کچھوے کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں اور کچھوا انہیں کچھ نہیں کہہ رہا''

''مجھے معلوم ہے'' امی نے دہرایا۔

''لیکن میں ہاتھ نزدیک لے جاؤں تو کچھوا مجھے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔''...... یا اپنا سر اندر کر لیتا ہے۔ مگر نانا ابا سے کھیل رہا ہے۔ دیکھیں''۔

''کچھوا تمہارے نانا کو پہچانتا ہے''۔

''پہچانتا تو مجھے بھی ہے اسے معلوم ہے میں اسی گھر میں رہتا ہوں''۔

امی خاموش رہیں۔ وہ کھڑکی سے نانا ابا کو مسلسل دیکھ رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

''دوست' کیسی پیاری' دھوپ پھیلی ہے۔ مزہ آرہا ہے نا؟'' انہوں نے کچھوے سے پوچھا۔
کچھوے نے گردن لمبی کر کے منہ کو یوں ہلکا سا خم دیا اس کی دائیں آنکھ نانا ابا کے چہرے پر مرکوز ہوگئی۔ وہ ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

''دوست' اس سال بہت سخت سردی پڑی' ان کے لہجے میں ہمدردی تھی۔'' گودام میں تو اور بھی ٹھنڈ ہوئی ہوگی۔ لیکن خیر کڑا وقت بھی گزر ہی جاتا ہے۔''

''امی کیا کچھوا نانا ابا کی باتیں سمجھ رہا ہے'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں'' امی نے کہا۔

''مجھے تم سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ دوست' پیارے دوست'' نانا ابا نے کچھوے کی گردن

سہلائی۔

''امی نانا ابا کو کچھوا کاٹ لے گا۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے منہ کے بہت نزدیک لے گئے ہیں'' میں چاہتا تھا امی انہیں آواز دے کر روک لیں۔

''اس کچھوے کو ہمارے گودام میں سردیاں گزارتے پندرہ سال ہو گئے ہیں'' امی مطمئن لہجے میں بولیں۔ ''ابا کی اس سے گیارہ برس پرانی دوستی ہے وہ اس سے ہر بہار میں اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کچھوا ابھی بہت بوڑھا ہے''۔

یہ انہیں کس طرح معلوم ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

'' کچھوے کے خول پر ۱۸۸۵ کی تاریخ کھدی ہوئی ہے'' امی نے بتایا۔

اس لحاظ سے اس کی عمر ۹۵ برس بنتی ہے یوں تو یہ ۹۵ برس سے بھی زیادہ کا ہے کیونکہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ جب اس کی پشت پر یہ تاریخ کندہ کی گئی تو یہ کتنے برس کا تھا''

''اس کی پیٹھ پر ۱۸۸۵ء کس نے لکھا؟''

''ہمیں نہیں معلوم'' امی نے کہا۔ ''مگر یہ طے ہے کہ جس نے بھی یہ تاریخ لکھی تھی۔ اب تک اس کی قبر بھی بیٹھ چکی ہوگی''

میں خاموش ہو گیا مجھے عجیب خیال آنے لگے۔ کچھوؤں کی عمریں اتنی طویل کیوں ہوتی ہیں؟'' اس آدمی کی شکل کیسی ہوگی جس نے اس کی پیٹھ پر گزشتہ صدی کی تاریخ لکھی۔ وہ بھی تمام عمر اسی وادی میں رہا ہوگا۔ اس کا گھر بھی ہمارے گھر جیسا ہوگا۔ اس کے بچے بھی بہار کے دنوں میں تتلیاں پکڑتے ہوں گے، مکھیوں کے چھتوں سے شہد نکالتے ہوں گے۔ بوڑھا ہو کر وہ بھی نانا ابا کی طرح وادی میں چہل قدمی کرتا ہوگا۔ اور جب اس نے کچھوے کی پشت پر تاریخ درج کی ہوگی تو یقیناً اس نے کچھوے سے باتیں بھی کی ہوں گی۔

''''تو تم خیریت سے رہے، دوست'' نانا ابا کی آواز آئی۔

'' کچھوے نے گردن ہلائی۔

''ہاں۔ اپنی عمر کے لحاظ سے میں بھی ٹھیک رہا''۔ انہوں نے کہا۔

''امی'' میں نے بے اختیار سوال کیا۔ ''کیا کچھوے نے نانا ابا سے ان کی طبیعت پوچھی ہے؟''

'' مجھے نہیں معلوم'' امی کے لہجے کی اداسی گہری ہو گئی تھی'' میں کچھوؤں کی زبان نہیں سمجھتی''

''لیکن نانا ابا سمجھتے ہیں''

''ہاں''

''ٹماٹر پکنے کے زمانے آ گئے'' نانا ابا نے کچھوے کو بتایا۔ ''بس کچھ دن اور انتظار کرو دوست دونوں باغ میں ساتھ چلیں گے''

''کچھوے ٹماٹر کھاتے ہیں؟'' میں نے امی سے پوچھا۔

''بہت شوق سے'' امی نے کہا۔ ''جب بھی ٹماٹر کی فصل تیار ہوتی ہے یہ کچھوا ہمارا خصوصی مہمان ہوتا ہے۔ پندرہ سال قبل ایک مرتبہ اسی موسم میں تمہارے ابا ٹماٹروں کے کھیت سے کچھوؤں کو نکال رہے تھے کہ ان کی نظر اس کی پشت پر کھدی تاریخ پر پڑ گئی۔ مجھے بلا کر انہوں نے یہ کچھوا دکھایا۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ اتنے بوڑھے کچھوے کو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ اس دن کے بعد سے یہ سردیاں ہمارے گودام میں تختوں کے نیچے گزارتا ہے۔ اور گرمیوں میں ہمارے کھیتوں میں گھومتا ہے۔ تمہارے نانا تو اس سے بہت مانوس ہو گئے ہیں''

''امی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''مجھے تو نانا ابا بھی کچھوے جیسے لگتے ہیں''

امی کچھ نہیں بولیں۔ میں نے سر اٹھایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ انہوں نے پلکیں جھپکیں تو آنسو ان کے چہرے کو بھگوتے ہوئے زمین پر ٹپکنے لگے۔ وہ یکدم سنبھلیں اور قمیص کے دامن سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔

''تم سے ملاقات ہو گی'' باہر نانا ابا کچھوے سے کہہ رہے تھے۔ ''اب میں گھر واپس جاؤں گا۔ مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے''

کچھوے نے اپنے بھاری بدن کو حرکت دیے بغیر اپنی شکن آلود گردن بہار کی خوش گوار ہوا میں لہرائی۔ نانا ابا نے اونی کپڑوں میں لپٹے اپنے لمبے چوڑے وجود کو آہستہ آہستہ اُٹھایا۔

''خدا حافظ دوست، پرانے دوست!''

کچھوے نے اپنی طویل گردن کو خم دیا اور ایک آنکھ نانا ابا کی سمت اٹھائی۔ اس کی آنکھ دھوپ میں چمک رہی تھی۔

نانا ابا نے چھڑی اٹھائی اور نہایت احتیاط سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے گھر کی جانب چلنے لگے۔ کچھوا کچھ دیر انہیں ایک آنکھ سے دیکھتا رہا، پھر اس نے گردن گھما کر دوسری آنکھ ان پر مرکوز کر دی۔

☆

اردو کے منفرد نقاد پروفیسر حسن عسکری نے ایک جگہ اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے ''...... ہر چند کہ بارہویں جماعت کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ افسانے اور ناول میں کیا فرق ہوتا ہے''

غور کرنے پر پروفیسر کا مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ افسانے کو ناول سے کیوں کر مختلف ثابت کیا جاسکتا ہے؟ یوں کہ افسانہ مختصر اور ناول طویل ہوتا ہے؟ لیکن اختصار اور طوالت میں فقط کمیت کا فرق (Qualitative Difference) ہے کمیت کو پیمانہ بنایا جائے تو مختصر نظم اور طویل نظم بھی مختلف اصنافِ ادب شمار ہوں گی۔ اور ناولٹ اور ناول کو بھی اسی صورتحال کا سامنا ہوگا۔ اس کے برعکس کیفے کے فرق (Qualitative Difference) کے معیار سے پرکھا جائے تو شاعری اور نثر نگاری کی حد بندی بھی موہوم ہو جاتی ہے۔ ہر اعلیٰ تحریر ادب اور تمام شاعر و نثر نگار محض لکھاری بن جاتے ہیں۔

''ایک اور بہار'' یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے بظاہر افسانہ اور بباطن نظم یہ ''تحریر'' باشعور قاری کی آنکھیں نم کر دیتی ہے دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جلالی طبیعت اور مردانہ وجاہت کے حامل بزرگ کی زمیں بوسی بہت دردناک ہوتی ہے۔ نطشے کا ''مردِ مومن'' ایک جگہ اپنی صورتِ حال یوں بیان کرتا ہے ''...... میں اس مضبوط اور فلک بوس درخت کی طرح ہوں جس کی طاقت اور مزاحمت سے درخت کاٹنے والوں کو چڑ ہو جاتی ہے اور وہ اس ضدی شجر پر مزید تندی و تیزی سے تلیشہ چلاتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ایسا درخت جب آخر کار گرتا ہے تو اسے کاٹنے والوں کے بھی دل دہل جاتے ہیں۔ ان کے وجود میں کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے''

''ایک اور بہار'' کا بنیادی کردار ناقابلِ بیان حزن کا حامل ہے اس کے وجود میں صبح کے تارے جیسا دھیما پن اور پانی پر جھکی چٹان جیسی مضبوطی ہے جو بیک وقت متاثر اور اداس کرتی ہے اس افسانے کی دردانگیز گہرائی سے آشنا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قاری خود بھی کم از کم ادھیڑ عمری کی منزل پر ہو۔

بہت دنوں میں سمجھ مجھ کو حالِ غیر آیا
کہ میری عمر میں جب ماہ و سالِ غیر آیا

جیروم ویڈمین

اندھیرا

میرے ابا کی ایک عادت بہت عجیب ہے۔ وہ تاریکی میں تنہا بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات میں بہت دیر سے گھر لوٹتا ہوں۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ میں اپنی والدہ کو جو ایک سطحی نیند سونے والی خاتون ہیں' پریشان کرنا نہیں چاہتا اس لیے خاموشی سے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ ایڑیوں کے بل اپنے کمرے میں داخل ہو کر اندھیرے میں کپڑے بدلتا ہوں۔ سونے سے پہلے پانی پینے کے لیے باورچی خانے کا رُخ کرتا ہوں۔ جوتوں کے بغیر میرے پاؤں کسی طرح آواز پیدا نہیں کرتے۔ باورچی خانے کی کھڑکی کے سامنے میں ابا سے تقریباً ٹکرا جاتا ہوں۔ ابا اپنے مخصوص کونے میں کرسی پر بیٹھے پائپ پی رہے ہیں۔ باورچی خانے میں پائپ کے خوشبودار تمباکو کا دھواں بھرا ہے۔

''ہیلو ابا'' میں کہتا ہوں۔

''ہیلو بیٹا'' ابا جواب دیتے ہیں۔

''ابا آپ اب تک سوئے نہیں؟''

''سو جاؤں گا۔ بیٹے''۔

لیکن وہ وہاں سے نہیں اٹھتے۔ کمرے میں واپس آ کر میں چاہے جتنی دیر تک جاگتا رہوں مجھے علم ہوتا ہے کہ وہ اب تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اپنے پائپ میں تازہ تمبا کو بھر رہے ہیں۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میں اپنے کمرے میں مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی والدہ کی باتوں کی آواز آ رہی ہے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو بستر پر دراز ہوتے سن سکتا ہوں۔ میری بہن کچھ گنگنا رہی ہے۔ وہ گنگنانا ختم کر کے مرتبانوں اور برتنوں سے اُلجھنے لگتی ہے۔ حتی کہ خاموش ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی سو گئی ہے۔ آخر والدہ کو بھی ''شب بخیر'' کہنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں مطالعہ جاری رکھتا ہوں۔ مجھے پیاس محسوس ہوتی ہے۔ (میں بہت پانی پیتا ہوں) میں باورچی خانے میں جاتا ہوں۔ ابا وہیں بیٹھے ہیں۔ اکثر میں اُن کے بارے

میں بھول چکا ہوتا ہوں۔ اس لیے ڈر جاتا ہوں۔ لیکن وہ وہیں ہیں۔ تمباکونوشی کر رہے ہیں۔
اور سوچ رہے ہیں۔

''ابا آپ سوتے کیوں نہیں؟''

''سو جاؤں گا۔''

مگر وہ نہیں سوتے۔ وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ تمباکونوشی کرتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ مجھے تشویش ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ کس چیز کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا بھی تھا۔

''ابا آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں'' انہوں نے جواب دیا تھا۔

ایک بار میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے بستر پر واپس چلا آیا۔ کئی گھنٹوں بعد پیاس سے میری آنکھ دوبارہ کھلی۔ باورچی خانے میں داخل ہوا تو وہ اسی جگہ' اُسی انداز میں موجود تھے۔ اُن کا پائپ بجھ چکا تھا۔ لیکن اُن کی نظریں بدستور کھڑکی سے باہر خلا میں گڑی تھیں۔ چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو میں نے بغیر بتی جلائے گلاس میں پانی بھر کر پیا۔ اس دوران نہ تو انہوں نے جنبش کی نہ پلکیں جھپکائیں۔ مجھے خیال آیا کہ وہ میری موجودگی سے آگاہ نہیں ہیں۔ میں نے خوف محسوس کیا۔

''ابا آپ بستر پر کیوں نہیں جاتے؟''

''چلا جاؤں گا' بیٹے'' انہوں نے کہا۔ ''میرا انتظار مت کرو''

''لیکن ابا'' میں نے اُلجھ کر کہا۔ ''آپ یہاں کتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ یہ سب کیا ہے۔ آپ کیا سوچتے رہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں بیٹے'' انہوں نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ بس یہ آرام دہ ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے''

ان کا طرزِ گفتگو قائل کرنے والا تھا۔ اُن کی آواز ہموار اور خوش گوار تھی۔ وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہیں لگتے تھے۔ ہر چیز نارمل تھی۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اندھیرے میں ایک کرسی پر تنہا بیٹھے رہنا آرام دہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

اصل بات کیا ہے؟

میں نے تمام ممکنہ مسائل کا تجزیہ شروع کیا۔ مالی پریشانی؟؟

نہیں۔اتنا تو آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مالی پریشانی کا نتیجہ نہیں ہے۔ہم دولت مند لوگوں میں شمار نہیں ہوتے لیکن ایسی کوئی دشواری پیش آئے تو ابا فوراً کھل کر بات کرتے ہیں۔ یہ اُن کی صحت کا مسئلہ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اس سلسلے میں کبھی خاموش نہیں رہتے۔ہم خوش حالی کے معاملے میں زیادہ خوش قسمت نہ سہی۔ لیکن تندرستی کی دولت سے ہمارا گھرانہ مالا مال ہے۔(اللہ کا شکر ادا کرو' والدہ کہتی ہیں۔''اُس نے کسی چیز میں کمی نہیں رکھی)

مگر ابا کو کیا ہو گیا ہے؟؟

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔میری تشویش بڑھتی چلی جاتی ہے۔ممکن ہے وہ اپنے بھائیوں کو یاد کرتے ہوں یا انہیں اپنے والد اور والدہ کی یاد ستاتی ہو۔مگر وہ سب فوت ہو چکے ہیں اور ابا غمزدہ رہنے والوں میں سے نہیں ہیں۔غمزدہ تو وہ لگتے بھی نہیں۔غم منانے والا آدمی اس قدر پرسکون کیسے ہوسکتا ہے۔یقیناً یہ سوگواری سے مختلف کیفیت ہے۔ممکن ہے اس طرح بیٹھے رہنا ابا کے لیے واقعی آرام دہ ثابت ہوتا ہو۔لیکن اس سلسلے میں میری تشویش تو حق بجانب ہے۔

کاش میں یہ جان سکتا کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔اس صورت میں اُن کی مدد کی جاسکتی ہے۔شاید انہیں مدد کی ضرورت ہی نہ ہو۔لیکن معلوم ہو جائے کہ وہ کیا سوچتے ہیں تو کم از کم تشویش ختم ہو جائے گی۔

آخر وہ تاریکی میں کیوں بیٹھے رہتے ہیں؟ کیا اُن کا دماغ متاثر ہو رہا ہے؟

پچاس سال کی عمر میں یہ دور کی بات لگتی ہے۔اور پھر گھریلو معاملات میں وہ دانش مندی کی باتیں کرتے ہیں' بلکہ کسی بھی لحاظ سے اُن میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔انہیں اب تک مرغی کا سوپ پسند ہے۔وہ اب بھی اخبار کا اندرونی حصہ پہلے پڑھتے ہیں۔ بڑے کالرز کی قمیص اور سیدھی پتلون آج بھی ان کا پسندیدہ لباس ہے۔حسب سابق اُن کی یہی رائے ہے کہ سیاسی پارٹیاں' سرمایہ داروں کے اشاروں پر چلتی ہیں......وہ ہر طرح سے ویسے ہی ہیں۔یہاں تک کہ دیکھنے میں بھی وہ ایسے ہی لگتے ہیں جیسے وہ گزشتہ دس سال سے نظر آرہے ہیں۔تمام عزیز و اقربا یہی کہتے ہیں۔

''انہوں نے اپنی خوب حفاظت کی ہے''

''ہر کوئی خود کو اس طرح سنبھال کر نہیں رکھ سکتا''

اس کے باوجود وہ مستقل اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ تنہا' خاموش' بغیر پلکیں جھپکائے سامنے دیکھتے ہیں اور صبح تک تمباکو نوشی کرتے ہیں۔

اگر مجھے یقین ہو جائے کہ یہ واقعی "آرام دہ" ہے تو میں اس پر توجہ ہی نہ دوں لیکن فرض کیا کہ یہ آرام دہ نہیں ہے؟ فرض کیا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہم میں سے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی منفی جذبہ ہو۔ کوئی نقصان دہ کیفیت! اگر انہیں مدد کی ضرورت ہے تو انہیں منہ سے بولنا پڑے گا۔ اُن کی تیوریوں پر بل پڑیں یا وہ گریہ کریں' یا قہقہے لگائیں۔ کچھ تو کریں۔ مگر وہ کچھ نہیں کرتے۔ بس تاریکی میں بیٹھے رہتے ہیں۔

آخر کار مجھے غصہ آجاتا ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ میری تشویش سے زیادہ میرا غیر مطمئن جذبہ تجسس ہو۔ بہر حال مجھے غصہ آجاتا ہے۔

"ابا' آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹے' کچھ بھی نہیں"

مگر اس مرتبہ میں آسانی سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی ہے۔

"تو پھر آپ اتنی رات گئے یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟"

"یہ آرام دہ ہے۔ مجھے پسند ہے"

یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ کل وہ پھر یہاں بیٹھے ہوں گے' اور میں از سرِ نو تشویش میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ آج اس کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں مٹھیاں بھینچ لیتا ہوں۔

"ابا آپ یہاں کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کیا سوچتے ہیں۔ آپ کو کیا پریشانی ہے...... آخر آپ کا مسئلہ کیا ہے؟؟"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں بیٹے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس یہ آرام دہ ہے۔ اتنی سی بات ہے۔ اب تم جا کر سو جاؤ"۔

میرا غصہ ختم ہونے لگتا ہے۔ لیکن میں تشویش کا کیا کروں؟ میری الجھن فقط کسی ٹھوس جواب سے دور ہو سکتی ہے۔ یہ کیا مذاق ہے؟ وہ مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی واضح جواب نہ ملا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا اصرار بڑھ جاتا ہے۔ میں ہر لفظ الگ الگ ادا کرتا ہوں۔

"ابا۔ لیکن۔ آخر۔ آپ۔ کیا۔ سوچتے۔ ہیں؟"۔

''کچھ نہیں بیٹے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ کوئی خاص چیز نہیں۔ عام باتیں''۔

میں اس جواب سے کیا نتیجہ اخذ کرسکتا ہوں؟۔

آج پھر بہت دیر ہوگئی ہے۔ سڑک پر خاموشی چھا چکی ہے۔ اور مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں دبے پاؤں زینہ چڑھتا ہوں۔ آہٹ پیدا کرنے والی سیڑھیوں سے بچتا ہوا۔ خاموشی سے دروازہ کھول کر میں ایڑیوں کے بل بستر تک چلا جاتا ہوں۔ کپڑے اتارتے ہوئے مجھے پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ اسی خاموشی سے میں باورچی خانے کا رُخ کرتا ہوں۔ پانی تک پہنچنے سے پہلے ہی میں جانتا ہوں کہ ابا وہیں بیٹھے ہیں۔

آج میں اُن کا ہلکا سا خاکہ دیکھ سکتا ہوں۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اُن کے بازو ان کے گھٹنوں پر دھرے ہیں۔ پائپ دانتوں میں دبائے بغیر پلکیں جھپکائے وہ سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اُنھیں میری موجودگی کا قطعی علم نہیں ہے۔ میں خاموشی سے اُنھیں دیکھتا رہتا ہوں۔

چاروں طرف مکمل خاموشی ہے لیکن تاریکی خود اپنی سرسراہٹوں سے لبریز ہے۔ یہ آوازیں مجھے بے حس و حرکت کھڑے رہنے پر سنائی دی ہیں۔ میز پر رکھی گھڑی کی ٹک ٹک۔ کسی دوسرے محلے سے گزرنے والی گاڑی کی مدھم سی گونج۔ ہوا سے اڑنے والی کاغذ کی آہٹ۔ یہ آوازیں یوں بلند اور دھیمی ہورہی ہیں، جیسے اندھیرا سانس لے رہا ہو۔ عجیب پر کیف سنسناہٹ ہے۔

اچانک میرا خشک حلق مجھے کچھ یاد دلاتا ہے۔ میں تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوتا ہوں۔

''ہیلو۔ ابا'' میں کہتا ہوں

''ہیلو بیٹے'' اُن کی آواز مدہم اور خواب آلود ہے۔ وہ پہلو نہیں بدلتے، نہ ہی خلا سے نظریں ہٹاتے ہیں۔

مجھے نلکا تلاش کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ کھڑکی سے آنے والی اسٹریٹ لیمپ کی مدہم روشنی کمرے کو زیادہ پر اسرار بنا رہی ہے۔ میں مجبوراً بجلی کا سوئچ دباتا ہوں۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھے ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔

''کیا ہوا ابا؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''کچھ نہیں۔ مجھے روشنی بری لگتی ہے''۔ وہ اطمینان سے کہتے۔

''روشنی بری لگتی ہے؟'' میں حیرت سے پوچھتا ہوں ''کیوں؟''

''ایسے ہی'' وہ جواب دیتے ہیں۔ مجھے بری لگتی ہے''

میں بتی بند کر دیتا ہوں اور آہستہ آہستہ پانی پیتا ہوں۔ ''مجھے بہت تحمل سے کام لینا ہوگا'' میں خود کو سمجھاتا ہوں۔ ''اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے تحمل ضروری ہے''

''آپ اب سوتے کیوں نہیں؟ اتنی دیر تک تاریکی میں کیوں بیٹھے ہیں؟؟''

''اچھا لگتا ہے'' وہ کہتے ہیں۔ ''میں روشنی کا عادی نہیں ہو سکا۔ جب میں چھوٹا تھا تو ہمارے قصبے میں بجلی نہیں آئی تھی''

مجھے ان چند لمحوں کی سرشاری اور لطف یاد آیا۔ جب میں اندھیرے میں خاموشی سے ابا کو دیکھ رہا تھا۔

''واقعی؟ آپ کا مطلب ہے یہ سب کچھ بس یوں ہی ہے۔ آپ اندھیرے میں صرف اس لیے بیٹھتے ہیں کہ آپ کو اچھا لگتا ہے۔'' میرے لہجے میں خوشی اور اطمینان کی ہلکی سی لہر شامل ہو جاتی ہے۔

''ہاں'' وہ کہتے ہیں۔ ''روشنی ہو تو مجھ سے سوچا نہیں جاتا''

میں گلاس نیچے رکھ کر اپنے کمرے میں واپس جانے کے لیے گھومتا ہوں۔ ''شب بخیر ابا'' میں جانے سے پہلے کہتا ہوں۔

''شب بخیر بیٹے'' وہ جواب دیتے ہیں۔

اچانک مجھے یاد آتا ہے اور میں رخ واپس پھیرتا ہوں۔ ''ابا آپ سوچتے کیا ہیں؟''

''کچھ نہیں'' اُن کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کا لہجہ ایک مرتبہ پھر ہموار اور خوش گوار ہو چکا ہے۔ ''کچھ بھی نہیں'' وہ آہستہ سے دہراتے ہیں۔

☆

''ریت کے ہر ذرے میں ایک گوتم بدھ موجود ہے''

کچھ بدھ بھکشو اس قال کو اپنا حال بنا کر کائنات کے مشاہدے میں محو ہو جاتے ہیں۔ دشوار گزار وادیوں میں قیام کرنے والے یہ بھکشو ایک لحاظ سے دنیا کے سب سے زیادہ بالغ لوگ ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تمام مخلوق تمناؤں میں الجھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ بڑوں کے کھلونوں کی قیمت بچوں کے کھلونوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

جب چیلا دریافت کرتا ہے کہ گوتم بدھ سے ملاقات کہاں ممکن ہے تو گرو کہتا ہے۔

''جنوب میں''۔

چیلا جنوب کا رخ کرتا ہے۔ کسی دور دراز خانقاہ کے دروازے پر وہ اپنا سوال دہراتا ہے تو اسے پھر وہی جواب ملتا ہے۔ ''جنوب میں''۔

''میں کب تک جنوب کی سمت سفر کرتا رہوں گا؟'' چیلا اب یہ بات پوچھنے کے قابل ہو چکا ہے۔

''جب تک تم وہاں نہیں پہنچ جاتے جہاں سے چلے تھے'' اسے بتایا جاتا ہے۔

یکلخت چیلے پر عیاں ہوتا ہے کہ دراصل گوتم بدھ خود اس کی ذات میں موجود ہے' اور گرو ابتدا سے اسے یہی سمجھانا چاہتا تھا۔ جب آدمی کو معلوم ہو جائے کہ کائنات کے ہر ذرے میں ایک گوتم بدھ موجود ہے اور خود اس کا وجود بھی اندر سے روشن ہے تو وہ تاریکی اور تنہائی میں نہایت آسائش سے بیٹھ سکتا ہے۔ ''اندھیرا'' کا بنیادی کردار از خود اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ آرزوؤں کی تکمیل اور خواہشوں کے حصول کی لذت اپنی جگہ اہم سہی' مگر سفر کے دوران آنکھیں موند لینا بھی نہال کر دیتا ہے۔

بھکشو سے سوال کیا جائے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے تو لامحالہ جواب ملتا ہے'' کچھ بھی نہیں''

یوگا کی اصطلاح کے اعتبار سے Meditation کا مطلب ہی ''کچھ نہ سوچنا'' ہے۔ اور یہ تجبائی مشکل کام کسی عظیم انکشاف کے بعد ہی سہل ہوتا ہے۔

تاثیر کے لحاظ سے ''اندھیرا'' نہایت شدید کہانی ہے۔ بنیادی کردار مدھم اور سبک انداز میں ابھرتا ہے۔ مگر آخر میں اس کی گرفت بہت سخت ہو جاتی ہے۔ کہانی کار اس بلند منزل تک مکالمے کے راستے سے پہنچا ہے۔ اس اعتبار سے نو آموز افسانہ نگار ''اندھیرا'' سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے کرداروں کی باہمی گفتگو سے بیان میں تنوع پیدا کرنا آسان ہے۔ لیکن اگر مکالمہ سو فی صد فطری انداز میں تحریر نہ ہو سکے تو بیانیہ کا حسن مجروح ہوتا ہے ''اندھیرا'' میں روزمرہ کی باتیں روزمرہ ہی کی سطح پر رہتی ہیں۔ اس کے باوجود قاری سانس لینا بھول جاتا ہے۔ یہ نثر میں سہلِ ممتنع کی مثال ہے۔

۱۹۱۳ء میں پیدا ہونے والا ''جیروم ویڈمین'' ایسی چند مزید کہانیوں کا خالق ہوتا تو اسے بیسویں صدی کے عظیم افسانہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

گریگری فیونٹس

خدا کے نام

سر سبز وادی میں مکئی کے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مکان کے ساتھ شفاف پانی کی ندی ہلکی سی آواز کے ساتھ دائم رواں رہتی تھی۔ لیکن کھیتوں کو فقط بارش کا پانی سیراب کرتا تھا اس دور دراز وادی میں کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لینچو کا مکان تھا۔ لینچو آج صبح سے اپنے مکان کے دروازے پر آبیٹھا آسمان سے نظریں لگائے ہوئے تھا۔ دوپہر کے وقت شمالی افق پر چند کالے بادل دیکھ کر وہ خوشی سے لہرانے لگا۔

''عورت'' لینچو نے اپنی بیوی کو پکارا۔ ''دیکھ لے۔ خدا بخیل نہیں ہے۔ اس کے خزانے کا منہ کھلنے والا ہے''

''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا'' بیوی نے جواب دیا اور دوبارہ آنکھیں میچ کر سلگتی ہوئی لکڑیوں کو پھونکیں مارنے لگی۔

''ہاں...... خدا نے چاہا تو......'' لینچو نے مسکرا کر دہرایا اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پر نتھنے پھلانے لگا۔

لینچو کا بڑا بیٹا فصلوں کے درمیان اُگ آنے والی نقصان دہ جڑی بوٹیوں کو اکھاڑ کر پھینکنے میں تندہی سے مصروف تھا اور چھوٹا بیٹا اور بیٹی گھر کے نزدیک ایک خالی قطعہ اراضی میں کھیل رہے تھے۔

''آجاؤ بچو! کھانا تیار ہے......'' لینچو کی بیوی نے دروازے پر آکر آواز لگائی اور سارا خاندان اپنی مصروفیات ادھوری چھوڑ کر کھانے کی میز پر جمع ہو گیا۔

کھانے کے دوران ہی کھڑکیاں اور دروازے بارش کے قطروں سے گونجنے لگے۔ یکلخت ہوا سرد ہو گئی اور چاروں جانب اندھیرا چھا گیا۔ لینچو فرطِ مسرت سے کھانا ادھورا چھوڑ کر جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنے بدن پر بارش کی پھوار محسوس کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھیگا ہوا واپس آیا تو اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

''......یہ بوندیں نہیں ہیں'' اس نے بیوی کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا ''آسمان سے سکے برس

رہے ہیں۔دولت لٹائی جارہی ہے"

وہ دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا مکئی کی فصل کو موسلا دھار بارش کی دھند میں لپٹا دیکھ کر خوشی سے گنگناتا رہا۔لیکن پھر اچانک ہوا میں تندی پیدا ہونے لگی۔اور چند لمحوں بعد بوندوں کے ساتھ اولے بھی برسنے لگے۔بچے خوشی سے نعرے لگاتے اولے جمع کرنے گھر سے باہر نکل گئے، مگر لینچو کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار ظاہر ہوئے۔

"......عورت!" اس نے گھوم کر اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔"یہ بہت نقصان دہ ہے خدا اب اپنے بادلوں کو سمیٹ لے تو اچھا ہے"

"ہاں۔سمیٹ لے تو اچھا ہے" بیوی نے میز سے برتن اٹھاتے ہوئے دہرایا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک گھنٹے تک لگاتار اولے برستے رہے۔باغات کھیت' مویشیوں کا احاطہ اور گھر کی چھت اولوں سے بھر گئی۔چاروں سمتیں سفید ہوگئیں یوں لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے پوری وادی پر نمک بکھیر دیا ہے۔تمام درختوں سے پتے اور پھل جھڑ گئے۔مکئی کی فصل مکمل تباہ ہوگئی۔لینچو کا دل درد سے بھر گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔ژالہ باری کا زور ٹوٹا تو وہ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا۔

"ٹڈی دَل کا حملہ ہوجائے تو بھی کچھ نہ کچھ بچ جاتا ہے......مگر یہ تو......" اس کا لہجہ گلوگیر ہوگیا اور وہ گیلی مٹی پر بیٹھ گیا "مگر یہ تو مکمل تباہی ہے" چند لمحوں بعد وہ سر اٹھا کر بولا۔"اس مرتبہ ہم دانے دانے کو محتاج ہوجائیں گے"

وہ گہری اداسی کی رات تھی۔تمام گھر والے صبح تک مایوس لہجے میں سرگوشیاں کرتے رہے۔

"اتنی محنت......سب اکارت خدایا!"۔

"اگلی فصل تک بھوک اور محتاجی۔مگر اگلی فصل کی بوائی بھی تو ممکن نہیں"۔

"اس ویرانے میں کون مدد کو آئے گا"۔

"خدا تو ہے"۔

"ہاں خدا تو ہے"۔

"کوئی بھوکا نہیں مرتا"۔

"کہتے تو یہی ہیں۔کوئی بھوکا نہیں مرتا"۔

لینچو سب کچھ سنتا رہا۔اسے خدا کی ذات پر بھروسا تھا۔وہ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ خدا دلوں کا حال جانتا ہے وہ کسی کی حالت سے بے خبر نہیں ہوتا۔جو پیدا کرتا ہے۔وہ غافل کیسے ہوسکتا ہے؟۔

لینچو چوڑے چکلے بدن کا آدمی تھا اور بچپن سے کھیتوں اور ان تھک کام کرنے کا عادی تھا' مگر اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی آتا تھا۔ دوسرے دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خدا کو خط لکھے گا۔ اور بڑے گاؤں جا کر خط کو خود ڈاک میں ڈالے گا۔ جب خدا نے دنیا بنائی ہے تو وہی اس کا خیال بھی رکھتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ لینچو اور اس کے معصوم بچے اس وادی میں سسک سسک کر مر جائیں اور خدا آرام سے بیٹھا رہے۔

شام کے وقت اس نے خدا کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ ''اے خدا'' اس نے لکھا ''اگر تو نے میری اور میرے خاندان کی مدد نہ کی تو ہمیں اس برس فاقے کرنے پڑیں گے۔ میں محنت سے جی نہیں چراتا۔ مجھے ایک ہزار پیسوز بھیج دے تا کہ میں بیج خرید کر دوبارہ بوائی کر سکوں۔ اگر تو چاہے تو میں فصل کٹنے کے بعد تیرا قرض بھی واپس کرنے کو تیار ہوں' میں نے حلال رزق کھایا ہے۔ مگر یہ جو تو نے آسمان سے اولے برسا دیے......''۔

لینچو نے خط مکمل کیا اور لفافے پر ''خدا کے نام'' لکھ کر بڑے گاؤں روانہ ہو گیا ڈاک خانے پہنچ کر اس نے ٹکٹ خرید کر لفافے پر چسپاں کیا اور خط بکس میں ڈال کر خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

ڈاک خانے کے ملازم نے لینچو کا لفافہ دیکھا تو مہر لگاتے لگاتے رک گیا۔ اور بے ساختہ ہنسنے لگا کچھ دیر یوں ہی محظوظ ہونے کے بعد وہ لفافہ لیے ڈاک بابو کے کمرے میں پہنچا۔ ''یہ دیکھیے گا'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''کسی دیہاتی نے خدا کے نام خط لکھا ہے'' موٹا تازہ اور ہنس مکھ ڈاک بابو بھی لفافے پر درج پتہ پڑھ کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ مگر پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولا ''ذرا ایمان کی پختگی پر تو غور کرو۔ جس نے یہ خط لکھا ہے اسے خدا کی ذات پر کتنا بھروسہ ہے۔ کاش میں اتنا خوش عقیدہ ہوتا۔ خدا کے وجود پر اس قدر یقین ہونا ایک نعمت ہے''

ڈاک بابو اتنے سادہ مزاج اور راسخ العقیدہ شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس خط کا جواب دے گا۔ لیکن خط پڑھ کر اسے معلوم ہوا کہ لنچو کو جواب دینے کے لیے فقط تھوڑا سا وقت اور ایک کاغذ اور قلم ہی درکار نہیں ہیں بلکہ ایک ہزار پیسوز کی ضرورت ہے تا ہم ڈاک بابو اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اس نے اپنی تنخواہ سے تین سو پیسوز ڈالے اور باقی رقم کے لیے ڈاک خانے کے تمام عملے سے مدد طلب کی۔ اور انہیں سمجھایا کہ اس سے بڑھ کر کوئی کار خیر نہیں ہو سکتا۔ صاحب ایمان کا ایمان سلامت رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔

دو دن میں اس کے پاس سات سو پیسوز جمع ہو گئے۔ اس نے ساری رقم ایک لفافے میں ڈالی اور

اس پر لینچو کی وادی کا نام لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔لفافے کے اندر خط میں اس نے صرف اتنا لکھا۔
''منجانب۔خدا''

ایک ہفتے بعد جب لنچو نے ڈاک خانے آکر اپنی ڈاک کے بارے میں دریافت کیا تو ڈاک بابو نے اپنے ہاتھ سے لفافہ اس کے سپرد کر دیا۔یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ خط موصول ہونے پر لینچو کو قطعی تعجب نہیں ہوا۔اس نے ڈاک خانے کے باہر جاکر ایک پتھر پر بیٹھ کر اطمینان سے نوٹ گنے اور حساب مکمل کر کے اسے غصہ آگیا'' ......خدا سے غلطی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......تو پھر ہزار کی جگہ سات سو کیسے ہو گئے؟''۔

لینچو فوراً ڈاک خانے واپس آیا اور سرکاری میز پر پڑے کاغذ اور قلم سے اس نے ایک اور خط لکھنا شروع کر دیا۔خط لکھنے کے دوران اس کی پیشانی مستقل شکن آلود ہی رہی۔وہ سخت ناراض تھا۔خط مکمل کر کے وہ کھڑکی پر آیا۔ٹکٹ خرید کر اسے زبان سے گیلا کیا اور مکہ مار کر لفافے سے چسپاں کر کے بکس میں ڈال دیا اور پھر ہاتھ جھٹکتا ہوا باہر چلا گیا۔

جوں ہی لینچو باہر نکلا۔ڈاک بابو نے بکس کھول کر لفافہ نکالا۔خط میں لکھا تھا۔

''اے خدا!'' میں نے ایک ہزار پیسوز مانگے تھے۔مجھ تک صرف سات سو پہنچے مجھے جلد از جلد باقی رقم بھیج ......مگر اس مرتبہ ڈاک کے ذریعے ہرگز مت بھیجنا۔ڈاک خانے میں تو لگتا ہے سب چور بھرتی ہو گئے ہیں۔مجھے ان پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔

تیرا بندہ
لینچو''

ہرنانڈو تالیز

جھاگ

میں چمڑے کی پٹی پر استرا تیز کرنے میں مصروف تھا کہ وہ خاموشی سے دکان میں داخل ہوا اور آئینے کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے گاہک کا چہرہ پہچانتے ہی مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مگر وہ میری حالت سے بے خبر رہا۔ اپنا خوف چھپانے کے لیے میں سر جھکا کر استرے کو مزید تیزی سے چمڑے پر رگڑنے لگا۔ چند لمحوں بعد میں نے استرے کی دھار کو اپنے انگوٹھے کی کھال پر رکھ کر محسوس کیا اور چھت سے لٹکے بلب کی روشنی میں اس کی چمک دیکھی۔ اس دوران وہ اپنی کمر سے لگی گولیوں کی پیٹی اور پستول اتار کر دیوار پر لگے کھونٹے سے ٹانگ چکا تھا۔ ''تمہارا علاقہ جہنم کی طرح گرم ہے'' اس نے میری طرف گھوم کر کہا۔

''ذرا اچھی سی شیو بناؤ'' یہ کہہ کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے کم از کم چار دن سے شیو نہیں کی تھی۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ مستقل ہمارے جوانوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اسے دارالخلافے سے اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میں نے صابن کے ٹکڑے گرم پانی میں ڈال کر جھاگ بنانی شروع کر دی کچھ ہی دیر میں جھاگ کے بلبلے پیالے کی سطح تک ابھر آئے۔

''مرکزی قیادت کے دوسرے افسروں کے چہروں پر بھی یوں ہی داڑھیاں اُگ آئی ہوں گی؟'' میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہا' اور دائیں ہاتھ سے مستقل جھاگ گاڑھی کرتا رہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' اس نے آنکھیں کھول کر لاپروائی سے جواب دیا۔

''ہم نے انہیں تو نہیں چھوڑا۔ چن چن کر مارا ہے۔ حالانکہ مقامی ہونے کے باعث وہ یہاں کے جنگلوں اور پہاڑی راستوں سے زیادہ واقف ہیں...... ہمارے لیے یہ جگہ اجنبی ہے۔ مگر پھر بھی ......جلد ہی سب کو ختم کر دیں گے''

''اب تک کتنے مارے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''چودہ...... ہمیں گھنے جنگلوں میں جانا پڑا...... بہت دشوار گزار...... مگر کوئی بات نہیں۔ کب تک

چھپے رہیں گے......سب کو ختم کر دیں گے"

"گرفتار بھی تو کیے ہیں؟"

"جو ہتھیار ڈال دے اسے شہر کے چوک پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ پھر جو اس کا مقدر"

اس نے جھاگ تیار دیکھ کر چہرہ اوپر اٹھا دیا۔ میں نے اب تک اس کے سینے پر تولیہ نہیں رکھا تھا۔ الماری سے تولیہ نکالتے ہوئے میرے ہاتھ دوبارہ لرزنے لگے۔ اس کی گردن کے پیچھے والے حصے سے تولیہ باندھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے وہ میری کپکپاہٹ محسوس کر چکا ہے مگر اس کے چہرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل بولتا رہا۔

"تمہارے شہر والوں نے تو کل کا منظر دیکھ ہی لیا ہے......کیسا تھا؟ سبق سیکھا؟"

"ہاں" میں نے تولیے کی آخری گرہ لگائی اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا میں سرکاری دستوں کا ہمدرد ہوں۔

"ہماری طرف سے تو سب کو دیکھنے کی اجازت تھی۔ پتہ نہیں لوگوں کو تماشہ پسند آیا یا نہیں......عبرت ہوئی؟"۔

"ہاں" میں نے دوبارہ کہا' اور مٹھیاں بھینچ لیں۔

اس نے کرسی کی پشت سے گردن لگا کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کل جب وہ مجھے پہلی مرتبہ نظر آیا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی وہ میرے اس قدر قریب آ جائے گا۔ کل اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی وہ بہت مصروف تھا۔ اس نے ہمارے علاقے کے چار باغیوں کو ننگا کر کے پھانسی دی تھی' اور جب ان کے مردہ بدن ہوا میں جھولنے لگے تھے تو اس نے اپنے سپاہیوں کو ان کے مخصوص حصوں میں گولیوں سے سوراخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ مرکز سے منحرف ہو جانے والوں کو نت نئی اذیتیں دینے کے لیے مشہور تھا۔ اس کا نام ٹوریس تھا......کیپٹن ٹوریس......اس نے ہمارے شہر کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی کمر توڑ دی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کے نقوش برے نہیں تھے اور اس وقت یہ اندازہ لگانا ناممکن نہیں تھا کہ وہ اس قدر سخت طبیعت کا مالک آدمی ہے میں نے اس کے چہرے پر جھاگ کی پہلی تہہ جمانی شروع کی۔ وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولتا رہا" میں چاہوں تو اس لمحے گہری نیند سو سکتا ہوں" مگر مجھے یہاں سے جا کر ضروری کام کرنا ہے"

"پھانسیاں دینی ہیں؟" میں نے اپنے لہجے کی تلخی دباتے ہوئے کہا۔

''اسی طرح کی کوئی چیز۔ مگر اس مرتبہ عام تماشہ نہیں ہوگا''

میں اس کی داڑھی کے بالوں کو جھاگ کی رگڑ سے نرم کرنے میں مصروف رہا۔ میرے ہاتھ ایک بار پھر لرزنے لگے تھے۔ لیکن جھاگ بنانے کے عمل میں ہاتھوں کی لرزش چھپانا آسان تھا۔ اس نے ذاتی طور پر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے کبھی اپنا گاہک نہ بناتا۔ وہ ہمارے علاقے کی خودمختاری کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا دشمن تھا۔ اس زاویے سے وہ ہم میں سے کسی کا خیر خواہ نہیں تھا اور پھر اسے میری دکان میں داخل ہوتے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ وہ پسند نہیں کریں گے کہ ہمارے دشمنوں کا سربراہ اتنے اطمینان سے میری خدمات حاصل کرے۔ مگر میں اس سلسلے میں مجبور تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہمارے علاقے پر مرکزی حکومت کی بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا اور یوں اس کا عمل ہم سب کے مفادات کے منافی تھا۔ لیکن میں مقامی باشندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاندانی حجام بھی تھا۔ اس کی خاطر خواہ شیو کرنا میرے لیے پیشے کے آداب میں شامل تھا۔ میرے پاس وہ ایک گاہک کی حیثیت سے آیا تھا۔ اور اب میرا فرض تھا کہ میں اس کی اچھی شیو بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑوں۔ اس بات کا خیال رکھوں کہ اس کے مساموں سے خون نہ چھلکے۔ اس کے گالوں پر خراش نہ آئے۔ چار دن کے بڑھے ہوئے بالوں میں استرے کا پھسل جانا عام سی بات ہے۔ مگر میرے ہنر کا تقاضا تھا کہ میں اس مرحلے سے کامیاب گزروں۔ جب وہ میری دکان سے نکلے تو اس کا چہرہ صاف شفاف اور چمک رہا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت چہرے پر پھیرے تو اسے کہیں کھردرے پن کا احساس نہ ہو۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں اندر سے باغیوں کا حمایتی تھا اور سرکاری دستوں کے ہاتھوں ان کی بربادی اور ہلاکت پر کڑھتا تھا۔ مگر ایک باضمیر حجام کی حیثیت سے اپنے گاہکوں کی ضروریات کا خیال رکھنا میری مجبوری تھی۔ مجھے اپنے پیشے کی نزاکتوں کا علم تھا اور چار دن کی بڑھی ہوئی سخت اور خاردار شیو مجھے اپنی مہارت کے اظہار پر بطورِ خاص اکسا رہی تھی۔

میں نے استرا کھول کر مضبوط ہاتھ میں تھاما اور اسے نہایت احتیاط سے کیپٹن ٹوریس کی دائیں قلم کے نیچے رکھ کر حرکت دی۔ استرا سو فیصد درست حالت میں تھا۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ میرے اوزار نے انتہائی خوبصورتی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ کیپٹن کی داڑھی کے بال گھنے اور خمدار تھے مگر استرے کی دھار بہت تیز تھی اور میری مہارت درجۂ کمال کو چھوتی تھی۔ آہستہ آہستہ جھاگ کے نیچے سے کیپٹن کی صاف اور چکنی جلد ابھرنے لگی۔ استرا جھاگ کی ڈھیریوں میں بالوں کے

کچھ لیے اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ وقفے وقفے سے میں استرے کو تولیے سے صاف کر کے اسے چمڑے کی پٹی پر رگڑتا تھا مجھے اپنے پیشے پر فخر ہے۔ یہ میرا فن ہے' اور اپنے فن کی باریکیوں کا خیال نہ رکھنا میرے نزدیک غیر اخلاقی بات ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر اپنا ایک ہاتھ تولیے سے باہر نکالا اور اس جگہ کو چھو کر دیکھا جہاں سے بال صاف ہو چکے تھے۔

"تمہارے پاس وقت ہو تو آجانا۔ آج شام چھ بجے ہم اسکول کی عمارت میں مقدمہ چلائیں گے۔ تمہیں میں خصوصی اجازت دلوا دوں گا" اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"وہی کل جیسا مقدمہ...... تماشہ؟" میری آواز ڈوبنے لگی۔

"آج اس سے بہتر ہوگا"

"آج کیا ہوگا؟" میں نے اپنے دل کو پسلیوں سے ٹکراتے محسوس کیا۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا' مگر بہر حال آج زیادہ اچھا منظر ہوگا...... مزا آئے گا"

میں نے استرا دوبارہ اس کے چہرے پر رکھ کر آہستہ سے پوچھا۔ "سب کو مارنے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں۔ سب کو" اس کے لہجے کا اطمینان حیران کن تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھاگ خشک ہو رہا تھا۔ مجھے مزید تیزی سے کام کرنا تھا۔ میں نے آئینے سے دروازے سے باہر کا منظر دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا لوگ ہمیشہ کی طرح اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سڑک پار کی دکان پر دو تین گاہک چیزوں کی قیمتیں دریافت کر رہے تھے۔ پھر میری نظر آئینے کے اوپر ٹنگی گھڑی پر گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ استرے کی روانی قائم تھی۔ اب دوسری کنپٹی سے نیچے کے بال صاف ہو رہے تھے۔ بھوری' گھنی داڑھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی شاید اس نے کبھی داڑھی رکھنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ میرے خیال میں اُس کے چہرے پر داڑھی سجے گی۔ کبھی کبھی بازار میں ایسے شاعر اور پادری نظر آتے ہیں جو اپنے چہروں پر ابھرنے والی لمبی اور پیچدار داڑھیوں سے بالکل لاتعلق ہوتے ہیں' اور ان میں ایک عجیب طرح کی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ داڑھی میں کیپٹن کو پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ اور شاید یہ بات اس کے لیے سود مند بھی ہو۔ اسی طرح کے خیالوں میں میں اس کے گلے تک پہنچ گیا۔ یہاں مجھے اپنا ہاتھ انتہائی احتیاط سے چلانا تھا۔ گلے کے بال چہرے کے بقیہ حصوں سے نرم ہوتے ہیں مگر یہاں کی جلد بھی اسی نسبت سے نازک ہوتی ہے۔ اور پھر یہاں کے بال کہیں کہیں

سے اچانک دائرہ دار گھومے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی ایسی خراش لگا دیتی ہے۔ جس سے سطح کی رگیں کھل جاتی ہیں مساموں سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگتا ہے۔ میرے جیسے پیشہ ور حجام کے لیے! انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ کوئی گاہک زخم کا نشان لیے میری کرسی سے اٹھے...... کوئی بھی گاہک...... اور یہ تو دارالخلافہ سے آنے والا شخص ہے اس نے ہمارے کتنے آدمی ہلاک کر دیے ہیں؟ اور ابھی اور کتنے ستم ڈھائے گا؟ یہ ایک الگ بات ہے مجھے اپنے علاقے کے نوجوانوں سے ہمدردی ہے۔ میں انہیں حق بجانب سمجھتا ہوں وہ بے سروسامانی کے باوجود انتہائی بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے بالآخر وہ سب مار دیے جائیں گے اور انہیں ہلاک کرنے والوں کے نگران کیپٹن ٹوریس کی گردن اس وقت عین میرے استرے کے نیچے ہے مگر اس لمحے یہ میرے گاہک کی حیثیت سے مجھ پر اعتماد کیے بیٹھا ہے اسے بہر حال میری دکان سے اپنے ساتھیوں میں صحیح سلامت اور اعلیٰ درجے کی شیو کے ساتھ لوٹنا چاہیے۔

داڑھی مکمل صاف ہو چکی تھی۔ جب وہ دکان میں داخل ہوا تھا تو عمر رسیدہ اور تھکا ماندہ لگ رہا تھا۔ مگر اب اس کے چہرے پر شگفتگی تھی۔ ماہرِ فن حجام کی دکان سے لوٹنے والے ہر گاہک کا حق ہے کہ وہ واپسی پر نوعمر اور تر و تازہ نظر آئے۔ اب وہ ہشاش بشاش لگ رہا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس کا چہرہ اس قدر مرجھایا ہوا تھا۔ میرے اوزار کی ہر حرکت اسے تازہ دم کرتی گئی تھی۔ میرے ہاتھ بہر حال ایک فن کار کے ہاتھ ہیں۔ اسی لیے مجھے شہر کا بہترین حجام مانا جاتا ہے۔

گرمی کی شدت میں اچانک بہت اضافہ ہو گیا ہے میں پسینے میں شرابور ہو گیا ہوں مگر وہ کتنے اطمینان سے آنکھیں موندے بیٹھا ہے کس قدر مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اسے یہ بات بھی مضطرب نہیں کر رہی کہ وہ شام کو ایک خونی کہانی کا مرکزی کردار بننے والا ہے۔ اور میں ہاتھ میں استرا لیے اپنی ہی دکان میں خوف سے لرز رہا ہوں۔ حالاں کہ مجھے تو بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔ میں تو ایک مثبت کام میں مصروف ہوں...... یہاں ذرا زیادہ جھاگ...... یہ ٹھوڑی کے نیچے الٹا استرا...... شہ رگ کے ابھار پر مزید احتیاط...... خون کی جھلک بھی نظر نہ آئے۔ میری ٹانگیں کیوں کانپ رہی ہیں؟ حالانکہ اس وقت اسے ہلاک کرنا کس قدر آسان ہے اور یہ اس کا مستحق بھی ہے۔ میں اپنے شہر کے نوجوانوں سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ لیکن میں بہر حال قاتل نہیں ہوں اور اگر میں اسے قتل بھی کر دوں تو اس سے مجموعی صورت حال پر کیا فرق پڑے گا؟ اس کی جگہ کوئی اور آ جائے گا۔ اسے بھی مار دیا جائے گا۔ تو مزید نئے چہرے اس کی جگہ سنبھال لیں گے۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ اس

کا گلا کاٹنے کے لیے تو ہاتھ کی ہلکی سی جنبش کافی ہے۔ زپ! زپ! اور سب کچھ ختم۔ اسے تو اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ مجھے حیران آنکھوں سے دیکھ لے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور یہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ لیکن میں اس قدر کانپ کیوں رہا ہوں؟ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے ہر چند کہ یہ نہایت آسان ہے۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹے گا۔ سب سے پہلے تو تولیہ سرخ ہوگا پھر کرسی بھیگے گی۔ میرے ہاتھوں پر بھی چھینٹے پڑیں گے۔ میں دوڑ کر دروازہ بند کروں گا۔ مگر خون کی دھار فرش پر بہتی جائے گی یہاں تک کہ کیپٹن کا لہو دروازے کے نیچے سے نکل کر باہر سڑک پر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگے گا۔ استرے کی دھار بہت تیز ہے اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔ اگر یہ باغیوں کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بہت اذیت پہنچائیں گے۔ یہ طریقہ تو نسبتاً بہت آرام دہ ہے۔ زپ! زپ! اور سب کچھ ختم۔ اتنی جلدی کہ آدمی کو کوئی پریشان کن خیال بھی نہیں آسکتا۔ گرم خون کی پھوار روکے نہیں رکے گی۔ مگر میں لاش کا کیا کروں گا؟ اصل مسئلہ تو ٹھوس بدن کا ہوتا ہے اسے یہیں چھوڑ کر میں دکان بند کر کے بھاگ جاؤں گا...... کہیں دور ویرانوں میں دارالحکومت کے دستے میرا تعاقب کریں گے۔ بالآخر وہ مجھے چاروں جانب سے گھیر لیں گے۔

"کیپٹن ٹوریس کا قاتل...... شہر کا حجام...... وہ اس کی دکان پر شیو کرانے گیا تھا۔ ہاں...... ظالم نے اپنے گاہک کی گردن پر استرا پھیر دیا...... بزدل! دھوکے باز!"۔

باغیوں کے گروہ میں دوسری طرح کی باتیں ہوں گی "مظلوموں کا حمایتی۔ ہم سب کا حساب چکا دیا۔ ہماری آنے والی نسلیں اسے یاد رکھیں گی۔ آزادی کا متوالا! حریت پسند! اس کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ حجام تھا۔ مگر اس کے دل میں قوم کا درد تھا۔ عظیم انسان"۔

تاریخ میں زندہ جاوید ہونے کے لیے مجھے زیادہ جدوجہد بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ استرے کی دھار پر میرا مقدر چمک رہا ہے۔ ذرا سا دباؤ ہی تو ڈالنا ہے کیپٹن کی کھال ریشم کی طرح کھل جائے گی۔ ربڑ کی طرح...... روئی کی طرح...... انسانی جلد سے نازک کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں جانتا ہوں اس کو تو اشارہ چاہیے ہوتا ہے اور سطح کے نیچے خون کی دھار بھی جیسے پھوٹ پڑنے کی منتظر ہوتی ہے اور میرے استرے جیسا استرا بھی شہر میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... لیکن بات یہ ہے کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں خاندانی حجام ہوں اور میرے سامنے میرا گاہک بیٹھا ہے اسے میری دکان سے تروتازہ چہرے کے ساتھ نکلنا چاہیے۔ خراش بھی نہ

پڑے...... خون کی جھلک تک نظر نہ آئے۔ بس جھاگ...... ڈھیروں جھاگ ہو۔ یہ میرا فرض ہے اس سے کون انکار کر رہا ہے کہ یہ قاتل ہے؟ قاتل اور جلاد...... مگر میں تو قاتل نہیں ہوں میں تو شہر کا بہترین حجام ہوں۔ دنیا جانتی ہے۔

کیپٹن ٹوریس کا چہرہ اجلا اور صاف ہو گیا تھا۔ اس نے پشت سیدھی کر کے خود کو آئینے میں دیکھا پھر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر مسکرایا "شکریہ!!" اس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر گولیوں کی پیٹی اور پستول اٹھایا۔ میرے کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے آئینے میں میرے چہرے کی زردی بھی عیاں تھی اس نے پیٹی باندھ کر خود پر آخری نظر ڈالی جیب سے پیسے نکال کر مجھے معاوضہ ادا کیا اور دکان سے باہر جانے کے لیے چل پڑا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا' اور پھر میری جانب گھوم کر بولا "سب کہہ رہے تھے کہ تم مجھے مار ڈالو گے۔ بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا...... مگر" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے بات مکمل کی "قتل کرنا آسان نہیں ہے۔ یقین کرو آدمی کو مارنا بہت مشکل کام ہے"۔

دروازہ بند کر کے وہ اطمینان سے سڑک پر چلنے لگا۔

اینی بل میکاڈو

پیانو

''روزیلا سن رہی ہو؟'' جوڈی نے چیخ کر کہا ''میں نے اسے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ کم بخت کو شرم بھی نہیں آئی۔ کہنے لگا یہ تو پانچ سو میں بھی مہنگا ہے''۔

''اچھا کیا'' روزریلا نے اوپر کے کمرے سے جھانک کر جواب دیا ''مفت لینا چاہ رہا ہوگا تاکہ کسی شوقین کو بیچ دے۔ اسی طرح تو یہ لوگ امیر بن جاتے ہیں''۔

''مجھے معلوم ہے'' جوڈی بڑبڑایا۔ ''یہ ان کی پرانی ترکیب ہے''۔

روزیلا اور سارا نیچے آکر پیانو پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے ساز کی بے عزتی کی گئی ہے۔

''تم دیکھنا ہمیں اس کی کتنی زبردست قیمت ملے گی۔'' جوڈی نے اپنی بیوی اور بیٹی کے اعتماد میں اضافہ کیا ''اس طرح کے پیانو بنانے والے کاریگر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں''۔

''اخبار میں چھوٹا سا اشتہار دے دو'' روزیلا نے کہا ''خریداروں کی فوج جمع ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمیں بالآخر اس سے جدا ہونا پڑے گا''۔

''یہ تو فن کا نمونہ ہے۔'' جوڈی نے تائید میں سر ہلایا۔ ''اس پر صرف نظر پڑ جائے تو کانوں میں موسیقی گونجنے لگتی ہے''۔

لیکن انہیں معلوم تھا کہ پیانو فروخت کیے بغیر چھوٹے کمرے کو سارا کے حجرۂ عروسی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اور پیانو کی قیمت ہی سے سارا کی شادی کا جوڑا تیار ہونا تھا۔

تین دن بعد اخبار میں اشتہار آ گیا اور اس دن صبح سے پیانو کو جھاڑ پونچھ کر اس پر پھولوں بھرے گلدان سجا دیے گئے۔

سب سے پہلے ایک عورت اپنی بیٹی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ لڑکی نے پیانو کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ کر ایک دھن کے مطابق انگلیاں چلائیں۔

''اس کے سب سر ڈھیلے ہیں امی'' لڑکی نے کہا ''یہ اندر سے ہل گیا ہے''۔

عورت نے فوراً لڑکی کا ہاتھ تھام کر دروازے کا رخ کیا "ذرا سوچو" عورت ناگواری سے بولی۔ "ایک بے کار چیز کے لیے اتنا فاصلہ طے کیا"۔

جوڈی اور اس کی بیوی کے پاس جواب دینے کی فرصت نہیں تھی کیوں کہ تین امیدوار بیک وقت اندر آ چکے تھے۔ سرخ بالوں والا ایک شخص، عینک پہنے ہوئے سنجیدہ چہرے والی ایک لڑکی اور ایک عورت جو اپنی نشست و برخاست سے کوئی دولت مندہ بیوہ معلوم ہوتی تھی۔

"میں آپ سے پہلے آئی تھی" لڑکی نے دولت مندہ بیوہ سے کہا جو پیانو کا معائنہ کرنے آگے بڑھ رہی تھی۔

"کمرے میں پہلے داخل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" عورت کے لہجے میں تکبر تھا۔ "میری کار گھر کے دروازے پر رک چکی تھی، محترمہ جب میں نے تمہیں سڑک پار بس سے اُترتے دیکھا تھا"۔

گاہکوں کے درمیان یہ بحث گھر والوں کے لیے بہت خوش کن تھی۔ روزیلا نے مسکرا کر سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ان کے لیے کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ کافی پینے کے دوران عینک والی لڑکی پیانو کے گرد گھوم کر اُسے آگے پیچھے سے دیکھتی رہی پھر یکلخت اُس نے کسی ماہرِ فن کی طرح پیانو بجانا شروع کر دیا۔ لیکن پیانو سے نکلنے والی آواز واضح طور پر دلخراش تھی۔ سازکن سرا تھا اور اس کی بنیادی ہم آہنگی یکسر بگڑ چکی تھی۔ جوڈی نے فوراً خواہش مندوں کے چہروں کی جانب دیکھا۔ دولت مندہ بیوہ کی پیشانی شکن آلود ہو چکی تھی۔ سرخ بالوں والا شخص جامد و ساکت بیٹھا رہا۔ اسی دوران ایک اور عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر پیانو کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ کمرۂ عدالت میں بیٹھے ہوں اور پیانو ملزم کی حیثیت سے اپنا دفاع پیش کر رہا ہو۔ لڑکی اس طرح انگلیاں چلا رہی تھی جیسے وہ ساز سے اُس کے جرم کا اعتراف کروانا چاہتی ہو۔ کچھ کنجیوں سے بہت تیز اور ٹیڑھی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جبکہ کچھ کنجیاں پوری دبنے کے باوجود بالکل خاموش رہتی تھیں۔ اچانک گھر کی پالتو کتیا ڈولی پوری قوت سے بھونکنے لگی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ بھی ان کا احسان تھا کہ کوئی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا۔ جوڈی کو محسوس ہوا جیسے اب لڑکی کو ساز سے ذاتی ضد سی ہو گئی ہے۔ وہ مردہ کنجیوں پر دیر تک انگلیاں رکھ کر خاموشی کے وقفے کو بھی طویل کر رہی تھی اور تیز آواز والی کنجیوں پر ارادتہً زور سے ہاتھ مار کر دردناک حد تک

اونچی گونج پیدا کرتی تھی۔ یہ انتہائی غیر متوقع صورت حال تھی۔
''دراصل بات یہ ہے'' جب شرمندگی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو جوڈی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا''...... کہ یہ ساز موسم کے سلسلے میں بہت حساس ہے درجہ حرارت میں ذراسی کی بیشی اس پر بری طرح اثرانداز ہوتی ہے''
لڑکی نے یکدم پیانوں سے ہاتھ اُٹھالیے اپنے ہونٹوں پر از سرِ نو لپ اسٹک کی تہ جمائی اور کندھے اچکا کر بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں نے کیا سوچ کر اس ''معذور'' کا اخبار میں اشتہار دے دیا'' یہ کہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔
کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے جوڈی بھی خالی الذہن ہو کر فرش پر پڑے ایک دھبے کو گھورنے لگا۔ پھر اچانک اسے ہوش آیا اور اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔
''بات یہ ہے'' اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔''اس طرح کے پیانو اب نہیں بنائے جاتے......اس طرح کوئی بنا ہی نہیں سکتا''
ماحول پر ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔ بالآخر سرخ بالوں والے شخص نے سب کی مشکل آسان کردی۔''تم نے اس کی قیمت کیا لگائی ہے؟''اس نے پوچھا
''پانچ ہزار'' جو کچھ ہو چکا تھا اُس کے پیشِ نظر جوڈی نے خود ہی قیمت آدھی کردی تھی۔
سناٹا مزید گہرا ہوگیا۔
''میں سوچ کر بتاؤں گی'' دولت مند بیوہ نے اِٹھلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی سب لوگ اچھل پڑے۔
جب وہ کمرے سے نکل رہے تھے تو ایک نیا شخص پیانو پر نظریں گاڑے اندر داخل ہو رہا تھا۔
''آپ بھی پیانو خریدنے آئے ہیں؟'' جانے والوں میں سے کسی نے پوچھا۔''بات یہ ہے کہ......''
''آیئے۔آیئے۔خوش آمدید'' جوڈی نے رخصت ہونے والے کی بات مکمل ہونے سے پہلے بلند آواز میں کہا۔''بات یہ ہے کہ صبح سے لوگ آرہے ہیں جارہے ہیں۔اور بولیاں لگا رہے ہیں۔ آپ بھی آیئے۔خوش آمدید''۔
ادھیڑ عمر نووارد کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی جھلک تھی۔ وہ شکل سے بہت سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔اس نے ساز کا ڈھکن اُٹھا کر اسے نہایت غور سے دیکھا''غالباً یہ شخص موسیقی کا اُستاد ہے''

جوڈی کو خیال آیا۔
نوواردنے پیانو کی قیمت نہیں پوچھی۔ ''شکریہ'' اُس نے کہا اور خود ہی دروازہ کھول کر چلا گیا۔
سارا اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ روزیلا اور جوڈی نے ایک دوسرے کو مایوس نظروں سے دیکھا۔
''اس کی قدر کرنے والے لوگ کم ہیں'' جوڈی نے اداسی سے کہا۔ ''اگر صحیح قیمت نہ ملی تو میں اسے نہیں بیچوں گا''۔
''لیکن سارا کا عروسی جوڑا؟'' روزیلا آہستگی سے بولی۔
''میں قرض لے سکتا ہوں''۔
''تم اپنی تنخواہ سے قرض نہیں چکا پاؤ گے''۔
''ہم شادی ملتوی کر سکتے ہیں''۔
''جوڈی' وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ جوڑا ہو یا نہ ہو وہ شادی کرنا چاہیں گے یہ ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری عزت کا سوال ہے''۔
جوڈی خاموش ہو گیا۔
''اور پھر اصل مصیبت جوڑا نہیں ہے۔'' روزیلا نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ہمارا مکان ماچس کی ڈبیہ جتنا ہے۔ سارا اور اس کے خاوند کو صرف یہ کمرا دیا جا سکتا ہے۔ اور جب تک یہاں سے پیانو نہیں ہٹے گا کمرے میں گندم کا دانہ بھی نہیں سما سکتا''۔
دوسرے دن جوں ہی جوڈی کام سے واپس آیا اس نے پیانو ہی کے بارے میں سوال کیا'' آج کتنے لوگ اسے دیکھنے آئے؟''۔
''کچھ ٹیلی فون آئے'' روزیلا نے بتایا'' ایک بوڑھا آدمی بھی آیا۔ اور ہاں...... وہ سرخ بالوں والا شخص دوبارہ آیا تھا''۔
''کسی نے دل چسپی بھی ظاہر کی؟''۔
''ہاں۔ دل چسپی تو ظاہر کی' مگر کوئی خریدنے پر آمادہ نہیں ہوا''۔
''دل چسپی تو لی'' جوڈی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''غور سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ہے نا؟ تعریفی نظروں سے...... یہ فن کا نمونہ ہے۔ اس سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا''۔
''بوڑھا آدمی تو اس سے بہت متاثر ہوا'' سارا نے کہا۔ ''ہر زاویے سے دیکھتا رہا اس کا بس چلتا تو اسے آنکھوں میں سمیٹ کر گھر لے جاتا''۔

''بس آدمی کا باذوق ہونا ضروری ہے۔'' جوڈی فرطِ مسرت سے کھل گیا ''پرانی چیزوں میں ایک ماورائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے.....ایک طرح کی روحانی صورتِ حال.....اس کی پہچان کے لیے صاحب نظر ہونا لازمی ہے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے جسے مل گیا اس کی قسمت''

روزیلا اور سارا اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ جوڈی اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والے ساز کے سلسلے میں بہت حساس تھا'' وہ اپنا پتہ چھوڑ کر گیا سارا...... وہ بوڑھا شخص جسے پیانو پسند آیا۔ نہیں؟؟ اوہ اچھا! اس کے دوبارہ آنے کا ارادہ ہوگا۔'' جوڈی ایک لمحے کے لیے بجھ گیا تھا مگر فوراً ہی اس کے چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت واپس آ گئی' اور وہ پیانو کے گرد چکر لگانے لگا۔

''میرا پیانو'' اس نے پیار بھرے لہجے میں سرگوشی کی' اور پیانو کی لکڑی پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کسی جانور کی کمر سہلا رہا ہو۔

تیسرے دن کوئی نہیں آیا۔ ٹیلی فون پر ایک آواز نے دریافت کیا کہ پیانو نیا ہے یا پرانا؟'' پرانا ہے۔'' روزیلا نے کہا ''مگر جس طرح ہم نے اس کی حفاظت کی ہے.....'' روزیلا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے فون بند ہو گیا۔

''کل چھٹی کا دن ہے'' جوڈی کو خیال آیا۔ ''کل بہت لوگ آئیں گے''۔

ایک آدمی اپنی بیٹی کے ساتھ بہت بڑی کار میں آیا۔ وہ جوڈی کا خستہ حال مکان دیکھ کر باہر ہی سے واپس جانے لگا مگر اپنی بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر نیم دلی سے دروازے تک آیا اور پیانو کے بارے میں چند بنیادی سوالات کر کے تیزی سے پلٹ گیا ''مجھے دراصل کسی اچھے ساز کی ضرورت ہے'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔

جوڈی کے چہرے کے نقوش غم و غصے کی شدت سے ابتر ہونے لگے تھے۔ اُس نے ہمیشہ اپنے اجداد کی نشانی کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن اسے اپنے بزرگوں کے ورثے سے یوں جدا ہونا پڑے گا اور یہ بات تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی کہ پورے شہر میں کوئی اس فن پارے کی اصل حیثیت سے آشنا نہیں تھا۔ لوگ اسے عام سی چیز سمجھ رہے تھے اور یہ جوڈی کی توہین تھی۔

روزیلا کو ناامید ہونے میں دیر نہیں لگی' لیکن وہ بہر حال اپنے شوہر کو مایوسی سے بچانا چاہتی تھی۔

''آج کتنے آئے؟'' شام کے وقت اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا ''دو ٹیلی فون۔ انہوں نے اپنے نام نہیں بتائے۔ شاید ان کا خود آنے کا ارادہ ہو۔ ظاہر ہے نوادرات کی قیمت کا اندازہ انہیں دیکھ کر

ہی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تو وہ بھی سمجھتے ہیں'' روزیلا کی آواز ہموار اور لہجہ تسلی بخش ہوتا تھا۔

''سرخ بالوں والا نہیں آیا؟''۔

''وہ بھی آئے گا۔ مجھے یقین ہے''۔

چند دنوں بعد ٹیلی فون آنے بھی بند ہو گئے۔ جوڈی کے احساسات اس شخص جیسے تھے جس کا عزیز دوست ٹرین پر سوار ہونے' وقت پر نہ پہنچ پائے تو اُسے دوست کی صورت حال پر افسوس ہونے کے باوجود اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ اب وہ مزید کچھ وقت اپنے دوست کے ساتھ گزار سکتا ہے جوڈی پیانوں کے پاس بیٹھ کر پہروں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اُس کے خاندان کی تین نسلیں اس ساز پر موسیقی بجاتی جوان ہوئی تھیں۔ ہر نسل کے چند افراد تو زندگی کے آخری ایام تک اس پر اپنی پسندیدہ دھنیں بجاتے رہے تھے۔ اس پیانو نے کتنے لوگوں کا دل بہلایا تھا۔ اس کے آس پاس کتنے رقص ہوئے تھے۔ کتنی محبتیں پروان چڑھی تھیں۔ کتنے خواب دیکھے گئے تھے۔ محفلیں اجڑ گئی تھیں' نسلیں گزر گئی تھیں' مگر پیانو اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کے بزرگوں کی نشانیوں میں سے واحد چیز تھی جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئی تھی۔ پیانو ایک لحاظ سے لازوال ثابت ہوا تھا۔

''سارا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ ''نیچے آؤ'' ذرا چاپن کی دھن بجا کر دکھاؤ دیکھوں تمھیں یاد ہے یا بھول گئی ہو''۔

''رہنے دیں پاپا'' سارا نے اوپر سے جواب دیا۔ ''اب پیانو کی آواز کانوں کو چبھتی ہے''۔

''کیا کہہ رہی ہو'' روزیلا نے سرگوشی کی۔ ''تمھیں اپنے ابا کے جذبات کا ذرا بھی خیال نہیں ہے''

''مجھے نہیں معلوم'' سارا نے ناگواری سے کہا۔ ''جب تک یہ کھٹارا گھر سے نہیں نکلتا میرے اور لیفٹننٹ کے لیے جگہ نہیں بنے گی...... ہمارا پلنگ کہاں سمائے گا''۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ لیکن موسیقی کا کوئی شوقین پیانو کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنے بھی نہیں آیا۔ ایک روز سرخ بالوں والے شخص نے فون کر کے ساز کے بارے میں یوں پوچھا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی قریب المرگ مریض کا حال دریافت کر رہا ہو۔

''جوڈی کچھ سوچا؟ اب ہم کیا کریں گے؟'' بالآخر روزیلا پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''کس سلسلے میں کیا کریں گے؟'' جوڈی نے حیرت سے دریافت کیا۔

''یہی...... پیانو!''۔

''میں اسے نہیں بیچوں گا''۔ یکلخت جوڈی کی آواز اونچی ہو گئی۔ ''ان کیڑے مکوڑوں کو معلوم ہی

نہیں کہ پیانو ہوتا کیا ہے۔ یہ تو ہر چیز میں منافع کمانا چاہتے ہیں کوئی موسیقی کا سچا شوقین ہو تو میں اسے یہ مفت دینے کو تیار ہوں۔ کم از کم وہ اس کی عزت تو کرے گا۔ اس کا مقام تو پہچانے گا"

جوڈی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "سنو روزیلا مجھو کا میں اپنے رشتے داروں کو فون کرتے ہیں"

روزیلا اس کے فیصلے سے خوش ہو گئی۔

"ہیلو کون؟ ماسیا؟ باہر گیا ہوا ہے۔ تم کون؟ اوہ موکتیا! میں جوڈی' سنو! ہم تمھیں اپنا پیانو دینا چاہتے ہیں...... ہاں تحفہ...... نہیں بھئی مذاق کیوں کریں گے...... ہاں ہاں واقعی...... بالکل مفت...... کیا؟ ظاہر ہے تحفے کی قیمت کون لیتا ہے...... کیوں کہ اس طرح یہ خاندان ہی میں رہے گا۔ گھر کی چیز گھر میں رہے تو اچھا ہے۔ بس آدمی بھیجو اور اٹھوالو۔ شکریے کی کیا بات ہے...... تم اور ہم ایک ہی تو ہیں...... ہاں ہمیں بھی خوشی ہوئی"

فون بند کر کے وہ روزیلا کی جانب رخ کرتے ہوئے بولا "وہ یقین ہی نہیں کر رہی تھی کہنے لگی اپریل سے پہلے ہی اپریل فول بنا رہے ہو؟ احمق!"

روزیلا عرصے کے بعد اتنی خوش دلی سے ہنسی تھی۔ جوڈی پیانو کے اتنے نزدیک چلا گیا جیسے اس سے باتیں کرنا چاہ رہا ہو۔

"میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے" اس نے زیر لب کہا۔ "میں تمہاری توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا ان سے خون کا رشتہ ہے۔ تم خاندان ہی میں رہو گے۔ میرے بچوں کے بچے بھی تمھیں پہچانیں گے۔ تمہاری عزت کریں گے۔ تم انہیں بھی دل کش دھنیں سناؤ گے۔ مجھے معلوم ہے میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے۔ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو گے"

"وہ اپنا آدمی کب بھیج رہے ہیں؟" روزیلا بیچ میں بول پڑی۔ اسے دلھا' دلھن کے لیے کمرہ سجانے کی جلدی تھی۔

دوسرے دن ماسیا کا فون آ گیا۔ وہ دیر تک روزیلا سے باتیں کرتا رہا۔ کیا وہ واقعی پیانو انہیں تحفۃً دے رہے تھے؟ جب اُس کی بیوی نے اُسے خبر دی تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ سب اُن کی فراخ دلی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ آج کل کون اپنے رشتے داروں کا اتنا خیال رکھتا ہے۔

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ ماسیا" روزیلا بولی۔ "تمھیں معلوم ہے ہمارے گھر میں کتنی کم گنجائش ہے اور کمرے تو مضحکہ خیز حد تک تنگ ہیں۔ ہم سارا اور اس کے خاوند کے کمرے کو کشادہ کرنا

چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں پیانو یہاں سے ہٹانا ہوگا اور جوڈی اپنے خاندانی ساز کو اجنبیوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ پیانو تمھیں دینے کا مطلب ہے گھر کی چیز گھر ہی میں رہے گی۔ اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے؟ تم فوراً آدمی بھیجو"

کئی دن گزر گئے کوئی نہیں آیا۔ جوڈی اور روزیلا کو اپنے رشتے داروں کی خاموشی پر تعجب ہوا۔

روزیلا نے انہیں فون کیا۔ وہ بہت شرمندہ تھے۔ ویگن کے کرائے اور مزدوروں کے معاوضے نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ "کچھ دن ٹھیر جاؤ" ماسیا نے کہا "ہم کوئی سستا طریقہ ڈھونڈ لیں گے۔ ہم خود پیانو لانے کے لیے بہت بے چین ہیں ہم دن رات اسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں"

ایک ہفتے بعد جوڈی نے ان سے رابطہ قائم کیا۔

"تمھیں پیانو چاہیے یا نہیں چاہیے ماسیا" اس نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔

"جوڈی تم سوچ نہیں سکتے ہم پر کیا گزر رہی ہے" کسی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا "تم ایک تحفہ دے رہے ہو اور ہم اسے قبول نہیں کر پا رہے۔ مزدور اور ویگن والے تو کھال اتارنے پر تلے ہی ہیں لیکن ہمیں یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا گھر جو پہلے بہت بڑا تھا اب اتنا بڑا نہیں رہا۔ میرا مطلب ہے جتنا سامان ہم گزشتہ برسوں میں خریدتے رہے ہیں اس کے بعد تو ہمارے گھر میں بھی اب پہلی جیسی گنجائش نہیں رہی ہے۔ یقیناً ہمیں یہ بات پہلے ہی سوچنی چاہیے تھی مگر...... خدایا اس قدر شرمندگی ہو رہی ہے کہ......"

"تو تمھیں پیانو نہیں چاہیے"۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو ہمیں چاہیے ہمارا مطلب ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ لیکن کیسے رکھیں؟ رکھ ہی نہیں سکتے......"۔

جوڈی نے ٹیلی فون بند کر کے روزیلا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔ "تم نے دیکھا روزیلا ہم پیانو مفت بھی نہیں دے سکتے۔ ہم اسے کسی کو دے بھی نہیں سکتے!"۔

کمرے میں چھانے والی سنگین خاموشی کو سارا کی سسکیوں نے توڑا۔ وہ یکلخت پھوٹ کر رونے لگی۔

"فکر نہیں کرو بیٹی" اُس کی ماں نے تسلی دی "اب ہم اس کی قیمت پر بحث ہی نہیں کریں گے۔ جس نے جتنی قیمت لگائی ہم قبول کرلیں گے"۔

"اسے اسی وقت دفع کریں امی" سارا نے تلخی سے کہا "اسی وقت ابھی چند دنوں میں میری شادی

ہونے والی ہے اور میرا کمرہ ہی تیار نہیں ہوا۔ کوئی چیز نہیں آ رہی۔ صرف اس لیے کہ یہ...... یہ منحوس پیانو یہاں سے نہیں نکل رہا"۔

"آہستہ بولو بیٹی۔ تمہارے ابا سن لیں گے"۔

"میں چاہتی ہوں کہ وہ سنیں۔ انہیں سننا چاہیے۔ وہ کب تک کان بند کیے رکھیں گے"۔

اس رات جوڈی بہت کم سویا۔ وہ انسانی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آدمی زندہ کیوں رہنا چاہتا ہے۔ صبح کے قریب وہ زندگی اور پیانو کے خلاف ہو چکا تھا۔ وہ کام پر جانے کے بجائے محلے کے شراب خانے میں چلا گیا۔

روزیلا حیرت زدہ رہ گئی۔ اُس کا خاوند شرابی نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت وہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تین مزدوروں کے ہمراہ گھر واپس آیا۔ مزدوروں نے پیانو کو اچھی طرح ناپنے تولنے کے بعد صاف کہہ دیا کہ اتنا بڑا ساز اٹھا کر لے جانے کے لیے تین سے زیادہ مزدور چاہیے ہوں گے۔

"کوئی گاہک مل گیا؟" ماں اور بیٹی نے یک زبان ہو کر پوچھا

"نہیں۔ اسے کوئی نہیں خریدنا چاہتا"

"تو مفت دینے کا فیصلہ کر لیا؟"

"نہیں، میری پیاری بیوی۔ اسے کوئی مفت بھی نہیں لینا چاہتا"

"تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اب تو کیا کرنا چاہتے ہو؟"

جوڈی کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر اس کی آواز ہموار رہی "میں اسے سمندر میں پھینکوا رہا ہوں"

"نہیں، پاپا نہیں" سارا چیخ پڑی "یہ پاگل پن ہے"

سمندر ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ انہیں رات کی خاموشی میں کبھی کبھی بپھرے ہوئے سمندروں کی لہروں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ ان کے گھر سے ساحل تک پہنچنے کے لیے مکانوں کی تین قطاریں عبور کرنی پڑتی تھیں۔

"لیکن جوڈی" روزیلا نے گہری سوچ سے نکل کر کہا۔ "ہمیں بہت پہلے بات کر لینی چاہیے تھی۔ شاید کوئی اور راستہ نکل آتا۔ لوگ اس بات کا بہت مذاق اڑائیں گے۔ پیانو سمندر میں پھینکتے دیکھ کر محلے والے بہت ہنسیں گے"۔

"ہم اور کیا کر سکتے ہیں، روزیلا؟ یوں بھی کتنے جہاز سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ اُن میں سے کسی

پر پیانو بھی ہوتے ہیں"۔
لیکن پیانو ان تین مزدوروں کے بس سے باہر تھا۔
"ٹھیک ہے" جوڈی نے مزدوروں کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔"کل ہم زیادہ آدمی لائیں گے"۔

تینوں مزدور کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک ڈرتے ڈرتے آگے آیا اور جھجکتے ہوئے تینوں کی نمائندگی کرنے لگا"بات یہ ہے' جناب کہ اتنی قیمتی چیز کا سمندر میں پھینک دینا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ اتنی اچھی حالت میں ہے آپ اس کے لیے اخبار میں اشتہار کیوں نہیں دیتے؟"۔
"کیا؟" جوڈی کی آنکھیں پھیل گئیں۔"ہاں" اخبار میں اشتہار۔ ٹھیک ہے تم جاؤ شکریہ"
مزدوروں کے جانے کے بعد روزیلا نے اپنے خاوند کے سینے پر سر رکھ دیا اور آنسو روکنے کی کوشش میں آنکھیں میچ لیں۔
"اوہ جوڈی تم نے کتنا عجیب فیصلہ کیا ہے"۔
"لیکن اگر یہ یہاں نہیں رہ سکتا اور اسے کوئی دوسرا گھر بھی میسر نہیں آرہا تو اسے گلی میں رکھ دوں گا میں تو......"۔
"مجھے معلوم ہے جوڈی میں سمجھتی ہوں۔ پیارے مگر میرے دل پر بوجھ ہے۔ اس نے ہمارے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے اور اب......اب اتنے عرصے بعد ہم اسے سمندر میں پھینکنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ذرا اس پر نظر تو ڈالو کیسے چپ چاپ کھڑا ہے۔ اپنے انجام سے بے خبر......بیس سال سے تو یہ اسی کونے میں موجود ہے......بے ضرر اور معصوم"۔
"ہمیں جذباتی ہونے سے بچنا چاہیے روزیلا"۔
روزیلا نے اپنے خاوند کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔"تمہارا جو جی چاہے کرو جوڈی" اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا"میں تمہارے ساتھ ہوں"۔
ان کے گھر کے عقب میں سیاہ فام آبادی کے نشیبی علاقے تھے جہاں کالے بچے صبح سے شام تک خاک میں لوٹیں لگاتے' راہ گیروں سے اُن کی ادھ کھلی آئس کریمیں مانگتے اور سینما گھروں کے باہر لگی تصویروں کو دیکھ کر فحش حرکتیں کرتے تھے۔ جوڈی نے نشیبی علاقے سے نیگرو بچے جمع کیے اور

انہیں طرح طرح کے لالچ دیتا گھر تک لے آیا۔

آج ہوا کی تندی سے بحرِ اوقیانوس کی لہریں خطرے کے نشان تک جھاگ کے ڈھیر لگا رہے تھیں۔ لیکن کمرے کے نیم تاریک کونے میں پرانا پیانو حسب دستور خاموش تمکنت اور وقار کے ساتھ اپنی نمایاں حیثیت پر فائز تھا۔ جوڈی نے کمرے میں داخل ہو کر ایک لمحے کے لیے پیانو کو نظر بھر کر دیکھا۔ ''آجاؤ بچو'' اس سے پہلے کہ اس کے دل میں اُٹھنے والا غبار اُس کی بینائی کو دھندلا کرتا وہ دروازے سے باہر جھانک کر چیخا ''شاباش آجاؤ۔ آج معلوم ہو جائے گا تم کتنے طاقتور ہو''

چار بجے سہ پہر جوڈی کے گھر سے پیانو کا جنازہ گلی میں نمودار ہوا۔ لوگوں نے دائیں بائیں ہو کر پیانو کے لیے بیچ کا راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ نزدیک آ کر اسے دیکھتے اور کچھ اسے چھونے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ روزیلا اور سارا اپنے دروازے پر کھڑی اسے گلی عبور کرتے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں اپنی ڈبڈباتی آنکھیں ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''کس طرف؟'' گلی کے کونے پر پہنچ کر نیگرو بچوں نے پوچھا۔

''سمندر کی طرف'' جوڈی نے نیوی کے کمانڈروں کی طرح تحکمانہ لہجے میں کہا اور چند لمحوں تک بحرِ اوقیانوس کی جانب انگلی لہراتا رہا۔

''سمندر کی طرف۔ سمندر کی طرف۔'' بچوں نے یک زبان ہو کر کہا اور جوش میں اتنی تیزی سے ہاتھ بدلے کہ پیانو ڈگمگا گیا۔

لڑکے سمجھ گئے تھے کہ پیانو کو پانی میں ڈبو دیا جائے گا۔ اس انکشاف سے وہ مزے میں آگئے تھے۔ اب انہوں نے گنگنانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ یکلخت اتنا ہنگامہ برپا ہو گیا کہ جوڈی کی پالتو کتیا' ڈولی جواب تک اس کے قدموں کے ساتھ خاموشی سے چل رہی تھی' ہوا میں اچھل اچھل کر بھونکنے لگی۔

جہاں جہاں سے جلوس گزرتا دروازے اور کھڑکیاں کھل جاتیں۔ بالکونیوں پر زیادہ تر نوجوان لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں جنہیں دیکھ کر پیانو بردار نیگرو لڑکے اور زور سے گنگنانے لگتے تھے۔ عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتیں۔

''خداوندا' یہ کیا ہے!'' ایک عورت بولی۔

''پیانو ہے!'' دوسری نے جواب دیا۔

''پیانو؟''۔

''ہاں ہاں۔ پیانو ہے'' ایک نیگرو بچہ جسے بڑی عمر کے لڑکے ساز کو ہاتھ نہیں لگانے دے رہے تھے ہر مکان کے سامنے جا کر پورے خاندان کو مطلع کرتا تھا'' پیانو ہے' ننانوے نمبر والوں کے ہاں سے آیا ہے''۔

''وہاں تو سارا رہتی ہے'' کوئی لڑکی کہتی۔

'رہتی ہوگی' مگر یہ تو سمندر میں ڈوبنے جا رہا ہے''۔

''تم اسے بیچ کیوں نہیں دیتے۔ جوڈی'' کوئی آشنا جوڈی کے کان میں سرگوشی کرتا۔

''بیچ دیا'' جوڈی مضبوط لہجے میں بولا۔''سمندر کو بیچ دیا۔ بحرِ اوقیانوس سے بڑا خریدار کون ہوسکتا ہے؟'' پھر وہ جوش میں آ کر نیوی کے کمانڈر کا روپ دھار لیتا'' شاباس لڑکو' شاباش' چلتے رہو۔ ذرا دائیں جانب۔ حوصلے سے۔ چلتے رہو۔ سمندر کی طرف۔ شاباش''۔

وقفے وقفے سے کوئی لڑکا مستی میں آ کر بازو بڑھاتا اور پیانو کی کنجیوں پر ہاتھ چلانے لگتا۔ ایسے موقعوں پر پیانو سے آخری ہچکی جیسی آوازیں آتیں۔

''بیچو گے؟'' ایک عورت نے بالکونی سے آواز لگائی۔

''نہیں مادام'' جوڈی نے اتنی ہی بلند آواز میں جواب دیا'' بیچوں گا نہیں۔ مفت دوں گا۔ تحفہ...... چاہیے؟''

عورت جھینپ گئی۔ اُس نے پاؤں پٹخ کر کچھ کہا اور گھر کے اندر چلی گئی۔

پولینڈ کے مہاجروں کا ایک خاندان جوڈی کی بات سنتے ہی پیانو کے قریب آ گیا'' ہمیں چاہیے'' خاندان کے سربراہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے تمہارا ہوگیا۔ لے جاؤ'' جوڈی نے لڑکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں' ہمیں چاہیے...... مگر اس کے لیے گھر میں جگہ بنانی پڑے گی۔ یہ کوئی چھوٹی سی چیز تو ہے نہیں کہ...... کل شام تک......''۔

''ابھی...... یا کبھی نہیں'' جوڈی نے ان کی بات کاٹی'' یہ تمہارے گھر کے سامنے رکھا ہے۔ چاہیے تو اٹھا کر لے جاؤ۔ ابھی۔ اسی وقت۔ نہیں؟ چلو بچو شاباش چلو''۔

پیانو آہستہ آہستہ سمندر کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ بالکونیوں سے دیکھنے والوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے مردہ کاکروچ کو چیونٹیاں اٹھائے لیے جا رہی ہیں۔

''یہ تو پاگل پن ہے'' ایک کھڑکی سے آواز آئی۔

''پاگل پن؟'' جوڈی نے کہا ''تو تم لے لو۔آؤ۔لے جاؤ''۔

کھڑکی بند ہوگئی۔

یہ واقعہ کئی بار پیش آیا بہت سے لوگوں کو پیانو کو یوں لے جا کر پانی میں بہا دینا احمقانہ عمل محسوس ہوا' اور انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ساز کا مالک اسے اونے پونے بیچ کیوں نہیں دیتا؟ مگر جوں ہی جوڈی نے انہیں پیانو مفت پیش کیا وہ پیچھے ہٹ گئے۔اتنی بڑی چیز کو کھڑے کھڑے گھر لے جانا بھی تو ممکن نہیں تھا۔

بالآخر جوڈی اس طرح کی باتوں اور تبصروں سے بے نیاز ہو کر چلنے لگا۔اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دخل در معقولات کرنے والوں سے لاتعلق رہے گا اور اب ان کے سوالوں کا جواب نہیں دے گا۔

ساحلی سڑک پر موٹر سائیکلوں پر سوار پولیس والوں نے جلوس کا راستہ روک لیا جوڈی کو اپنے ارادے اور منصوبے کی تفصیلات بیان کرنی پڑیں۔ملک حالتِ جنگ میں تھا اور ساحلی علاقوں کی غیر معمولی نگرانی کی جارہی تھی۔جوڈی نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔پولیس والوں نے پیانو کو حیرت اور حقارت سے دیکھا تو جوڈی کا دل درد سے بھر گیا۔

''یہ ایک پیانو ہے جس پر برازیل کو فخر ہونا چاہیے'' اس نے پیانو پر ہاتھ رکھا جیسے کوئی بیمار دوست کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہے ''اس جیسا ساز تیار کرنے والا فن کار آج ملک بھر میں دستیاب نہیں ہے عظیم ترین موسیقار اس کی خوبیوں کے معترف رہے ہیں۔چوپن جیسا ماہر فن اس کے سوا کسی اور پیانو کے سامنے بیٹھنے پر رضامند ہی نہیں ہوتا تھا۔لیکن ہر چیز کی ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔یہ قانونِ فطرت ہے اس پیانو کا وقت بھی گزر گیا۔میری بیٹی سارا کی شادی ہونے والی ہے۔وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔کمرے میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔اور اس پیانو کا اب کوئی پرستار......کوئی خریدار نہیں......اس کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔'' جوڈی نے سمندر کی جانب اشارہ کیا۔

نیگرو لڑکے اور راستے میں جمع ہونے والے بچے اور ساتھ آجانے والی عورتیں اور مرد جوڈی کی طویل گفتگو سے اکتا گئے۔وہ جلد از جلد پیانو کی لہروں کے سپرد ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

پولیس والوں نے پیانو کو ٹھوک بجا کر دیکھا' مگر کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ پانے پر انہوں نے بھی جوڈی کو تیز چلنے کی ہدایت کی' کیوں کہ جلوس کی سست رفتاری کے باعث سڑک کی ٹریفک متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔مگر وہ گھر سے نکلنے ہی دیر میں تھے۔کچھ ہی دیر میں اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ایک ساحلی گارڈ نے انہیں بتایا کہ شام چھ بجے کے بعد انہیں سمندری

حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ انہیں کل صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ نیگرو لڑکوں نے پیانو کو وہیں رکھ دیا اور بددلی سے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ اب انہیں اپنا بقیہ کام کل مکمل کرنا تھا جس کے باعث ان کا معاوضہ بھی رہ گیا تھا۔

جوڈی انتہائی شکستہ دل اور خستہ حال گھر واپس پہنچا۔

آدھی رات کو میاں بیوی تیز بارش کی آواز سے اُٹھ بیٹھے بجلی چمک رہی تھی اور طوفانِ بادوباراں اپنی انتہا پر تھا۔ انہوں نے بتی روشن کی اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''میں پیانو کے بارے میں سوچ رہا تھا روزیلا''۔

''میں بھی...... بے چارہ...... باہر بارش میں اور اتنی ٹھنڈ اور ہوا''۔

''ہر چیز میں پانی چلا گیا ہوگا۔ ہر چیز میں پانی کو تو بس ذرا سی جگہ چاہیے ہوتی ہے۔ اور پیانو میں ایسی بہت سی جگہیں ہوتی ہیں ہے نا روزیلا؟''۔

''ہاں جوڈی۔ پیانو نے ہماری نسلوں کو تسکین پہنچائی تھی۔ لیکن ہم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''۔

''چپ ہو جاؤ۔ روزیلا۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ'' جوڈی لا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

وہ ایک لمحہ دوسرے کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ بجلی کی چمک میں درخت نمایاں ہوتے تو شاخیں رقص کرتے مستانوں کی طرح سر جھٹکتی دکھائی دیتیں۔ جوڈی نے خوف زدہ ہو کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ ''روزیلا'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ''مجھے پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہر وہ دھن سنی جو کبھی اس پر بجائی گئی۔ بہت سے ہاتھ...... ان گنت انگلیاں۔ میری دادی کے ہاتھ۔ میری امی کے۔ تمہاری امی کے۔ سارا کے ہاتھ۔ اور ہماری وہ خالہ جو نیند میں چلتی تھیں' ان کی ابھری ہوئی رگوں والی انگلیاں۔ اور...... اور بیک وقت بیس سے زیادہ ہاتھ۔ سو سے زیادہ انگلیاں پیانو بجا رہی تھیں۔ یقین کرو میں نے اس سے زیادہ دل کش موسیقی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ یہ روح پرور موسیقی تھی۔ روزیلا' مردہ انگلیاں زندہ انگلیوں سے زیادہ مہارت سے حرکت کر رہی تھیں۔ گزشتہ نسلوں کی بہت سی نوجوان لڑکیاں پیانو کے گرد کھڑی تھیں۔ وہ مکمل توجہ سے موسیقی سن رہی تھیں۔ لڑکیوں نے ان نوجوانوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے جن سے ان کی زمانہ آئندہ میں شادی ہونی تھی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے حقارت سے دیکھا میرے لیے ان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پیانو بجانے والے ہاتھ رک گئے۔ انگلیاں سمٹ گئیں......

لیکن پیانو خاموش نہیں ہوا۔ اُس میں سے تابوت کے پیچھے بجائی جانے والی دھن ابھرنے لگی۔ پھر کمرے میں پانی بھرنے لگا۔ اور پیانو لہروں کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔ سمندر کی طرف...... میں اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر وہ میرے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ اس کی منتیں کیں۔ لیکن وہ مجھ سے ناراض تھا۔ روزیلا او روزیلا۔ وہ بہتا چلا گیا......" جوڈی کی سانس ناہموار ہوگئی تھی۔ اُس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ دھاڑیں مارنے والا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی جوڈی بستر سے چھلانگ مار کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرہ سے باہر نکل گیا۔ وہ سیاہ فاموں کے علاقے تک دوڑتا چلا گیا۔ وہ اب جلد از جلد اس مسئلے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اس کی پہلی آواز پر لڑکے اُس کے گرد جمع ہو گئے۔

بارش تھم چکی تھی مگر ہوا کی تندی میں کمی نہیں آئی تھی۔ جس کے باعث سمندر غیر معمولی طور پر بپھرا ہوا تھا۔ آج لڑکوں کے ساتھ سیاہ فاموں کی جھونپڑیوں سے بہت سی بڑی عمر کے مرد بھی نکل آئے تھے "شاباش" "چلو چلیں" جوڈی نے حسب سابق تحکمانہ لہجے میں کہا۔ مگر آج اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

ساحل پر لڑکوں کے پاؤں ریت میں دھنسنے کے باعث پیانو کی رفتار سست اور بے ڈول ہوگئی۔ بالآخر جھاگ بناتی بپھری ہوئی لہریں اُس کو چھو کر پلٹنے لگیں۔ لیکن لڑکے جوڈی کی حوصلہ اُفزائی پر پانی کے اندر دور تک چلے گئے' یہاں تک پیانو کا بوجھ موجوں کے سپرد ہو گیا اور اس کی چاروں ٹانگیں زمین کی سطح سے اُٹھ گئیں۔ دو بڑی لہروں نے اس کا رخ پھیر دیا۔ تیسری لہر نے اُسے الٹا کر دیا اور چوتھی لہر اسے سمندر کی وسعتوں کی جانب بہا لے گئی۔

جوڈی گھٹنوں تک پانی میں کھڑا تا حدِ نظر پیانو کو دیکھتا رہا۔ اس کا منہ غیر اختیاری طور پر کھل گیا تھا اور آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔ اگر لہروں کے چھینٹوں سے سب کے چہرے تر نہ ہو جاتے تو تمام تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا کہ جوڈی رو رہا ہے۔

ساحل پر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر شخص اصل واقعہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ پہلی افواہ یہ پھیلی کہ پولینڈ کے مہاجروں کا ایک پورا خاندان ڈوب گیا ہے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ صرف ایک آدمی تند لہروں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ چند افراد کا کہنا تھا کہ ڈوبنے والا بچہ تھا جو خطرناک حد تک آگے چلا گیا تھا۔ جبکہ دوسروں کا اصرار تھا کہ انہوں نے خود اس عورت کو دیکھا تھا جس نے محبت میں ناکام ہو کر خود کو پانی کے سپرد کر دیا تھا۔ بہر حال شام تک سارے علاقے کو معلوم ہو گیا کہ یہ محض ایک پرانے ساز کا غیر معمولی انجام تھا۔

جوڈی زمین پر نظریں گاڑے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر واپس آگیا۔ اسے راستے میں طرح طرح کی باتیں سننی پڑیں۔ مگر وہ خاموش رہا۔
کچھ لوگوں نے اسے طعنے دیے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اس کی دانش مندی اور فیصلے کی تعریف کر رہے تھے۔
''وہ چلا گیا ہے روزیلا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا ''ہمیشہ کے لیے''۔
''جاؤ جوڈی'' اس کی بیوی پیار بھری آواز میں بولی ''پہلے اپنے کپڑے بدل لو''۔
''اب ہم اسے کبھی نہیں دیکھیں گے'' روزیلا''۔
''ظاہر ہے۔ اسی لیے تو ہم نے اسے سمندر میں پھینکوایا ہے''۔
''کیا پتہ۔ سارا نے انگلی نچا کر کہا'' وہ جزیرے پر پہنچ جائے''۔
''اب اس کے بارے میں مزید کچھ سوچنا بے سود ہے'' روزیلا نے فیصلہ کن انداز اپنایا۔ ''جو کچھ ہونا تھا' ہو چکا تم جاؤ سارا' اپنے کمرے کی صفائی شروع کرو''۔
سارا کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی' مگر جوڈی کا اضطراب کم نہیں ہوا تھا'' میں نے لہروں کو اسے نگلتے دیکھا تھا۔''
''بس کرو جوڈی' بس کرو۔ بہت ہو گیا''۔
''ڈوبنے سے پہلے وہ دوبارہ سطح پر نمودار ہوا تھا''۔
''مگر اب وہ بہرحال تہ میں بیٹھ چکا ہے''۔
''آخری لمحوں میں وہ جنازے کی دھن بجا رہا تھا''
''یہ دھن تم نے رات کو خواب میں بھی سنی تھی''
''ہاں۔ لیکن آج تو میں نیند میں نہیں تھا۔ میں پوری طرح بیدار تھا۔ وہ عجیب سوگوار موسیقی تھی۔ جب تک وہ پوری طرح غرقاب نہیں ہوا۔ روپوش نہیں ہوا۔ وہ اسی غم زدہ انداز میں کائنات سے مخاطب رہا۔ آخری وقت تک......'' جوڈی سر جھکا کر گہری سوچ میں چلا گیا۔
پھر وہ خود کلامی کرنے لگا'' ......اب تو وہ بہت دور جا چکا ہوگا۔ پانی کی تہ میں......اسے عجیب مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ ڈوبے ہوئے جہاز...... آبدوزیں...... مچھلیاں' ڈھانچے کل تک وہ کبھی اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا اور آج...... ممکن ہے طویل عرصے بعد وہ دنیا کی دوسری طرف' کسی دور دراز جزیرے پر جا نکلے۔ ہم دنیا میں موجود نہیں ہوں گے' مگر وہ اس گھر کو اور ہمارے خاندان کے

افراد کو یاد کرے گا"

سارا کمرے کے کونے میں اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں سالہا سال تک پیانو موجود رہا تھا مگر اب وہاں اس کا عروسی پلنگ بچھتا تھا۔ ان کی پالتو کتیا' ڈولی کمرے میں داخل ہوئی اور اس جگہ کو سونگھ کر بھونکنے لگی۔ وہ پیانو کے ساتھ سویا کرتی تھی اور آج پیانو کی غیر موجودگی اسے بے چین کر رہی تھی۔ سارا کو خوشی کے ساتھ ہلکا سا احساسِ جرم ہوا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ جوڈی نے دروازہ کھولا تو سامنے بندرگاہ کے کپتان کے نمائندے کو کھڑا پایا۔ اس نے جھک کر اپنے بریف کیس سے چند کاغذات نکالے۔

"تمہارا نام جوڈی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں"۔

"تم نے آج سمندر میں کیا پھینکا؟"۔

جوڈی کا سر چکرا گیا۔ "بندرگاہ کا اس سے کیا تعلق ہے؟"۔

اُس نے حیرت سے کہا۔ "ہم کھلے سمندر کی طرف گئے تھے"۔

"مسٹر جوڈی اولیورا" نمائندے نے سختی سے کہا "مجھے بندرگاہ اور کھلے سمندر کا فرق مت سمجھاؤ" یہ بتاؤ تم نے سمندر میں کیا پھینکا؟"۔

"کیا سمندر میں کوئی چیز پھینکنا کسی قانون کی خلاف ورزی ہے؟" جوڈی نے مؤدبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہنگامی حالات میں ہمیں اپنے ساحلوں اور بندرگاہوں پر زیادہ کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ دشمن ہر وقت تاک میں رہتا ہے"۔

"مگر وہ تو ایک معمولی سا پیانو تھا سر ایک پرانا خاندانی ساز"۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ محض ایک پیانو تھا؟"۔

"میرا خیال ہے وہ پیانو ہی تھا" جوڈی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ پھر وہ کمرے کے اندر جھانک کر با آواز بلند بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے' روزیلا وہ محض ایک پیانو ہی تھا؟ کیوں سارا وہ ایک معمولی پیانو ہی تھا نا؟"۔

روزیلا دروازے تک دوڑتی چلی آئی۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے جوڈی" اُس نے اپنے خاوند کو کندھوں

سے پکڑ کر یوں جھنجھوڑا جیسے اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہو پھر اس نے سرکاری نمائندے سے دھیمے مگر واضح لہجے میں کہا ''جی ہاں جناب وہ محض پیانو ہی تھا''

''میں تو سمجھتا تھا کہ آدمی جو چاہے سمندر میں پھینک سکتا ہے'' جوڈی یوں بولا جیسے نیند میں بڑبڑایا ہو۔

''اندر آجاؤ' جوڈی'' روزیلا کو محسوس ہوا کہ اس کے خاوند پر ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

''ٹھہرو'' اس نے روزیلا سے بازو چھڑایا اور دوبارہ کپتان کے نمائندے کی جانب گھوم گیا۔ ''فرض کریں میں خود کو سمندر میں پھینکنا چاہوں تو...... تو کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے؟''

''ممکن تو ہے'' نمائندے نے کہا ''مگر یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے''

''آسان کیسے نہیں ہے؟'' جوڈی کے لہجے میں تلخی آگئی ''میں اپنی زندگی کا مالک ہوں۔ چاہوں تو زندہ رہوں۔ چاہوں تو......''۔

سارا کے منگیتر کو اندر آتے دیکھ کر روزیلا نے جوڈی کو اندر کھینچ لیا۔

''ہمارا کمرہ دیکھا!'' سارا نے لیفٹننٹ کو ایک چیز دکھاتے ہوئے کہا ''یہاں ہم اپنی خوش گوار زندگی کی ابتدا کریں گے''۔

''بہت اچھا ہے'' لیفٹننٹ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مگر ہم نیا پیانو کہاں رکھیں گے؟''

''نیا پیانو؟''

''پیانو کے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتا'' لیفٹننٹ چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمھیں معلوم نہیں کہ پیانو کی آواز مجھے کتنی تسکین پہنچاتی ہے۔ جو شخص سارا دن بندوقوں اور توپوں کے درمیان رہے۔ اسے شام کے وقت ہلکی سی کیف آور موسیقی کی کس قدر ضرورت ہوگی...... تم جانتی ہو کہ گولیوں کی گونج اور......''۔

سارا کو اپنے منگیتر کی گفتگو کے درمیان کھانسی کا دورہ پڑا۔ جوڈی گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ وہ تقدیر کی مزید ستم ظریفی نہیں سہہ سکتا تھا۔

''اس وقت تک وہ کتنا فاصلہ طے کر چکا ہوگا...... کتنی گہرائیاں...... کیسے کیسے نشیب و فراز...... وہ نجات پا گیا ہے کم از کم وہ مجھ سے اور سارا سے اور روزیلا سے زیادہ خوش و خرم اور آزاد ہے۔ اب وہ کسی کا پابند نہیں ہے۔ تمام محتاجیوں اور محرومیوں سے ماوراوہ چلتا چلا جا رہا ہے...... اندیشوں سے بے نیاز وسوسوں سے لاتعلق ہر طرح کے خدشے سے بالاتر وہ لامحدود کے سفر میں سرشار ہے احساسات زندگی سے لبریز وہ سات سمندروں کو عبور کرے گا۔ سربلند و سرفراز اپنی خواہش' اپنی مرضی

اپنی تقدیر کا مالک......''۔

گھر کے سامنے درختوں کے جھنڈ میں نیگرولڑکے آج کی محنت کا معاوضہ لینے کے لیے جمع تھے رات کی تاریکی میں انہیں انفرادی طور پر شناخت کرنا، ممکن نہیں تھا۔ ان سب نے آج بھی دل لگا کر کام کیا تھا اور اپنی مزدوری کے حقدار تھے اچانک اس گروہ سے ایک سایہ الگ ہوا اور اعتماد سے آگے بڑھنے لگا۔ سائے نے گھر کا پھاٹک کھول کر اندر قدم رکھا تو جوڈی اسے پہچان گیا۔ وہ سرخ بالوں والا شخص تھا جو ان کے گھر پہلے بھی آچکا تھا۔

''میں پیانو کے سلسلے میں واپس آیا ہوں۔ سرخ بالوں والے شخص نے اطمینان سے کہا'' تم نے اس کی جو قیمت لگائی تھی...... مجھے منظور ہے''۔

☆

انیسویں صدی کے اختتام تک روس کا چیخوف' امریکا ایڈگر ایلن پو اور فرانس کا موپساں مختصر افسانے کو ادب کی صف اول میں شاعری کے شانہ بشانہ کھڑا کر چکے تھے۔ (طے شدہ منصوبے کے تحت ؟؟) اس کے درجہ دوم کے ناولوں اور ناول نگاروں کو شہرت عام بخشنے کا اہتمام کیا۔ سولژے نشن اور بورس پیسترناک جیسے سطحی ناول نگاروں کو نوبل انعام سے نوازا گیا' اور ''کینسر وارڈ'' اور ڈاکٹر ژواگو جیسے عامیانہ ناولوں کو آسمانی تحفہ قرار دیا گیا۔ اس بے معنی ہاؤ ہو کا شرم ناک پہلو یہ ہے کہ تاریک راہوں میں مارے جانے والے روس کے انتہائی منفرد اور صاحب اسلوب افسانہ نگار آئزک بیبل کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور روس کا وہ ناول جس پر بیسویں صدی کی ادبی دنیا کو فخر کرنا چاہیے تھا مصنف کی دردناک موت تک اندھیرے میں دبا رہا۔ اور اب بھی اس کی رسائی زیادہ دور تک نہیں ہے۔ یہ ناول حسد (ENVY) ہے اور اس کا مصنف ''یوری ایلوشا'' انتہا درجے کی گمنام زندگی بسر کرنے کے بعد کثرت شراب نوشی کی تہمت لیے اپنی قبر میں اتر گیا۔ یوری ایلوشا کے ''حسد'' کا ہر باب ڈاکٹر ژواگو اور کینسر وارڈ کے پلاسٹک جیسے بے ذائقہ مکالموں اور مصنوعی کرداروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ بہر حال ایزک بیبل کے افسانوں اور ایلوشا کے ناول کے باوجود بحیثیت مجموعی بیسوی صدی کا روسی ادب اس کے گزشتہ صدی کے نثری سرمائے کے درجے کو نہیں پہنچتا۔

فرانس میں بیسویں صدی' ناول کی عظمت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ ہر چند کہ بالزیک' فلابیئر' او

رہیو گو جیسے ناولسٹ فرانسیسی ناول کو عالمی ادب میں نمایاں کر چکے تھے مگر اس صنف میں گہرائی کا عنصر شامل کرنے والوں میں مارسل پراؤست کا نام سرفہرست ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب پراؤراست کا انتقال ہوا تو جاننے والے جانتے تھے کہ اگر ادب کی عظمت فقط قوت مشاہدہ سے وابستہ ہوتی تو میں اپنی یادداشتیں تیرہ جلدوں میں قلم بند کرنے والا یہ فن کار دنیا کا عظیم ترین ادیب کہلاتا ہے۔ لیکن ادب بہر حال محض قوتِ مشاہدے سے تشکیل نہیں پاتا ہے۔ مارسل پراؤست کے بعد فرانس میں عظیم ناولوں کا زریں عہد شروع ہوا۔ اور افسانہ آہستہ آہستہ پس منظر میں جانے لگا وجودیت اور مہملیت کا فلسفہ بیان کرنے کے لئے بھی ناول کی صنف اپنائی گئی۔ اہل فرانس ایک لحاظ سے یوں بھی خوش قسمت تھے کہ ان کا ملک پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکا' روس اور دیگر مغربی ممالک کے زائد درگاہ ادیبوں کا مرکز بن گیا اس کی ایک بڑی وجہ اہلِ فرانس کی بالغ نظری تھی۔ ایک قدیم یونانی فلسفی کا کہنا ہے کہ "اگر ہم اپنے سامنے ایسی چیزوں کا ڈھیر لگائیں جو کسی زمانے میں دنیا کے کسی حصے میں جائز قرار دی گئی تھیں اور اسکے بعد اس ڈھیر میں سے ایک ایک کر کے وہ چیزیں نکال لیں جو کسی زمانے میں یا کسی جگہ ناجائز سمجھی جاتی تھیں تو ہمارے سامنے کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔"

اخلاقیات کے میدان میں حلال اور حرام کی اس مضحکہ خیز صورت حال کو سب سے زیادہ فرانسیسیوں نے سمجھا ہے بہر حال نامعلوم عوامل کی بنا پر بیسویں صدی میں فرانسیسی ادب کی قیادت ناول نے سنبھال لی۔

اس غیر متوقع صورت حال نے اس وقت ایک اور غیر متوقع کروٹ بدلی جب انیسویں صدی میں خاموش زندگی بسر کرنے والے لاطینی امریکہ میں اچانک ادب کے شاہکار تخلیق پانے لگے۔ ارجنٹائن کا بورخیس بلاشبہ بیسویں صدی کا خیرہ کن افسانہ نگار ہے' کافکا کے بعد بورخیس وہ واحد افسانہ نگار ہے جو دنیا بھر کے کہانی نویسوں کے اسلوب پر اثر انداز ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دیوزاد افسانہ نگار کو ادب کے نوبل انعام کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔

'مجھے حیرت ہوتی ہے"، فلسفیِ اعظم ایمونیل کانٹ کہا کرتا تھا......"۔

"...... مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا رحم کے جذبے سے بھری ہوئی ہے لیکن انصاف سے خالی ہے"۔

بہر حال بورخیس کی کہانیوں اور پابلو نرودا کی شاعری نے بالآخر ترقی یافتہ دنیا کی توجہ لاطینی امریکی ادب کی جانب مبذول کرا ہی لی اور اب میکسیکو، برازیل، چلی اور کولمبیا جیسے ''ناچیز'' ممالک سے طلوع ہونے والا ہر ناول اور شعری وافسانوی مجموعہ فوری چھان پھٹک کے لیے یورپ پہنچ جاتا ہے۔

''خدا کے نام'' ''جھاگ'' اور ''پیانو'' لاطینی امریکہ کے رنگارنگ افسانوی ادب کی نمائندہ کہانیاں ہیں ان کہانیوں میں بحرِ اوقیانوس کی دوسری جانب آباد تیسری دنیا کا مخصوص ماحول، اپنے مسائل اور محرومیوں کے ساتھ نہایت متاثر کن انداز میں نمایاں ہے۔

Beesvein Sadee Key

Shahkar Afsaney

ایچی بل میکاڈو (برازیل) —— ریمنڈ کارور (امریکا) —— جان ٹونڈر (ہالینڈ)

ٹالسٹائی (روس) —— جوزف ہیلر (امریکا) —— ولیم کارلوس ولیمز (امریکا)

جیک لنڈن (امریکا) —— بورخیس (ارجنٹائن) —— یاں پانے (فرانس)

الڈس ہکسلے (برطانیہ) —— جیمز جوائس (آئرلینڈ) —— او ہنری (امریکا)

جین پال سارتر (فرانس) —— سلویا پلاتھ (امریکا) —— جیسی اسٹیورٹ (امریکا)

فرانز کافکا (چیکوسلاواکیا) —— جیمز اسٹیفنز (آئرلینڈ) —— جیروم ویڈمین. (امریکا)

میری لیوین (آئرلینڈ) —— گراہم گرین (برطانیہ) —— گریگری فیونٹس (میکسیکو)

ارنسٹ ہیمنگوے (امریکا) —— ہرناڈو تالیز (کولمبیا)

Published by

Welcome Book Port

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan.

Ph: 021-2633151 - 2639581 Fax: 021 - 2638086

E-mail: welbooks@hotmail.com

Website: www.welbooks.com